یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

جلد نمبر ۷

٦

فہرست

سُوْرَۃُ البَرَائۃ

یہ سورہ مدنیہ ہے اور اس کی کل آیات ایک سوانتیس ہیں۔ یہ سورہ ۹ھ میں نازل ہُوا۔ اس کے خواص وفضائل یہ ہیں۔

۱۔ جو شخص اس سورۃ کی تلاوت کرے گا۔ بروز قیامت نفاق سے بری ہو کر اُٹھے گا۔

۲۔ جو شخص اس کو لکھ کر اپنے عمامہ یا ٹوپی میں رکھے تو جہاں بھی ہوگا چوروں سے محفوظ رہے گا۔ اور اس کو جہاں بھی دیکھیں گے چور اس سے کنارہ کر جائیں گے۔

۳۔ اگر آگ پُورے محلّے کو گھیرے تب بھی اس کے مکان کے قریب نہ جائے گی۔

۴۔ کوئی دشمن اس پر کارگر نہ ہوگا۔ جب تک یہ اس کے پاس لکھی ہُوئی رہے گی۔ (برہان عن خواص القرآن)

۵۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ سورہ الانفال اور سورۃ البرأۃ ایک ہیں۔ (برہان)

۶۔ ثعلبی سے بروایت عائشہ جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ قرآن آیت آیت اور حرف حرف نازل ہوا ہے سوائے سورہ برأت اور توحید کے کہ یک جا نازل ہُوئے۔ اور ان کے ہمراہ ستّر ہزار فرشتے اُترے۔

بسم اللہ کا جزو سورہ نہ ہونا

تفسیر مجمع البیان میں حضرت علی علیہ السلام سے اس کی وجہ یہ منقول ہے کہ سورہ برأۃ کے اول میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں اُتری کیونکہ بسم اللہ امان اور رحمت کے لئے ہے۔ اور برأۃ رفعِ امان کے لئے ہے۔

حضرت امیرؑ کا یہ فرمانا کہ بسم اللہ اس سورہ کے اول میں نہیں اُتری یہ جواب ہے ایک سوال کا کہ اس سورہ کے اول میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی پڑھی جاتی۔ یعنی قرآن مجید کی باقی سورتوں کے اوائل میں بسم اللہ کا ہونا تبرک یا ذاتی تصرف کے ماتحت نہیں۔ بلکہ مصلحت وحکمت پروردگار کے ماتحت جن سوروں کے اوائل میں نازل ہوئی وہاں لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ جزو سورہ ہے۔ اور جہاں نہیں نازل ہوئی وہاں نہ لکھی جاتی ہے نہ پڑھی جاتی ہے۔ اور چونکہ اس سورہ کے اول میں نہیں اُتری لہذا ترک کی گئی ہے اور یہی دلیل قاطع ہے اس امر کی کہ بسم اللہ ہر سورہ کی جزو ہے سوائے سورہ برأۃ کے۔

اس کے بعد حضرت امیر علیہ السلام نے اس کی علت و وجہ بیان فرمائی کہ چونکہ بسم اللہ امان ورحمت کے لئے ہوا کرتی ہے اور اس سورہ کا مضمون رفع امان ہے۔ لہذا شروع میں بسم اللہ نہیں اُتاری گئی تو اس پر سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی اور سورتیں بھی ایسی ہیں جن میں عذاب خداوندی کا تذکرہ ہے۔ اور کافروں سے بیزاری کا تذکرہ ہے۔ مثلاً سورہ معارج۔ سورہ غاشیہ اور سورہ کافرون وغیرہ پھر ان سورتوں کے اول میں بسم اللہ کیوں نازل کی گئی تو اس کا جواب ہے کہ یہ مصلحت وحکمت پروردگار ہے اور حضرت امیر علیہ السلام نے من جملہ دیگر مصالح وحکم کے ایک مصلحت کا نام لے لیا اور اس مصلحت کے لئے ضروری نہیں کہ حکم کے لئے علتِ تامہ کی حیثیت رکھتی ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور وجوہ بھی ہوں جن کی بنا پر یہ سورہ خصوصی امتیاز کا حامل قرار دیا گیا ہو۔ اور من جملہ وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بسم اللہ کا باقی سوروں کے اوائل میں ہونا صرف تبرک نہیں بلکہ حکمت تنزیل کے ماتحت ہے جس کو خود اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس کی مزید تحقیق تفسیر ہذا کی دوسری جلد میں گذر چکی ہے۔ اس سورہ مجیدہ کا نام برأت بھی ہے اور توبہ بھی۔ اور ان کے علاوہ اس سورہ کے آٹھ نام اور بھی ہیں۔

موضوع سورہ

قرآن مجید کی تمام سورتوں میں سے اس سورہ کا نام بھی نرالا ہے اور اس کا موضوع بھی نرالا ہے اور وہ ہے برأت یعنی بیزاری اور دوسرے لفظوں میں اس کو تبری کہتے ہیں جو غلط عام "تبرا" استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اس سورہ کے نام اور موضوع نے یہ ثابت کر دیا کہ برأت یا "تبرا" کوئی گالی گلوچ نہیں۔ ورنہ قرآن مجید جو بالعموم سب اور گالی سے منع فرماتا ہے۔ اس میں تبری یا برأت کا ذکر تک نہ ہوتا چہ جائیکہ ایک سورہ کا عنوان بیان ہی تبری ہوتی کہ اس کا نام بھی برأت رکھ دیا جائے اور خداوند حکیم نے اس سورہ کے اندر جو تفصیلات بیان فرمائیں ان سے تو صاف ہو گیا کہ برأت کا معنی گالی نہیں ہے بلکہ جو قوم عقائد حقہ اور اعمال صحیحہ سے دُور ہو۔ ان سے اہلِ ایمان کو برأت یعنی بیزاری کرنی چاہیئے۔ اور لُطف یہ کہ قرآن مجید کے تمام سوروں میں سے کسی سورہ کا نام مودت یا محبت یا ولا یا تولا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ برأت اور ولایت یا تبری و تولی جسے غلط عام استعمال میں تبرا و تولا کہتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ایک کے ذکر سے دوسرا خود بخود سمجھا جاتا ہے جس سے برأت ہوگی۔ اس کی ضد

یا نقیض سے محبت ہوگی۔ اور جس سے محبت ہوگی اس کے مخالف پہلو سے برأت اور نفرت ہوگی۔ اِس سُورہ مبارکہ میں مشرکوں اور کافروں سے برأت کا اعلان کیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم صحیح یہ ہے کہ خدا اور رسول اور ان کے ماننے والوں یعنی مومنوں سے محبت واجب ہے اِسی بنا پر جب ایک سُورہ کا نام برأت ہو گیا تو ولایت نامی دوسرا سُورۃ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہی سورہ برأت مفہوم مخالف کے اعتبار سے سُورہ ولایت بھی ہو سکتی ہے۔ اب سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ برأت منفی پہلو ہے۔ اور ولایت مثبت پہلو ہے۔ اِس سورہ میں منفی پہلو کو عنوان بیان قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی منفی پہلو کی مناسبت سے سورہ کا نام بھی رکھا گیا حالانکہ مثبت پہلو کو پیش پیش ہونا چاہیئے تھا۔

اس کا جواب اور حل یہ ہے کہ یہاں دو مقام ہیں۔ ایک مقامِ اعتقاد اور دوسرا مقامِ عمل۔ پس جہاں تک مقامِ عمل کا تعلق ہے وہاں صرف مثبت پہلو کو ہی معرضِ ظہور اور منصّہ شہود پر لانے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جس سے منفی پہلو خود بخود مضمحل اور نیست و نابود رہتا ہے۔ لیکن جہاں تک اظہارِ عقیدہ کا تعلق ہے وہاں منفی پہلو کے اعلان کو زیادہ وقعت و اہمیت دی جایا کرتی ہے۔ اگرچہ دل و دماغ میں وجُود صرف مثبت کا ہی ہوتا ہے لیکن اقرار لسانی میں پیش پیش ذکر منفی ہوا کرتا ہے۔ اور کلمہ توحید اس کا بیّن گواہ موجود ہے یہی وجہ ہے کہ برأت کے ذکر کو ولایت کے ذکر سے مقامِ اعلان میں اہمیت دی گئی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے لوگ جو منافقانہ رویّہ کے ماتحت باظاہری رواداری اور ملنساری کے روابط کے پیش نظر ادھر خدا اور رسول کی محبت کا دم بھرتے ہوں اور اُدھر کفار و مشرکین سے بھی میل جول رکھتے ہوں تو کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا ظاہر کرنے کے لئے اعلانِ برأت کی ضرورت ہُوئی تاکہ اپنے اپنے ہو جائیں اور بیگانے، بیگانے رہیں۔ پس جو لوگ ادھر بھی محبت رکھتے ہیں۔ اور اُدھر بھی محبت رکھتے ہیں۔ اب ایک طرف ہو جائیں گے۔ یا خالص اِدھر آجائیں گے یا صاف اُدھر ہو جائیں گے۔ نیز جو لوگ نہ اِدھر تھے نہ اُدھر تھے اب ان کو بھی اِدھر یا اُدھر ہو جانا پڑے گا۔ اور یہ مطلب صرف اقرار ولایت سے نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اعلانِ برأت سے ہی ہو سکتا تھا تاکہ دونوں فریقین سے ایک جیسا تعلّق رکھنے والے درمیان میں لٹکے نہ رہیں بلکہ اعلانیہ طور پر ایک کنارے لگ جائیں۔

لطیفہ میں نے ایک روایت میں دیکھا ہے کہ معصوم ایک دفعہ بیت اللہ میں داخل ہُوئے۔ ایک شخص وہاں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا آپ نے اُس کو سلام کہا۔ اور اس نے جواب سلام دیا پھر دوبارہ تشریف لے گئے تو ایک شخص کچھ پڑھ رہا تھا۔ آپ اس کے پاس سے گذر گئے اور اُس کو سلام نہ دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا۔ حضور اس کی وجہ کیا ہے کہ پہلے شخص کو سلام دیا اور دوسرے کو سلام نہیں دیا تو آپ نے فرمایا کہ پہلا شخص محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درُود پڑھ رہا تھا۔ اِس لئے میں نے اس کو سلام دیا لیکن دوسرا محمدؐ و آلِ محمدؐ کے دشمنوں سے برأت کا ورد کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے اس کو سلام نہیں دیا تاکہ اس کے ذکر خیر میں رکاوٹ نہ ہو۔

بہر کیف سورۂ برأۃ میں خدا اور رسُول کے دشمنوں سے بیزاری کا اعلان ہے۔ اگرچہ کفّار قریش اور مشرکین مکّہ ہی وقت نزول اس کے مصداق تنزیل تھے۔ لیکن چونکہ آیات کلام اللہ تاقیامت باقی اور زندہ ہیں۔ لہٰذا ان کے تاویلی مصداق باقی ہیں۔ اور تاقیامت باقی رہیں گے۔ اور تاقیامت اہلِ ایمان کو ان سے برأت کرنی واجب ہے۔ پس جن لوگوں کا عقیدہ خدا اور رسول کے تبلائے ہوئے مطالب

کے خلاف ہو یا جن کے اعمال و کردار اسلامی ہدایات کے منافی یا مخالف ہوں۔ ان سے برائت کرنا اور نفرت کرنا ہر مومن کا فرض ہے اور وہ لوگ انہی آیات کے تاویلی مصداق ہو سکتے ہیں۔

شانِ نزول مفسرین اور محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جب سورہ برائت نازل ہوئی تو حضرت رسالت مآبؐ نے اہل مکہ کو حکم خداوندی سنانے کے لئے حضرت ابوبکر کو مامور فرمایا اور پھر ان کو اس عہدہ جلیلہ سے معزول کر کے حضرت علیؑ کو متعین فرمایا۔ اس کی تفصیل میں الفاظ روایات میں قدرے اختلاف ہے لیکن مقصد سب کا ایک ہے کہ حضور نے ابوبکر کو روانہ فرمایا کہ سورہ برائت کی دس آیتیں ان کے سامنے جا کر پڑھے اور اُن کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو منسوخ کر دے۔ اور پھر حضرت علیؑ کو روانہ فرمایا کہ حضرت ابوبکر سے عہدہ لے کر خود جائے۔ چنانچہ حضرت علیؑ جناب رسالت مآبؐ کی مخصوص سواری ناقہ عضباء پر سوار ہو کر تیزی سے روانہ ہوئے اور مقام ذوالحلیفہ یا عرج یا ضخبان یا جحفہ پر اُن کو جا ملے اور ان کو اپنی معزولی کا مژدہ سنا کر اپنے عہدہ کا چارج سنبھالا اور آگے روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں حضرت ابوبکر واپس آئے اور خدمتِ نبوی میں پہنچ کر عرض کی کہ حضور کیا میرے حق میں کوئی سرزنش کی قسم کی آیت تو نہیں اُتری۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ اعلان چونکہ میری طرف سے ہے لہٰذا اس کو میں نے ہی پہنچانا ہے یا میری جانب سے صرف وہی پہنچا سکتا ہے جو مجھ سے ہو۔ روایت کے لفظ یہ ہیں۔ لَا يُؤَدِّيْ عَنِّيْ إِلَّا أَنَا أَوْ رَجُلٌ مِنِّيْ ۔ اور یہ روایت اکابر صحابہ سے مروی ہے۔

۱۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام: جب جناب رسالتمآبؐ پر سورہ برائت کی دس آیتیں اتریں تو آپ نے ابوبکر کو بلایا تاکہ اہل مکہ کے سامنے پڑھے۔ پھر مجھے بلایا اور فرمایا جلدی سے جاؤ۔ ابوبکر کو جس مقام پر ملو اس سے کتاب لے لو۔ اور خود جا کر اہل مکہ کو سناؤ۔ پس میں مقام جحفہ پر جا ملا۔ اور ان سے کتاب لے لی۔ ابوبکر واپس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ کیا میرے بارے میں کچھ اترا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ جبرئیل پہنچا ہے۔ اور اس نے اطلاع دی ہے کہ آپ خود پہنچائیں یا وہ شخص پہنچائے جو تجھ سے ہو۔

درمنثور ج ۳ صفحہ ۲۰۹ کنز العمال ج ۱ صفحہ ۲۴۷ مسند احمد ج ۱ صفحہ ۱۵۱ تفسیر شوکانی ج ۲ صفحہ ۳۱۹ تاریخ ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۳۸ و ج ۷ صفحہ ۳۵۷، عینی شرح بخاری ج ۸ صفحہ ۶۳۷ خصائص نسائی صفحہ ۲۰ میں ہے کہ ابوبکر غمگین واپس آئے اور پوچھا کہ کیا میرے بارے میں کچھ اترا ہے تو آپؐ نے فرمایا نہیں لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ یا خود پہنچاؤں یا وہ شخص پہنچائے جو میری اہل بیت سے ہو۔

۲۔ حضرت ابوبکر۔ جناب رسالت مآبؐ نے برائت دے کر ان کو اہل مکہ کی طرف روانہ کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا۔ اور کوئی برہنہ بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔ اور جنت میں صرف مسلمان ہی جائے گا۔ اور جس جس کا جناب رسولِ خدا کے ساتھ عہد و پیمان ہے تو وہ اپنی مدت تک رہے گا۔ اور اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔ پھر تین روز کے بعد حضرت علیؑ کو روانہ فرمایا کہ ابوبکر کو واپس بھیج دو اور خود برائت کا اعلان پہنچاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تو ابوبکر نے خدمت نبویؐ میں پہنچ کر رو دیا اور عرض کی حضور کیا مجھ سے کچھ صادر ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں تم سے کچھ صادر نہیں ہوا۔ لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ خود پہنچاؤں یا وہ پہنچائے جو مجھ سے ہو۔ مسند احمد ج ۱ صفحہ ۳ کنز العمال ج ۱ صفحہ ۲۴۶ کفایہ گنجی صفحہ ۱۲۵ تاریخ ابن کثیر ج ۷ صفحہ ۳۵۷

۳۔ ابن عباس :۔ کہ جناب رسالتمآبؐ نے ابوبکر کو بھیجا کہ اہل مکہ میں مندرجہ بالا اعلان کرے پھر علی کو پیچھے روانہ کیا۔ ابوبکر نے راستہ میں ایک مقام پر پیچھے سے جناب رسالتمآبؐ کی ناقہ قصواء کی آواز سنی تو گھبرا گیا کہ شاید حضور خود ہی تشریف لا رہے ہیں۔ پس حضرت علی پہنچے اور ابوبکر سے جناب رسولِ خدا کا نوشتہ لے لیا۔ اور جا کر اہلِ مکہ کو سنایا۔ الحدیث جامع ترمذی ج ۲ صفحہ ۱۳۵ سنن بیہقی ج ۹ صفحہ ۲۲۴ مناقب خوارزمی صفحہ ۹۹ مطالب السؤل ابن طلحہ صفحہ ۱۷ تفسیر شوکانی ج ۲ صفحہ ۳۱۹۔

۴۔ انس بن مالک :۔ کہ جناب رسالتمآبؐ نے ابوبکر کو برأت دی کہ اہلِ مکہ کو پہنچائے لیکن پھر اُن کو واپس بلا لیا اور فرمایا کہ یہ اور کوئی نہیں پہنچا سکتا۔ مگر وہ جو میری اہل سے ہو۔ پس علی کو بلایا اور ان کو یہ عہدہ تفویض کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب ابوبکر ذوالحلیفہ پر پہنچ گئے تو حضرت علیؑ کو مامور فرمایا کہ اس کو نہ پہنچائے مگر میں خود یا وہ جو میری اہل بیت سے ہو۔

(مسند احمد ج ۳ صفحہ ۲۱۲ و صفحہ ۲۸۳ ترمذی ج ۲ صفحہ ۱۳۵ حصائص نسائی صفحہ ۲۰ تاریخ ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۳۸ تفسیر ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۳۳۳ قسطلانی شرح صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۱۲۶ فتح الباری ج ۸ صفحہ ۲۵۶ عینی ج ۸ صفحہ ۶۳۷ درمنثور ج ۳ صفحہ ۲۰۹ وغیرھا۔

۵۔ ابوسعید خدری :۔ حضورؐ نے برأت دے کر ابوبکر کو روانہ کیا پھر علی کو بلا کر فرمایا کہ اس کو یا میں پہنچاؤں یا تم پہنچاؤ۔ پس اپنی ناقہ عضباء پر سوار کرکے روانہ کیا اور راستہ میں انہوں نے ابوبکر سے وہ عہدہ سنبھال لیا۔ پس ابوبکر کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں میرے بارے میں کچھ اُترا نہ ہو تو خدمتِ نبوی میں آکر عرض کی کہ حضورؐ کیا بات ہے۔ الحدیث درمنثور ج ۳ صفحہ ۲۰۹ روح المعانی ج صفحہ ۱۰۹۸ وغیر ذالک

۶۔ ابورافع :۔ حضرت نے ابوبکر کو بھیجا تو بعد میں جبریل نازل ہوا کہ یا خود پہنچاؤ یا وہ پہنچائے جو تجھ سے ہو۔ پس حضرت نے علیؑ کو روانہ فرمایا۔ جنہوں نے مکہ اور مدینہ کے درمیان ابوبکر سے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ (فتح الباری ج ۸ صفحہ ۲۵۶ درمنثور ج ۳ صفحہ ۲۱۰)

۷۔ سعد بن ابی وقاص :۔ حضورؐ نے ابوبکر کو بھیجا اور بعد میں علیؑ نے بحکم رسول ابوبکر سے عہدہ لے لیا تو ابوبکر غمگین ہوئے۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا اس کو ادا نہیں کر سکتا مگر میں یا وہ جو مجھ سے ہو۔ (خصائص نسائی صفحہ ۲۰ درمنثور ج ۳ صفحہ ۲۰۹ وغیر ذالک

اور ابن عباس نے حارث بن مالک سے روایت کی ہے کہ میں نے مکہ میں سعد بن ابی وقاص سے ملاقات کی اور پوچھا کہ تو نے علی کی کوئی فضیلت سُنی ہے۔ تو سعد نے جواب دیا کہ میں حضرت علیؑ کی چار فضیلتوں کا شاہد ہوں کہ اگر ان میں سے میرے لئے ایک بھی ہوتی تو میں پوری دنیا کی حکومت سے افضل سمجھتا۔ جب کہ حضرت نوح کے برابر عمر بھی دی جاتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضورؐ نے ابوبکر کو برأت دے کر مشرکین مکہ کی طرف روانہ کیا۔ وہ ایک دن رات کا سفر کر چکا تو علیؑ کو فرمایا کہ ابوبکر کو جا کر ملو اور ان سے وہ لے لو اور خود جا کر پہنچاؤ۔ اور ابوبکر کو واپس میری طرف بھیج دو۔ پس ابوبکر روتا ہوا واپس آیا اور عرض کی یا رسول اللہ، کیا میرے بارے میں کچھ اُترا ہے ؟ تو آپ نے فرمایا۔ نہیں بلکہ اچھائی ہے۔ ہاں میری طرف سے نہیں پہنچا سکتا۔ مگر میں خود یا وہ جو مجھ سے ہو۔ یا وہ جو میری اہل بیت سے ہو۔

۸۔ ابوہریرہ (۹) عبداللہ بن عمر (۱۰) حبشی بن جنادہ (۱۱) عمران بن حصین (۱۲) ابوذر غفاری (۱۳) جابر بن عبداللہ۔ ان سے بھی کتب صحاح میں اسی مضمون کی احادیث باختلاف الفاظ مروی ہیں۔ تفصیل بحث الغدیر ج ۶ صفحہ ۳۳۸ تا صفحہ ۳۵۰۔ بہر کیف

اگر کسی حدیث کو متواتر کہا جا سکتا ہے تو حدیث برائت یقیناً متواترات میں سے ہے۔ تہتر اہل سنّت کے علمائے اعلام نے اپنی معتبر تصانیف میں اس حدیث کو تیرہ اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے۔ اگرچہ جزوی طور پر اختلاف ہے کہ حضرت علی مقام ضنجان میں یا عرج میں یا ذوالحلیفہ میں یا جحفہ میں جا کر ابوبکر سے ملے اور عہدہ اُن سے واپس لیا۔ بہرکیف اس میں شک نہیں کہ حضرت نے پہلے ابوبکر کو بھیجا تھا اور وحی کے اترنے کے بعد حضرت علی کو بھیج کر ابوبکر کو اس عہدہ سے معزول کیا گیا۔

اس حدیث سے چند نتائج نکلتے ہیں جو ارباب بصیرت کے لئے غور و فکر کا محل ہیں۔

۱۔ حضرت ابوبکر سے اس عہدہ کا چارج لیا گیا اور ان کو معزول کر کے واپس بلا لیا گیا۔

۲۔ عہدہ کی اہمیت اس امر سے خوب واضح ہے کہ یا اس کو رسول خود پہنچائے یا وہ پہنچائے جو رسول سے ہو یا رسول کی اہلبیت سے ہو۔

۳۔ عہدہ تبلیغ برأت کی معزولی سے حضرت ابوبکر کے دل پر صدمہ ہوا۔ اور غمزدہ واپس آئے۔ حتی کہ فرط غم سے رو دیا۔

۴۔ رسول کا کسی کو اپنے عہدہ سے معزول کرنا وحی کی آمد اور اللہ کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے۔

۵۔ اگر حضرت ابوبکر تبلیغ برات کے لئے اللہ کے نزدیک موزوں ہوتے تو اُن کی بلاوجہ معزولی خلاف عدل قرار پاتی۔

۶۔ حضرت ابوبکر کا پوچھنا کہ کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے یا مجھ سے کوئی غلطی صادر ہوئی ہے (باختلاف روایت) اور حضور کا نہیں؛ میں جواب دے کر فرمانا کہ یہ میرا یا میری اہل بیت کا فریضہ ہے۔ یعنی ہم خود ہی اس کے اہل ہیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ تم کو اس لئے معزول کیا گیا ہے کہ تم اس کے اہل نہیں ہو۔

۷۔ جو شخص دس آیتوں کی تبلیغ کے لئے صرف اہل مکہ کا مبلغ نہیں ہو سکتا تو کل قرآن کی تبلیغ کے لئے کل عالم کا مبلغ کیسے بن سکتا ہے؟

۸۔ روایات سے صاف واضح ہے کہ حضرت علی کی تبلیغ میں وہی شان و حیثیت تھی جو خود جناب رسالت مآبؐ کی ہے۔

۹۔ حضرت کا اپنی مخصوص سواری پر روانہ کرنا اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ جو مقام رسول کے لئے ہے ان کے بعد وہ مقام صرف علی کو ہی زیب دے سکتا ہے۔ چنانچہ یہاں اپنی سواری عطا فرمائی اور شب ہجرت اپنا بستر عنایت فرمایا۔

۱۰۔ سعد بن ابی وقاص کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت علیؑ کی فضیلت پر پردہ ڈالنے کے عادی تھے اور اس امر کی کوشش کی جاتی تھی کہ حضرت علی کی منقبت لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکے اور ڈھونڈنے والے صحابۂ رسول سے علیحدگی اور خلوت میں کچھ نہ کچھ پوچھ ہی لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت حارث بن مالک نے ایک ڈھنگ سے سعد بن ابی وقاص سے پوچھ لیا۔ اور یہ فضیلت اتنی واضح تھی کہ سعد بن ابی وقاص کو کہنا پڑا کہ پوری رُوئے زمین کی حکومت سے یہ فضیلت بہتر ہے۔

حدیث برائت دلیل خلافت

حدیث کے الفاظ پر غور کرنے اور مطلب کی تہ تک پہنچنے کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت علی تبلیغ آیات قرآنیہ کے لئے خداوند کریم کی جانب سے نامزد تھے۔ اور اُن کی حیثیت خود رسول کی حیثیت تھی تو جب قرآن کے ایک مختصر حصہ کی تبلیغ کے لئے ایک محدود قوم تک و محدود

علاقہ میں کوئی شخص اَن فِٹ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ عقلِ سلیم کیسے تسلیم کرے کہ وہ کل قرآن کا مبلغ ہو۔ اور تمام قوموں اور تمام ملکوں کا خدا کی جانب سے پیشرو ہو۔ پس حضرت علی کی پوزیشن کو واضح کر کے گویا رسولِ خدا عملی اعلان فرما رہے تھے کہ میری جگہ پر تبلیغ قرآن کے لئے حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی بھی موزوں نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ابوبکر اس کے اہل نہ تھے تو جناب رسالت مآبؐ نے پہلے ان کا انتخاب کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف تصویر کا ایک رُخ پیش کرنے سے کبھی حقیقت نہیں کھلتی۔ اگر آپ پہلے سے ہی حضرت علی کو بھیج دیتے تو کہنے کو بات رہ جاتی کہ آپ اپنی مرضی سے ہر عہدہ جلیلہ کے لئے حضرت علی کو ہی نامزد فرما لیتے ہیں ورنہ ہم کسی سے کیا کم ہیں؟ جنگ اُحد میں جب علیؑ نے لافتیٰ الاّ علی کا تمغہ پایا تو شاید کسی دل میں اس تمغہ کا لالچ بھی پیدا ہوا ہو۔ پس اس قسم کے شکوک رفع کرنے کی خاطر حضور نے بعض غزوات میں پہلی دفعہ حضرت علی کو نامزد نہ فرمایا جیسا کہ غزوۂ ذات السلاسل کا قصہ تاریخوں میں محفوظ ہے۔ ایک صحابی کو فوج کی کافی جمعیت دے کر روانہ فرمایا جب وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر واپس آئے تو دوسرے کو علم عطا فرمایا تاکہ دل میں اس کی بھی حسرت نہ رہے۔ جب وہ بھی ناکام واپس پلٹے۔ تو حضرت علی کو روانہ فرمایا۔ اور حضرت علی فتح و کامرانی سے واپس پلٹے تو سورۂ والعادیات کی آیتیں اُتریں جن میں پروردگار نے علیؑ کے گھوڑوں کی قسمیں کھائیں۔ ینابیع المودۃ سے بھی اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے پھر جنگِ خندق میں عمرو بن عبدود کے مقابلہ کے لئے صحابہ کو مخاطب فرمایا لیکن کَاَنَّ علیٰ رُءُسِھِمُ الطَّیر۔ (گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے تھے) اور بحکایت قرآن بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (سانس حلقوم تک پہنچ گئے تھے) اور آنکھیں خوف سے دھنس گئی تھیں۔ پس حضرت علیؑ نے مردانہ وار اس سے مقابلہ کیا۔ اور سر قلم کر کے خدمت نبوی میں لائے۔ جاتے ہوئے کل ایمان کا لقب لیا برز الایمان کلّہٗ۔ الخ اور پلٹ کر ضربۃ علیؑ یوم الخندق افضل من عبادۃ الثقلین کا تمغہ پایا۔ ایسے گرانقدر خطابات اور تمغے طبیعتوں کی للچاہٹ کے لئے مہمیز تھے۔ ضرور طبیعتیں اُبھرتی ہوں گی۔ تو حضرت رسالت مآبؐ نے حاصل کرنیوالوں کے لئے راستہ کھول دیا۔ اب خیبر کا معرکہ سامنے تھا تو علم فوج ایک صحابی کو دیا تاکہ اس کا دلی ارمان مٹ جائے۔ جب وہ ویسے کے ویسے پلٹے تو دوسرے کو آگے بڑھایا وہ بھی زرد رُو ہو کر واپس پلٹے اور کہتے تھے کہ ساتھیوں نے بزدلی کی۔ ساتھی کہتے تھے علمبردار پہلے بھاگ کھڑے ہوئے اور ہم بعد میں میدان سے بھاگے۔ خیر سب کی حقیقت کھل گئی۔ آخری دن حضرت علیؑ نے میدان جیت کر فوج اسلام کا بھرم رکھ لیا اور بفرمانِ رسالت محبّ و محبوبِ خدا کرار و غیر فرار کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ پوری تفصیل تفسیر کی جلد ۱۳[1] میں آئے گی

حضرت رسالت مآبؐ جانتے تھے کہ ان مقامات میں علیؑ کے سوا کوئی بھی اہل نہیں ہے لیکن یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وقت گذر جانے کے بعد کوئی دوسرا اپنی اہلیت کا ڈھنڈورا پیٹتا رہے۔ یہاں تبلیغ آیات برأت کے موقعہ پر بھی حضور کو معلوم تھا کہ حضرت علیؑ ہی اس عہدۂ جلیلہ کے اہل ہیں لیکن بعد کی چہ میگوئیوں کا سدّباب کرنے کے لئے پہلی دفعہ حضرت علیؑ کا انتخاب نہ فرمایا بلکہ پہلے حضرت ابوبکر کو نامزد کیا اور پھر بحکم پروردگار اُن کو معزول کر کے حضرت علی کو متعین فرمایا۔

ان دونوں مقاموں میں فرق یہ ہے کہ مقامِ جنگ میں جب دوسروں کو علم عنایت فرماتے رہے تو اُن کو راستہ سے واپس نہیں

[1] پوری تفصیل تفسیر ہذا کی جلد ۱۱ سورہ احزاب کی تفسیر میں ملاحظہ ہو۔

بلوایا بلکہ وہ ناکام پلٹے تو دوسرے کو دیا اور آخر میں حضرت علی کو مامور فرمایا۔ اور اس مقام پر راستے سے بلوالیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقام جنگ میں بعض مجاہدین کی کمزوری یا لپسپائی کا فوراً مردمیدان مجاہد اور جانباز بہادر سے تدارک کیا جاسکتا تھا لیکن مقام تبلیغ میں ایک مبلغ کی ناکامی اس نازک دور میں پورے اسلامی مشن کی توہین و تذلیل کے مترادف تھی جس کا تدارک صرف زور بازو سے نہیں ہوسکتا تھا۔ بنابریں خالق کو گوارا نہ ہوا اور جو اہل نہ سمجھا گیا اس کو فوراً واپس بلوالیا گیا۔ اور اہل کو مامور کرکے بھیج دیا گیا۔

بہرکیف سمجھنے والوں کے لئے یہ مقام تاریخ اسلام میں ایک اہم حقیقت کا حامل ہے۔ اور اس موقع پر فرمانِ نبوی حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کا غیر مبہم بیان ہے۔ ایک کی برطرفی اور دوسرے کا تعین دونوں کے مراتب و منازل میں زمین و آسمان کے فرق کا ببانگِ دہل اعلان ہے۔ جس کو حقیقت آشنا کان سن رہے ہیں۔ اور دور رس دماغ قبول کر رہے ہیں۔

علامہ حلی اعلی اللہ مقامہ نے اس حدیث کو دلیل خلافت قرار دیا تو فضل بن روزبہان متعصب سیخ پا ہو کر اس کے جواب میں لکھتا ہے۔ ۹ھ میں حضورؐ نے حضرت ابوبکر کو امیر الحاج بنا کر مکہ روانہ فرمایا۔ اور یہ ہدایت کی کہ موسم حج میں سورہ برأۃ کی پہلی آیتیں مشرکین کو سنائیں۔ اور چونکہ حضرت رسالتمآبؐ کا قبائلِ عرب کے ساتھ عہد و پیمان تھا۔ اس لئے ان کو حکم دیا کہ ان کے عہد و پیمان کی چار ماہ حد مقرر کر دیں۔ جیسے خود ارشادِ خداوندی ہے۔ سورہ کی دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ تم زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔ اور ابوبکر کو یہ بھی حکم دیا کہ کوئی برہنہ بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔ اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا۔ جب حضرت ابوبکر روانہ ہو چکے تو حضرت رسالت مآبؐ کی سورہ برأۃ کی تبلیغ کے بارے میں رائے تبدیل ہوگئی کیونکہ اس میں عہد ختم کرنے کا اعلان تھا۔ یا اُن کی ۴ ماہ تک حدبندی کا حکم تھا اور عرب کسی عہد کو ختم کرنے کے لئے سوائے صاحبِ عہد یا اس کی قوم کے آدمی کے دوسرے کسی کی بات کر باور نہیں کرتے تھے۔ ابوبکر چونکہ بنی تیم سے تھا۔ پس حضرت علی کو بھیجا۔ اب ابوبکر امیر حج بھی رہا اور دوسرے اعلانات بھی اس کے ذمے تھے۔ جب پیچھے سے حضرت علیؑ پہنچے تو ابوبکر نے پوچھا کیا آپ امیرِ حج بن کر آئے ہیں تو حضرت علیؑ نے جواب دیا نہیں بلکہ میں تو عہد و پیمان ختم کرنے کی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ پس دونوں اکٹھے روانہ ہوئے۔ حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو ابوبکر نے پوچھا حضورؐ کیا میرے بارے میں کوئی آیت اُتری تھی۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ چیز یا میں نے پہنچانی تھی یا وہ پہنچاتا جو میری اہلیت سے ہو۔ اس کے بعد کہتا ہے یہ ہے حقیقتِ خبر نہ اس میں نص خلافت ہے۔ اور نہ اس میں حضرت ابوبکر کی کوئی تنقیص ہے۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا مجھے جبریل نے بتایا ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ اصل حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ دیکھئے اس ناصبی نے حضرت علی کی دشمنی میں اندھے ہو کر کس قدر حق پر پردہ ڈالنے کی ناپاک سعی لاحاصل کی ہے۔ تمام کتب احادیث سے نقل شدہ روایات کو قطع و برید کر کے ایک نئے سانچے میں ڈھال کر نئی روایت تیار کر لی اور نہایت نڈر ہو کر آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ یہ ہے حقیقت خبر۔ حالانکہ اگر اس حقیقت خبر میں نظر تحقیق ڈالی جائے تو کئی وجوہ سے یہ خبر بے حقیقت ثابت ہوتی ہے۔

ا۔ کتب صحاح اور مسانید معتبرہ میں اس طریق بیان سے قطعاً یہ روایت کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ہم نے متعدد کتابوں سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اور الغدیر میں دیگر متعدّد کتب سے اس روایت کے الفاظ منقول ہیں۔ لیکن یہ بیان کسی کتاب میں نہیں ہے۔

۲۔ حضرت رسالت مآبؐ کی عمر اس وقت تقریباً ساٹھ برس تھی تو کیا اس لمبی عمر میں حضورؐ کو عربوں کے عادات و اطوار اور طرز و تمدن سے واقفیت حاصل نہ ہو سکی تھی کہ عرب لوگ کسی عہد کی ترمیم یا تنسیخ کے لئے صاحب عہد یا اس کے کسی قریبی کے علاوہ کسی دوسرے کی بات پر باور نہیں کیا کرتے ؟ اور پاس بیٹھنے والے بھی سارے عرب تھے۔ کیا عربوں کے اس دستور کا مہاجرین و انصار کو بھی پتہ نہیں تھا ؟ اور حضرت ابوبکر جس کو پہلے یہ عہدہ دیا جا رہا تھا۔ وہ بھی عربوں کی خصوصاً مکہ والوں کی اس عادت کو نہیں جانتے تھے ؟ اگر جواب نفی میں ہے تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ حضور عربوں کے عمومی دستور کو خوب جانتے تھے۔ لیکن جاننے کی صورت میں پہلی دفعہ معاذ اللہ غلط قدم کیوں رکھا ؟ کیا خدا نے اس غلطی پر آمادہ کیا۔ یا خود لاپرواہی سے کام لیا۔ ؟ اور یہ دونوں صورتیں قابل قبول نہیں۔ علاوہ ازیں مہاجرین و انصار نے جو خود خالص عرب تھے۔ کیوں نہ روکا۔ اور خود حضرت ابوبکر نے یہ عہدہ دیدہ و دانستہ کیوں قبول کر لیا ؟

۳۔ حضرت علیؑ کی تقرری اگر دستور عرب کے مطابق تھی تو حضرت ابوبکر کو اپنی معزولی پر غم کیوں ہوا۔ اور وہ رونے کیوں لگ گئے اور اُن کو واپس آ کر یہ دریافت کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے ؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہ دستور عرب کے خلاف ایک عہدہ پر مامور تھے جو ان کے لئے معرض خطر تھا۔ پس ان کی معزولی اُن کے لئے باعث خوشی تھی۔ نہ کہ مقام گریہ۔

۴۔ عربوں کا جو قاعدہ بیان کیا ہے۔ قطعاً بے بنیاد ہے۔ صاحب عہد کی طرف سے جو بھی بحیثیت سفیر یا قاصد جائے اُسی کا ہی قول معتبر ہوا کرتا ہے خصوصاً جب کہ حضورؐ کی طرف سے تحریر بھی اُس کے پاس موجود ہو۔

۵۔ ان کے کہنے کے مطابق اگر وہ بدستور امیر الحاج رہے تو صرف نسخ عہد کی ڈیوٹی سے سبکدوش کئے جانے پر تشویش ان کو کیوں لاحق ہوئی ؟

۶۔ اگر عام عرب دستور کی مطابقت مقصود تھی تو اس کو صاحبان مسانید و صحاح نے حضرت کے فضائل و مناقب میں بلکہ خصوصیات میں کیوں درج کر لیا۔ حتیٰ کہ سعد بن ابی وقاص کو کہنا پڑا کہ حضرت نوح کی عمر کے برابر کی روئے زمین پر حکومت سے بھی افضل اور محبوب تر ہے

۷۔ روایات منقولہ میں صاف ہے کہ حضرت ابوبکر کو وہاں سے ہی واپس پلٹا یا گیا۔ جہاں حضرت علیؑ نے اپنے عہدہ کا چارج لیا اور بعض روایات میں صراحت سے مذکور ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ہدایت کی تھی کہ ابوبکر سے لے کر خود جاؤ اور ان کو واپس بھیج دو۔ چنانچہ وہ روتے ہوئے غمگین واپس آئے۔

۸۔ روایات میں ہے کہ تنسیخ عہد کے علاوہ باقی اعلانات بھی حضرت علی علیہ السلام نے خود ہی کئے تھے۔

(۱) اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا۔

(۲) بیت اللہ کا طواف کوئی برہنہ نہ کرے گا۔

(۳) جن لوگوں کے عہد کی جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ مدت مقرر ہے وہ اپنی مقررہ مدت تک رہیں گے۔ اور جن کی مدت مقرر نہیں ہے تو اب اس کی مدت چار ماہ تک ہے۔

۴۔ جنّت میں صرف مومن ہی جائیں گے۔ کنز العمال ج ۱ صفحہ ۲۴۵ ترمذی شریف ۔ سورہ توبہ

بہر کیف ہزار کوشش کر کے حضرت علی کی فضیلت پر پردہ ڈالا جائے لیکن بالآخر حقیقت بے نقاب ہو کر رہتی ہے ۔ خدا و رسول کو علم تھا کہ اس عہدہ جلیلہ کے لئے سوائے علیؑ کے کوئی دوسرا موزوں نہیں ہے ۔ پس پہلے حضرت ابوبکر کو متعیّن کیا گیا ۔ اور جب یہ خبر چا عام ہو گیا ۔ اور لوگوں میں خبر پھیل گئی تو اس کو معزول کر کے واپس بلا لیا گیا ۔ اور حضرت علیؑ کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا تاکہ ہر خاص و عام کے ذہن نشین ہو جائے کہ نیابتِ رسول کے عہدہ کے لئے حضرت ابوبکر موزوں نہیں تھے ۔ اور حضرت علیؑ ہی موزوں تھے ۔ اور جب جزوی تبلیغ میں حضرت علی کے سوا کوئی دوسرا رسول کی قائم مقامی کا اہل نہیں ہو سکا ۔ تو کلی و عمومی تبلیغ کے لئے خدا و رسول اس کو کیسے نامزد کر سکتے ہیں ؟ اور ظاہر ہے کہ اگر پہلی مرتبہ ہی حضرت علیؑ کو بھیجا جاتا تو یہ تنبیہ حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

روایت بطریق اہل بیت

تفسیر برہان میں بروایت علی بن ابراہیم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ۹ھ کو جب جناب رسالت مآبؐ غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو یہ آیتیں اتریں اور حضورؐ نے جب مکہ فتح کیا تو مشرکین کو اس سال حج کرنے سے منع نہیں فرمایا تھا ۔ اور عربوں کا دستور تھا کہ جو مکہ میں داخل ہو کر اپنے لباس میں طواف کرتا تھا پھر اس لباس کو صدقہ کر دیتا تھا ۔ اور طواف کے بعد اس لباس کا پہننا وہ اچھا نہ سمجھتے تھے ۔ لہٰذا باہر سے آنے والے عاریتہً یا کرایہ پر بھی لباس لے لیا کرتے تھے ۔ اور اس میں طواف کر کے مالک کو واپس لوٹا دیا کرتے تھے ۔ اور جس کو عاریتہً یا کرایہ پر لباس نہ مل سکتا تھا وہ برہنہ طواف کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ ایک حسین و جمیل نوجوان عورت مکہ میں بغرض طواف پہنچی تو اس کو عاریتہً اور کرایہ پر لباس نہ مل سکا اور اُس کو کہا گیا کہ اگر تو نے اپنے لباس میں طواف کیا تو یہ لباس تجھے صدقہ کرنا پڑے گا ۔ کہنے لگی میرے پاس کوئی دوسرا لباس تو ہے نہیں اس کو کیسے صدقہ کر سکتی ہوں ؟ پس اُس نے لباس اُتار کر برہنہ طواف کیا ۔ اور لوگ گردنیں اٹھا کر اُس کو دیکھنے لگے ۔ تو اُس نے اپنے آگے اور پیچھے پر ہاتھ رکھ لئے ۔ اور اس مضمون کا اس نے شعر بھی پڑھا جب طواف سے فارغ ہوئی تو لوگوں نے اُس سے شادی کی خواہش کی لیکن اُس نے صرف ایک بات کہہ کر سب کی امنگوں پر پانی پھیر دیا کہ میں شوہر دار ہوں ۔

سورہ براۃ کے نزول سے پیشتر حضور کا یہ دستور تھا کہ خود لڑائی کی ابتدا نہ کرتے تھے بلکہ صرف ان سے جہاد کرتے تھے جو پہل کریں اور سورہ براۃ میں قتل مشرکین کا عام حکم تھا لیکن حضورؐ نے بعض لوگوں کے ساتھ فتح مکہ کے موقعہ پر معاہدہ کیا تھا اب ان کو چار ماہ کی مدت دی گئی جو دسویں ذوالحجہ سے لے کر دسویں ربیع الثانی تک تھی ۔ پس آپ نے سورہ براۃ کی آیتیں ابوبکر کو دے کر روانہ فرمایا ۔ چنانچہ مقام روحاء پر حضرت علیؑ نے ابوبکر سے وہ آیات لے لیں اور ابوبکر واپس آگیا ۔ اور عرض کی کہ حضورؐ! کیا میرے بارے میں کوئی چیز اُتری ہے تو آپ نے فرمایا نہیں ۔ بلکہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں خود پہنچاؤں یا وہ شخص جو مجھ سے ہو ۔ پہنچائے ۔

بروایت عیاشی امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ فتح مکہ ۸ھ میں براءت ۹ھ میں اور حجۃ الوداع ۱۰ھ میں ہوئی اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے تلوار نیام سے نکال کر اعلان فرمایا کہ آئندہ کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی برہنہ طواف نہ کرے ۔ اور جن کے عہد کی مدت مقرر ہے وہ اپنی مدت تک ہوگا ۔ اور جن کی مدت مقرر نہیں اب اُس کی مدت چار ماہ

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱﴾

بیزاری اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے طرف ان کے جن سے تم نے عہد کیا تھا مشرکین ہیں سے (دیکھو کر)

ہوگی (اس کے بعد اس کا قتل حلال ہوگا) ۔ (صافی)

تفسیر مجمع البیان میں ہے ۔ حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ کس لئے بھیجے گئے تھے ۔ تو فرمایا چار چیزوں کے پہنچانے کے لئے (۱) کعبہ میں سوائے مومن کے کوئی داخل نہ ہو (۲) بیت اللہ کا طواف عریاں ہو کر کوئی نہ کرے (۳) اس سال کے بعد مومن و کافر مسجد الحرام میں جمع نہ ہوں گے (۴) جس کے عہد کی مدّت مقرر ہے وہی مدّت رہے گی ۔ اور جس کی مدت مقرر نہیں اُس کی چار ماہ مدت ہوگی اور تفسیر برہان میں ہے کہ مشرکین نے جواب دیا کہ ہم تیرے اور تیرے چچا زاد کے عہد سے بیزار ہیں ۔ اور اب ہمارے درمیان تلوار و نیزہ چلے گا ۔ اور اگر آپ چاہیں تو ہم خود ہی اس کی ابتدا کریں گے ۔ تب حضرت علی نے فرمایا کہ اَنْتُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۔ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ہو ، الخ ۔

نظر و فکر آلِ محمدؐ کی تنقیص اُن کے دشمنوں کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے ۔ حتیٰ کہ کسی شخص کی عمومی مقبولیت کا معیار بھی عداوتِ آلِ محمدؐ قرار پاگئی ۔ پس جس کسی نے آلِ محمدؐ کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ وہ علامہ بھی کہلایا ۔ پیر و مرشد بھی بنا ۔ اور امام کے لقب سے بھی نوازا گیا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جس جس مقام پر آلِ محمدؐ کی مدح موجود ہے وہاں سستی شہرت کے خواہشمند اور بڑے بڑے القاب کے دلدادہ حضرات نے آلِ محمدؐ پر زیادہ سے زیادہ کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ۔ اور جہاں بھی آلِ محمدؐ کے اعداء کی تنقیص قرآن مجید میں صراحتہً یا کنایۃً موجود ہے وہاں ان ضمیر فروش ملاؤں نے ان کی تاویلات کر کے کسی نہ کسی طریقہ سے اُن کو فضائل کا لباس اڑھانے کی سعی نامسعود کی ۔ لیکن بقول شاعر ؎

نُورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ۔۔۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

فضائلِ آلِ محمدؐ کو چھپانا ان لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہے بلکہ خود ہی ان لوگوں کے قلم لبا اوقات حق اُگلنے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں ۔ اور حق بین نگاہیں باطل کے تہ بہ تہ گہرے پردوں کے باوجود حقیقت کا سراغ لگا لیا کرتی ہیں ۔ جیسا کہ سورہ برائت کے متعلق وارد شدہ روایات ببانگ دہل اس امر کی شاہد ہیں ۔ اور آلِ محمدؐ کی صداقت کی اس سے زیادہ واضح دلیل اور کیا ہوگی کہ دشمن کا قلم بھی بے بس ہو کر بے طریقہ سے ان کی فضیلت کا اعلان کر جاتا ہے ع والفضل ما شهدت به الاعداء ۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ ۔ یعنی خدا اور رسولؐ کا ذمہ مشرکین سے بری ہے ۔ ان سے جن سے عہد کیا جا چکا ہے ۔ تو یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہد شکنی کو اس مقام پر کیوں روا رکھا گیا ہے ۔ حالانکہ عہد کی وفا واجب ہوا کرتی ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تین صورتوں میں عہد کا توڑنا جائز ہوا کرتا ہے ۔ (۱) جب کہ عہد مشروط ہو ۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ ہمارے درمیان عہد اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا بذریعہ وحی اس کو اُٹھا نہ دے (۲) مشرکین کی جانب سے خیانت اور عہد شکنی کی ابتدا ہو چکی ہو (۳) عہد کی مدت مقرر ہو ۔ اور تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ روایت میں ہے حضورؐ نے مشرکین کے ساتھ عہد مشروط کیا تھا ۔ اور نیز یہ بھی مروی ہے کہ مشرکین نے

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ

پس چل پھر لو زمین میں چار مہینے اور جان لو کہ تحقیق تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ کو

وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ۝۲ وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ

اور تحقیق اللہ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو اور اطلاع ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو

عہد شکنی کی ابتدا کی تھی یا یہ کہ وہ عہد شکنی کا ارادہ رکھتے تھے۔ پس خداوند کریم نے سورہ برأت نازل فرما دی۔

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ۔ یعنی چار ماہ تک کی مدت یعنی ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۰ ربیع الثانی تک تم زمین میں با امن و امان چلو پھرو۔ اس میعاد کے گذرنے کے بعد مسلمانوں پر تمہارا خون مباح ہوگا۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سال حج ۱۰ ذوالقعدہ کو تھی۔ اور یہی قربانی کا دن تھا لہٰذا چار ماہ کی مدت ۱۰ ربیع الاول تک تھی۔ اور دوسرے سال حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ ذی الحجہ قربانی کا دن مقرر ہوا۔ (مجمع البیان)

وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ کا مصداق علیؑ ہے

(۱) حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام سے مروی ہے کہ یہاں اذان کا مصداق علیؑ ہے (۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے اس آیت مجیدہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ خداوند کریم نے آسمان پر حضرت کا ایک نام اذان بھی مقرر کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے جناب رسالت مآبؐ کی جانب سے مشرکین مکہ کو برأت پہنچائی تھی کہ پہلے حضورؐ نے ابوبکر کو بھیجا تھا تو جبریل نازل ہوا کہ اس کو نہ پہنچائے مگر تو خود یا وہ شخص جو تجھ سے ہو۔ پس حضورؐ نے حضرت علیؑ کو روانہ فرمایا۔ پس حضرت علیؑ نے راستہ میں ابوبکر سے صحیفہ لے لیا اور مکہ میں گئے تو خدا نے ان کا نام اذان مقرر کیا۔ اور یہ پروردگار کا حضرت علیؑ کو عطیہ ہے۔

(۳) نہروان سے واپسی پر حضرت امیر علیہ السّلام نے کوفہ میں خطبہ پڑھا جبکہ آپ کو اطلاع ملی کہ معاویہ آپ کو سب کرتا ہے اور عیب جوئی کرتا ہے۔ نیز آپ کے طرفداروں کو قتل کرتا ہے۔ تو آپ نے حمد و ثنا و درود و سلام کے بعد اپنے بیان میں ارشاد فرمایا انا المؤذن فی الدنیا والاخرۃ۔ میں دنیا و آخرت میں خدا کی جانب سے مؤذن ہوں۔ ایک مقام پر خدا فرماتا ہے فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ۔ یعنی اس دن مؤذن اذان دے گا کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر انا ذلك المؤذن۔ وہ مؤذن میں ہوں گا۔ اور دوسرا ارشاد ہے۔ وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ۔ اور یہاں اذان سے مراد میں ہوں۔

علامہ حلّی قدس سرہ نے اس آیت مجیدہ کو بھی حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کی دلیل قرار دیا ہے اور مسند احمد سے نقل کیا گیا ہے کہ اس اذان سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ اور دلائل الصدق میں درمنثور سے منقول ہے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں حضرت علی کا نام موجود ہے لیکن لوگ جانتے نہیں ہیں۔

حکیم بن جبیر راوی حدیث کہتا ہے میں نے دریافت کیا کہ کہاں ہے تو آپ نے فرمایا نہیں معلوم نہیں کہ خدا فرماتا ہے۔ وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ الخ۔ خدا کی قسم اس کے مصداق آپ ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کی جانب سے یہ لقب حضرت امیر علیہ السّلام

يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۚ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ

بروز حج اکبر کہ تحقیق اللہ بیزار ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول پس اگر توبہ کرو تو

خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ

بہتر ہے تمہیں اور اگر منہ پھیرو تو جانو کہ تحقیق تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ کو اور خوش خبری دو

كَفَرُوْا بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ﴿۳﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ

کافروں کو عذاب دردناک کی مگر جن مشرکین کے ساتھ تم نے عہد کیا اور پھر

کی عظمت شان اور رفعتِ مقام کا واضح مینار ہے۔ پس خدا کی احکام کی تبلیغ اور رسول کی نیابت انہی کی ذات والا صفات کے لئے ہی زیبا ہے۔

يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ۔ امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ یوم حج اکبر سے مُراد قربانی کا دن ہے اور اس کے مقابلہ میں حج اصغر سے مُراد عُمرہ ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس سال چونکہ مسلمانوں اور مشرکوں نے مل کر حج کیا تھا۔ اِس لئے وہ دن حج اکبر کا دِن کہلایا اور اس کے بعد پھر مشرکین کا بیت الحرام میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔

إِنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ۔ بعضوں نے کہا ہے کہ پہلی برأت سے مراد نقض عہد ہے۔ اور یہاں برأۃ سے مراد دوستانہ تعلقات کا اختتام ہے۔ لہذا تکرار لازم نہیں آتا۔

فَإِنْ تُبْتُمْ۔ یعنی مشرکوں کو بتا دو کہ اگر توبہ کرلیں اور شرک سے باز آجائیں تو فائدہ میں رہیں گے۔ لیکن اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں اور شرک پر ڈٹے رہیں تو وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ گویا یہ بھی دبے لفظوں میں اُن کی تہدید تھی۔ پھر اس کے بعد صاف طور پر فرما دیا کہ ان کو دردناک عذاب کی بشارت دیدو۔

إِلَّا الَّذِيْنَ۔ یہ استثناء ہے۔ یعنی ایسے مشرک جن کے ساتھ تمہارا عہد و پیمان ہے۔ اور انہوں نے عہد شکنی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور نہ تمہارے دشمنوں کے ساتھ مل کر تمہاری ایذا کے درپے ہوئے تو ان کے عہد کو اپنی مدت تک پورا کرو اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے عہد و پیمان ختم کر دیئے گئے یا چار ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی اُن سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے عہد شکنی کی طرف اقدام کر چکے تھے۔ اور مروی ہے کہ بنی کنانہ اور بنی ضمرہ کی قوم کے آدمیوں کے عہد کی مدت ابھی نو ماہ باقی تھی۔ انہوں نے نہ عہد شکنی کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کی امداد میں حصّہ لیا تھا۔ پس حکم ہوا کہ ان کا عہد ان کی مدت تک رہنے دیا جائے۔

الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ :۔ یہاں حرمت والے مہینوں سے مراد وہ مدت ہے جو کفار کے عہد و پیمان کی مقرر کی گئی تھی۔ یعنی چار ماہ۔ یعنی اس مدت کے گذر جانے کے بعد کفار کا خون مباح ہے۔ ان کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو۔ اور ان کو پکڑو۔ اور قید کرو۔ اور مسجد الحرام میں آنے سے روکو۔

يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى

انہوں نے نہیں نقصان دیا تم کو کچھ اور نہ مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان کا عہد اپنی مدت

مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ④ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا

تک تحقیق اللہ دوست رکھتا ہے ڈرنے والوں کو پس جب گذر جائیں مہینے حرمت والے تو قتل کرو

الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ

مشرکوں کو جہاں ان کو پاؤ اور پکڑو ان کو اور بند کرو ان کو اور بیٹھو ان کے لئے ہر گھات پر پس اگر

كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ

توبہ کریں اور قائم کریں نماز کو اور ادا کریں زکوٰۃ کو تو چھوڑ دو ان کا راستہ تحقیق

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ

اللہ غفور رحیم ہے اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ لے تو اس کو پناہ دو

وَاقْعُدُوْا لَهُمْ ۔ یعنی ہر حیلہ اور ہر طریقہ سے ان کو ذلیل کرو۔ اور اُن پر زندگی کا میدان تنگ کر دو۔ یہ اس لئے کہ اسلام تمدن انسانی کی راہوں کو ہموار کرنے کے لئے آیا ہے۔ اور انسانوں میں سے جو بھی اس راہ میں رکاوٹ کا باعث بنے۔ وہ ازراہِ عقل واجب القتل ہے۔ جس طرح انسانی اعضا میں سے اگر ایک عضو خراب ہو جائے تو باقی اعضا کی حفاظت کے پیش نظر تقاضائے عقل وہ خراب اور موذی عضو کاٹ دینے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہ ظلم نہیں بلکہ دفع ظلم ہے۔ جس پر انسانیت کی بقا کا دار و مدار ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا بلکہ اسلام اپنے مبنی برصداقت اصولوں کی بنا پر مقبول عام ہوا۔ اور انسانیت کی ناؤ کو ڈبونے کے درپے ہونے والوں کو اس راستہ سے بقوت بازو ہٹا دیا گیا۔

وَاِنْ اَحَدٌ ۔ حضرت امیر علیہ السلام سے ایک مشرک نے سوال کیا تھا کہ یہ بتائیے اگر مدت گذر جائے اور ہم میں سے کسی نے جناب رسولِ خدا سے ملنا ہو تو اس کے لئے بھی عہد ختم ہے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں بلکہ خدا نے فرمایا ہے اگر کوئی مشرک تم سے پناہ لے تو اس کو پناہ دو۔ قرآن مجید سننے کا اس کو موقع دو۔ پھر با امن اس کو اپنے گھر پہنچاؤ۔ اور یہ امان اس لئے ہے کہ وہ ایمان اور قرآن مجید کو جانتے نہیں ہیں۔ پس اس امان کے ذریعے سے ان کو موقع دیا گیا ہے کہ سنیں اور سمجھیں اور راہِ راست پر آئیں۔

رکوع نمبر ۸

كَيْفَ يَكُوْنُ[19] ۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ قبائل بکر میں سے بنو خزیمہ بنو مدلج۔ بنو ضمرہ اور بنو دئل نے قریش کے ساتھ مل کر حدیبیہ کے دن جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ عہد و پیمان کئے تھے۔ پس ان

حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾

تاکہ سنے کلام خدا کو پھر پہنچاؤ اس کو اس کے امن کی جگہ پر یہ اس لئے کہ وہ نادان قوم ہیں

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ

کیسے رہ سکتا ہے مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک سوائے ان کے جن کے ساتھ تم نے عہد کیا

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

مسجد الحرام کے پاس پس جب تک وہ ثابت رہیں تو تم بھی ثابت رہو ان کے لئے تحقیق اللہ دوست رکھتا ہے

الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ

ڈرنے والوں کو یہ کیسے ہو؟ حالانکہ وہ اگر غالب آ جائیں تم پر تو نہ لحاظ رکھیں گے تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا وہ تم کو

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨﴾ اِشْتَرَوْا

راضی کرتے ہیں منہ سے اور نہیں مانتے اُن کے دل اور وہ اکثر فاسق ہیں جو خرید تے ہیں اللہ کی

عہدوں کو قریش اور بنو دئل نے توڑ دیا تو ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ اللہ و رسول کے نزدیک ان مشرکوں کے عہد کی کیا وقعت ہے جو عہد شکنی میں خود پہل کریں۔ ہاں وہ لوگ جو اپنے عہد پر ثابت ہیں تو تم بھی ان کے لئے ثابت رہو اور عہد شکنی نہ کرو۔

كَيْفَ وَاِنْ ۔ یعنی ایسے لوگوں کا کیا عہد جو موقعہ کی تاڑ میں ہوں۔ اگر ان کا بس لگے تو تم کو ہر ممکن ایذا دیں گے۔ پھر نہ تمہاری رشتہ داری کا لحاظ کریں گے اور نہ عہد کی پاس کریں گے۔

اِلًّا ۔ اس کا لغوی معنی قرابت بھی ہے اور اس کا معنی عہد بھی ہوا کرتا ہے چنانچہ یہ ال سے ماخوذ ہے اور ال کا معنی ہے چمک۔ اَلَّ يَؤُلُّ اَلًّا (چمکنا) اُذُنٌ مُؤَلَّلَةٌ (تیز کان) اس مقام پر ال کا معنی قرابت ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ذِمَّةً مذکور ہے۔ جس کا معنی عہد ہے۔ اور بعضوں نے ال کا معنی ہمسائیگی بھی کیا ہے۔ نیز بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ خداوند کریم کے ناموں سے ایک نام ہے۔

اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔ کافر سب کے سب فاسق ہوا کرتے ہیں۔ اس جگہ مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو عہد و پیمان کی کوئی قدر نہیں کرتے بلکہ بے وفا اور غدار ہوتے ہیں۔

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۔ کہتے ہیں ابو سفیان نے عرب کی ایک قوم کو کھانے کی دعوت دی تھی تاکہ ان کے دلوں میں نبی علیہ السلام کی عداوت راسخ ہو۔ پس اسی کے متعلق فرماتا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کے بدلہ میں وہ معمولی منافع دنیاویہ خرید کر لیتے ہیں۔

لَا يَرْقُبُوْنَ ۔ اس کا مادہ رقبہ ہے۔

اور مجمع البیان میں ہے کہ رقبہ۔ انتظار۔ مراقبہ۔ مراعات اور محافظہ سب کا معنی ایک ہے۔

بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾

آیات کے بدلہ میں قیمت تھوڑی پس روکتے ہیں اس کے راستہ سے تحقیق وہ بُرا کرتے ہیں

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ

نہیں لحاظ کرتے مومن کے بارے میں رشتہ کی اور نہ عہد کی اور وہ ظالم ہیں پس اگر

تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ

توبہ کریں اور قائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور ہم کھول لیتے ہیں

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ

آیات کو اس قوم کے لئے جو جانیں اور اگر توڑ دیں اپنی قسموں کو بعد عہد کرنے کے اور اعتراض کریں تمہارے

طَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَیْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

دین میں تو جنگ کرو کفر کے سرغنوں سے تحقیق ان کی کوئی قسم نہیں تاکہ وہ باز آئیں

ناکثین وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا ۔ حنان بن سدیر سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السّلام سے سُنا۔ آپ نے فرمایا کہ بصرہ کے کئی آدمی میرے پاس آئے اور انہوں نے طلحہ اور زبیر کے متعلق مجھ سے پوچھا تو میں نے جواب دیا وہ ائمۃ الکفر تھے (یعنی کفر کے سرغنے اور امام تھے) کیونکہ بصرہ میں جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئیں تو حضرت علی علیہ السّلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا جلدی مت کرو۔ پہلے میں اپنا عذر تمام کر دوں جو میرے، ان کے اور اللہ کے درمیان ہے۔ پس کھڑے ہو کر فرمایا۔ اے اہل بصرہ! کیا میں نے حکم میں کوئی ظلم کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر فرمایا کہ میں نے کسی قسم کی خلاف ورزی کی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ کیا میں نے اپنے اور اپنی عیال کے لئے مال دنیا جمع کیا ہے اور تم کو محروم کیا ہے؟ تو کہنے لگے نہیں۔ پھر فرمایا کیا میں نے تم میں حدود کو جاری کیا اور غیروں کو معافی دی ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں۔ پس فرمایا کیا وجہ ہے کہ میری بیعت کو تم توڑ رہے ہو۔ اور غیر کی بیعت کو تم نے نہیں توڑا۔ میں نے معاملات کو پرکھا ہے۔ پس سوائے کفر اور تلوار کے مجھے کوئی بات نظر نہیں آتی۔ یہ کہہ کر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ آیت پڑھی۔ وان نکثوا ۔ الآیۃ پھر قسم کھا کر فرمایا کہ اس آیت کے مصداق یہی لوگ ہیں۔ اور آج تک اس آیت کے مصداق لوگوں سے لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس آیت پر پہلے پہل میں ہی عمل کر رہا ہوں اور جب سے اُتری ہے آج تک تشنۂ تعمیل تھی (برہان وصافی)

اور تفسیر مجمع البیان اور برہان میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جنگ جمل سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ذکر فرمایا کہ جناب رسالت مآبؐ نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ اے علی لَتُقَاتِلَنَّ الْفِئَةَ النَّاكِثَةَ وَالْفِئَةَ الْبَاغِيَةَ وَالْفِئَةَ

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ

تم کیوں نہیں لڑتے ایسی قوم سے جنہوں نے تمہارے سے عہد کو توڑ ڈالا اور رسول کے نکالنے کا ارادہ کیا اور وہ ابتدا کر چکے ہیں

اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

پہلی دفعہ کیا ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ سزاوار ہے کہ اس سے ڈرو اگر مومن ہو

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ

ان سے لڑو خدا ان کو عذاب دیگا تمہارے ہاتھوں اور ان کو رسوا کرے گا اور تمہاری مدد کرے گا اور شفا دے گا

صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى

مومن قوم کے دلوں کو اور ختم کرے گا ان کے دلوں کے غصہ کو اور توبہ قبول کرے گا جس کی

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ

چاہے اور اللہ جاننے والا دانا ہے کیا تم نے خیال کیا کہ چھوڑ دیے جاؤ گے اور نہ جانے گا اللہ

المارقۃ۔ یعنی تم بیعت توڑنے والوں، بغاوت کرنے والوں اور دین سے خارج ہونے والوں سے ضرور لڑو گے۔ پس پہلی جماعت سے مراد جنگ جمل والے ہیں جن کے سرغنے طلحہ و زبیر تھے۔ اور ان کو ناکثین کہا جاتا ہے۔ اور دوسری جماعت سے مراد جنگ صفین والے ہیں جن کا سرغنہ معاویہ تھا۔ اور اُن کو قاسطین کہا جاتا ہے۔ اور تیسری جماعت نہروان کے خارجیوں کی ہے جن کو مارقین کہا جاتا ہے۔ بہر کیف یہ لوگ اس آیہ مجیدہ کے تاویل میں مصداق ہیں۔ اور تنزیل کے لحاظ سے اس کے مصداق رؤسا قریش اور اکابر مشرکین تھے جنہوں نے عہد شکنی کی ابتدا کی تھی۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد قوم یہود ہے۔ جنہوں نے عہد کو پہلے پہل توڑا۔ اور مسلمانوں کے خلاف کفار کی امداد کی۔ اور مدینہ سے رسولِ خدا اور مسلمانوں کے نکالنے کی تدبیریں کیں۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد بھی کفارِ مکہ ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں پر جور و ستم کی ابتدا بھی کی تھی۔ اور مکہ سے نکال بھی دیا تھا۔ اور پھر عہد کے توڑنے کی ابتدا بھی اُنہوں نے ہی کی تھی۔

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ۔ یعنی جو مومن مدت سے کفار کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اب اُن کے دل ٹھنڈے ہوں گے۔ اور کافر لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔ پس ان سے لڑو اور خوب لڑو۔

وَيَتُوْبُ اللّٰهُ۔ یعنی اب بھی اگر ان میں سے کوئی توبہ کرنا چاہے تو توبہ کا دروازہ بند نہیں بلکہ خدا توبہ کرنے والوں کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ بشرطیکہ دل سے توبہ کرے۔ مشیت کی قید لگانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ چونکہ دلوں کے حالات کا دانا بینا ہے۔ پس جس کی توبہ صدقِ نیت سے ہوگی اس کو قبول کرے گا۔ اور جو زبان سے توبہ کرے گا اور دل صاف نہ ہوگا تو خدا اس کی توبہ

الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا مِنْکُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلَا رَسُوْلِہٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ

ان کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور نہ بنائے اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے علاوہ کوئی

قبول نہ کرے گا۔

قاسطین بروایت عیاشی ابوالاغر مینی یا تیمی سے منقول ہے کہ جنگ صفین کا میں تماشا دیکھ رہا تھا کہ عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب ہتھیار لگائے ہوئے سر پر خود رکھے ہوئے شکی گھوڑے پر سوار تھے۔ اور ادھر فوج شام کی طرف سے ایک بہادر عرار بن ادھم نامی میدان میں نکلا۔ اور اس نے عباس کو للکارا۔ پس حضرت عباس بن ربیعہ اس کے مقابلے میں نکلے۔ گھوڑوں سے اتر کر دونوں نے پاپیادہ تلوار سے لڑائی کی۔ کافی دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ اور زرہوں کی مضبوطی کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے پر غالب نہ آیا آخر کار عباس نے اس شامی کو مار گرایا۔ پس لوگوں میں نعرۂ تکبیر کی گونج پیدا ہوئی کہ زمین بھی لرزتی نظر آئی۔ میں نے سنا کہ ایک شخص نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ۔ الایۃ۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا تو حضرت علیؑ تھے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ ہماری طرف سے کون لڑ رہا تھا۔ تو میں نے جواب دیا آپ کی قوم کے بزرگ زادے عباس بن ربیعہ تھے۔ پس حضرت نے عباس کو بلایا اور فرمایا کیا میں نے تم کو اور حسنؑ و حسینؑ و عبداللہ بن جعفر کو ایک جگہ ٹھہرے رہنے کو نہیں کہا تھا۔ پھر کیوں تم میدان میں گئے۔ اس نے عرض کی۔ اے آقا! اس شامی نے مجھے للکارا تھا۔ اس لئے میں چلا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ معاویہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم کی نسل ختم ہو جائے۔ تم ہرگز میدان میں نہ جاؤ۔ اور اپنے امام کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ ادھر معاویہ نے اپنی فوج میں آواز دی کہ کوئی ہے جو عرار کا بدلہ لے۔ چنانچہ دو نجدی جوان میدان میں کودے اور عباس کو للکارا۔ عباس نے کہا میں اپنے سردار سے اجازت لے لوں۔ چنانچہ خدمت امام میں پہنچ کر حقیقت بیان کی۔ آپ نے فرمایا اپنے ہتھیار اور گھوڑا مجھے دے دو۔ چنانچہ عباس کے ہتھیار لگا کر اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر خود میدان میں پہنچے۔ انہوں نے پوچھا سردار سے اجازت لے لی ہے؟ تو آپ نے آیت قرآن پڑھی۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ (الایۃ) یعنی جو لوگ جہاد کرتے ہیں ان کو اجازت دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ پس ید اللّٰہی جنبش سے ایک کا سر قلم کیا۔ اس کے بعد فوراً دوسرا آیا تو اس کو بھی دربانِ جہنم کے حوالہ کیا اور واپس آکر گھوڑا اور ہتھیار عباس کو واپس کر دیئے۔ معاویہ یہ خبر سن کر بہت شرمندہ ہوا۔ (مختصراز برہان)

اَمْ حَسِبْتُمْ۔ یعنی خداوند کریم مومنوں کو آزماتا ہے۔ اس بناء پر ارشاد ہے کیا انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ ہمیں ایسا ہی چھوڑ دیا جائے گا بلکہ خدا تو پرکھنا چاہتا ہے کہ مجاہد کون ہیں اور میدانِ جنگ سے کنارہ کرنے والے کون ہیں؟ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ اللہ و رسول و مومنین کے ساتھ دل وجان اور قلب ولسان سے کون کون ہیں۔ اور ظاہری محبت رکھ کر اندرونی طور پر اغیار سے محبت رکھنے والے کون ہیں؟ اور اس کے باطنی مصادیق کے لحاظ سے معصومین علیہم السلام سے متعدد روایات منقول ہیں کہ آیت مجیدہ میں مومنین سے مراد ائمہ ہدیٰ علیہم السلام ہیں۔ اور ولیجہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اولوالامر کے علاوہ ہو۔ اور لوگوں کو اپنی اطاعت کی دعوت دے۔

وَلِيجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ اَنْ يَّعْمُرُوا

اندرونی دوست اور خدا جانتا ہے جو تم کرتے ہو — نہیں جائز مشرکوں کے لئے کہ تعمیر کریں اللہ کی مساجد کی — درحالیکہ

مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِينَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى

شاہد ہیں اپنے نفسوں پر کفر کے — ان لوگوں کے ضائع ہو گئے عمل اور وہ دوزخ

النَّارِ هُمْ خٰلِدُونَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

میں ہمیشہ رہیں گے — صرف تعمیر مساجد خدا ان کا حق ہے جو ایمان لائیں اللہ پر اور قیامت پر اور

رکوع نمبر ۹ تعمیر مساجد

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ۔ یعنی مشرکوں کا کوئی حق نہیں کہ وہ مساجد کی تعمیر کریں یا اس کی تولیت سنبھالیں بلکہ یہ حق صرف مسلمانوں کو ہی حاصل ہے اور تعمیر سے مراد عام ہے خواہ وہ تعمیر از قسم بنا درست ہو یا از قسم عبادت و اطاعت ہو کیونکہ مسجد میں اطاعت کے لئے داخلہ مسجد کی آبادی و تعمیر کہلاتی ہے اور مشرکین کا اپنے نفس پر کفر کی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ ان کے افعال و اعمال ان کے کفر کے شاہد ہیں پس مساجد میں آنا جانا ان کی مرمت اور دیکھ بھال کرنا صفائی کرنا روشنی کا انتظام کرنا اور اس میں عبادت کرنا صرف مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔

مَسٰجِدَ اللّٰهِ۔ بعض لوگوں نے اس لفظ کو واحد کے صیغے سے مسجد اللہ پڑھا ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہ حکم صرف مسجد الحرام کے لئے مختص ہے لیکن مشہور قرأت کی بنا پر اس کو مساجد پڑھنا چاہیئے تاکہ تمام مساجد کے لئے حکم عام ہو جائے۔ لغت میں مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سجدہ کیا جائے لیکن اصطلاح میں اس مکان کو مسجد کہتے ہیں جو نماز کے لئے تیار کیا جائے نیز نمازی کے وہ سات اعضا جو بوقت سجدہ زمین پر ہوتے ہیں ان کو اصطلاح فقہ میں مساجد کہا جاتا ہے۔

احکام مساجد

بناء مسجد۔ ابوعبیدہ حذّاء سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے سنا فرما رہے تھے کہ جو شخص مسجد بنائے تو خدا اُس کے بدلہ میں اس کا گھر جنّت میں تیار کرتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام راہ مکّہ میں میرے پاس سے گذرے جب کہ میں نے ایک مقام پر پتھروں کو درست کر کے مسجد کی جگہ بنا رکھی تھی تو میں نے پوچھ لیا کہ حضور کیا یہ مسجد بھی اسی کا فرد ہے (جو آپ نے فرمایا تھا) آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اور حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام نے فرمایا کہ جو شخص ایک پرندہ کے بیٹھنے کی جگہ کے برابر بھی مسجد بنائے خدا اس کا گھر جنّت میں بنائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹی مسجد بنانا بھی جنّت میں گھر بنانے کے مترادف ہے۔

مسئلہ۔ مسجد کے وقف کرنے کے لئے بالخصوص عربی میں صیغہ جاری کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ نیّت کافی ہے جیسا کہ محققین کا قول ہے اور اس میں ایک نماز پڑھنے سے وقف پختہ ہو جاتا ہے۔ خواہ وقف کرنے والا خود ہی پڑھ لے۔ اور اکثر مساجد اسی طریقہ سے بنائی جاتی ہیں۔ اور سابق روایت بھی ظاہراً اسی کی تائید کرتی ہے۔

اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا
قائم کریں نماز کو اور دیں زکوٰۃ اور نہ ڈریں مگر اللہ سے تو یقین ہے کہ ایسے لوگ

مسئلہ - اپنے گھر میں جو مقام نماز کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے اس پر مسجد کے احکام جاری نہیں ہو سکتے۔ اور اس کی تبدیلی بھی جائز ہے۔ اگرچہ اس پر گھر والے مسجد کا اطلاق بھی کرتے ہوں۔

مسئلہ - جس طرح اصل مسجد میں یہ جائز نہیں کہ اس کو ایک جگہ سے نقل کر کے دوسری جگہ بنایا جائے۔ اس طرح جو اشیاء مسجد کے لئے وقف کی جائیں وہ بھی مسجد سے باہر استعمال نہیں کی جاسکتیں۔

مسئلہ - مسجد گر جائے تو اس کو از سر نو بنانے میں کوئی حرج نہیں اسی طرح مسجد کی توسیع یا گرا کر پختہ بنانا بھی جائز ہے۔

مسئلہ - اگر ایک مسجد سے کوئی سامان وافر ہو تو دوسری مساجد میں اُسے صرف کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ - اگر مسجد سے متعلق کسی چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اور اس مسجد میں یا دوسری مسجد میں وہ صرف بھی نہ کی جا سکتی ہو تو ایسی صورت میں اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کی ضروریات میں صرف کی جا سکتی ہے۔

مسئلہ - مسجد کو ملکیت میں داخل کرنا حرام ہے اور اسی طرح مسجد کو راستہ بنانا یا راستے میں اس کا کچھ حصہ داخل کرنا ناجائز ہے۔

مسئلہ - اگر مسجد گر جائے اور مسجد کے آثار بھی ختم ہو جائیں تاہم اس جگہ کو کسی دوسرے تصرف میں لانا جائز نہیں۔ اور اس جگہ کو پاک رکھنا ضروری ہے۔ اور اس میں پڑی ہوئی نجاسات کو دُور کرنا واجب ہے کیونکہ مسجد کو پاک رکھنا واجب ہے اور اس کو نجس کرنا حرام ہے۔ اسی بنا پر مسجد میں سونا مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

مسئلہ - اگر نماز کا وقت ہو اور مسجد میں نجاست موجود ہو تو نمازی پر واجب ہے کہ پہلے نجاست کو دُور کرے اور پھر نماز پڑھے۔ بشرطیکہ نماز کا وقت تنگ نہ ہو۔ ورنہ پہلے نماز پڑھ کر پھر تطہیر مسجد کرے۔

مساجد میں مراتب کا فرق گھر میں نماز پڑھنا صرف فرض کی ادائیگی ہے۔ اور گلی کی مسجد میں ایک نماز بارہ نمازوں کے برابر ہے اور محلہ کی مسجد میں ایک نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ اور جامع مسجد میں ایک نماز ایک سو نماز کے برابر ہے۔

مسجد کوفہ - حدیث میں وارد ہے کہ جنّت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ جنّت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ اس میں ایک ہزار ستّر پیغمبروں نے نماز ادا فرمائی۔ الخ - امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا کہ اس میں ایک ہزار نبی اور ایک ہزار وصی نے نماز پڑھی۔ بلکہ ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی عبد صالح نہیں گذرا۔ بلکہ کوئی نبی نہیں گذرا جس نے اس مسجد میں نماز نہ ادا کی ہو۔ اور اس میں نافلہ پانچسو نماز کے برابر ہے۔ اور اس مسجد میں بغیر تلاوت و عبادت بیٹھ رہنا بھی عبادت ہے۔ الخ - اور ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ پہلے پہل اس کا نشان حضرت آدمؑ نے قائم کیا تھا۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ خدا و رسول کے حرم کے بعد زمین کا

مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

ہدایت یافتہ ہوں گے کیا بنایا ہے تم نے حاجیوں کی سیرابی اور مسجد الحرام کی آبادی کو برابر اس کے جو

کونسا قطعہ افضل ہے۔ تو آپ نے فرمایا کوفہ۔ یہ پاک و پاکیزہ ہے۔ اس میں نبیوں اور وصیوں کی قبریں ہیں۔ اس میں مسجد سہل ہے جس میں ہر نبی نے نماز ادا کی ہے۔ اسی میں اللہ تعالےٰ کا عدل قائم ہوگا۔ الخ۔ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا مکہ اللہ کا حرم ہے اور نبیؐ و علیؑ کا حرم ہے۔ اس میں ایک نماز ایک لاکھ نماز کے برابر ہے۔ اور ایک درہم خرچ کرنا ایک لاکھ درہم کے برابر ہے۔ اور مدینہ اللہ و رسولؐ و علیؑ کا حرم ہے۔ اس میں ایک نماز دس ہزار نماز کے برابر ہے۔ اور ایک درہم دس ہزار درہم کے برابر ہے اور کوفہ خدا و رسولؐ و علیؑ کا حرم ہے۔ اس میں ایک نماز ایک ہزار نماز کے برابر ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السّلام نے ایک دن فرمایا اے اہل کوفہ تم کو خدا نے وہ چیز عطا کی ہے۔ جو اور کسی کو نہیں عطا کی گئی تمہاری جائے عبادت حضرت آدمؑ کا گھر ہے۔ حضرت نوحؑ کا گھر ہے۔ اور حضرت ادریسؑ کا گھر ہے اور حضرت ابراہیمؑ حضرت خضرؑ اور میرا مصلا ہے۔ اور تمہاری مسجد ان چار مسجدوں میں سے ہے۔ جن کو خدا نے چن لیا ہے۔ اور یہ مسجد بروز محشر اپنے اہل کے لئے اور ان لوگوں کے لئے شفاعت کرے گی جس نے اس میں نماز پڑھی ہوگی اور اس کی شفاعت قبول ہوگی۔ اور زمانہ نہ گذرے گا کہ اس میں حجر اسود نصب کیا جائے گا۔ اور ایک زمانہ ہوگا کہ یہ مسجد حضرت مہدی علیہ السلام کا مصلےٰ ہوگا جو میری اولاد سے ہوگا۔ اور ہر مومن کا مصلےٰ ہوگا۔ اور مومن جہاں بھی ہوں گے اس میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ پس اس کو نہ چھوڑو۔ اور اللہ کے قرب کے لئے اس میں نماز پڑھا کرو۔ اور اپنی حاجات طلب کیا کرو۔ اگر لوگ اس کی برکات جانتے ہوتے تو اطراف زمین سے اس کی طرف کھنچ کر آتے اگرچہ برف پر ہی ان کو چلنا پڑتا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس میں ایک نماز حج کا ثواب رکھتی ہے۔ اور مروی ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی اسی جگہ تیار کی تھی۔ اور کشتی یہیں سے چلی تھی۔ اسی جلد کے صفہ ۲۲ پر مزید وضاحت ملاحظہ فرمائیں۔

مسجد سہلہ امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ اس میں حضرت ادریسؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا گھر ہے۔ اور حضرت خضرؑ کا مقام ہے۔ اور اسی میں نفخ صور ہوگا۔ پس اس مسجد کے پہلو سے ستر ہزار آدمی اٹھیں گے جو بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ اس مسجد میں مغرب و عشا کے درمیان دو رکعت نماز حاجت کا پڑھنا دفع مصیبت کا باعث ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ بدھ کی رات یہ عمل کیا جائے۔ جیسا کہ صاحب جواہر نے ذکر کیا ہے۔ اور مروی ہے کہ یہ مسجد بھی تمام انبیاء کا مصلاٰ ہے اور ہم نے نجف کے قیام کے دوران میں دیکھا ہے کہ اکثر صلحاء بدھ کی شب کو وہاں جا کر ہمیشہ نماز مغرب ادا کرتے ہیں۔

مسجد خیف ۔ مروی ہے کہ اس میں ایک ہزار نبی نے نماز پڑھی ہے۔ یہ مسجد منیٰ میں ہے۔ اور روایت میں ہے کہ اس مسجد میں ایک سو رکعت نماز ادا کرنا ستر سال کی عبادت کے برابر ہے۔

مسجد الحرام ۔ یہ مسجد بیت اللہ کے ارد گرد ہے۔ مروی ہے کہ جو شخص اس میں ایک نماز ادا کرے گا اس کی عمر بھر کی تمام نمازیں مقبول ہو جاتی ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ میری مسجد میں نماز باقی مسجدوں کی ایک ہزار نماز کے برابر ہے۔ اور مسجد الحرام کی ایک نماز میری

كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور جہاد کرے اللہ کے راستہ میں یہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ

مسجد کی ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ اور مروی ہے کہ رکن اور مقام کے درمیان کی جگہ انبیاء کی قبروں سے پُر ہے۔

مسجد براثا۔ اس میں حضرت مریمؑ حضرت عیسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت علی علیہ السّلام نے نماز پڑھی۔

حضرت امیر علیہ السّلام جب واقعہ نہروان سے واپس تشریف لائے تو مسجد براثا کے مقام پر آکے رُکے اور ہر ایک راہب نے اپنے عبادت خانہ سے سر نکال کر کہا کہ اس جگہ مت اترو۔ کیونکہ یہاں نبی یا وصی نبی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں اُتر سکتا۔ آپ نے فرمایا میں آخر الزمان پیغمبر کا وصی ہوں۔ راہب جلدی سے اُترا اور مشرف باسلام ہوا۔ کہنے لگا میں نے انجیل میں تیرے اوصاف پڑھے ہیں کہ تو نے زمین براثا میں اُترنا ہے جو حضرت مریم و عیسےٰ کا گھر تھا۔ پس حضرت نے ایک مقام پر پاؤں سے ٹھوکر لگائی تو ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ حضرت نے فرمایا یہ وہ چشمہ ہے جو حضرت مریم کے لئے ظاہر ہوا تھا۔ پھر اس سے سترہ ذراع کے فاصلے سے زمین کو کھود کر ایک سفید پتھر نکالا۔ اور فرمایا کہ یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت مریمؑ نے عیسیٰؑ کو سلا کر نماز ادا کی تھی۔ پس آپ نے وہاں نماز پڑھی اور چار دن قیام فرمایا۔ اور فرمایا یہاں نبیوں نے نماز ادا کی تھی۔

مسجد بیت المقدس۔ یہ ان چاروں مسجدوں میں سے ہے جو دنیا میں جنّت کے محل ہیں۔ اور وہ چار یہ ہیں۔ مسجد الحرام۔ مسجد نبی۔ مسجد بیت المقدس اور مسجد کوفہ جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔

مسجد نبویؐ :۔ معاویہ بن وہب سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا تھا۔ ما بین بیتی و منبری روضة من ریاض الجنة۔ یعنی میرے گھر اور منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ ہاں! اس مسجد میں نماز کا ثواب مختصراً بیان ہو چکا ہے۔ اور نماز حاجت کا پڑھنا بھی اس میں مستحب ہے۔ اس مسجد کے فضائل بہت ہیں جن کا ذکر طول کا باعث ہے۔

مسجد کو جانا

حضرت امیر المومنین علیہ السّلام فرماتے تھے جو شخص مسجد کو جائے گا وہ آٹھ فائدوں میں سے کوئی ایک تو ضرور ہی حاصل کرے گا (۱) خالص اللہ کی رضامندی کے لئے کسی مومن بھائی سے ملاقات (۲) علم کی کوئی بات۔ (۳) آیت محکمہ (۴) ہدایت کا کلمہ (۵) رحمتِ پروردگار (۶) ہلاکت سے بچانے کا کلمہ (۷) ترکِ گناہ خوف سے (۸) ترکِ گناہ شرم سے (وسائل)

(۲) آپ نے فرمایا خداوند کریم زمین والوں کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے عذاب عام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب سفید ریش نماز کے لئے مسجد کا رُخ کرتے ہیں اور بچے قرآن پڑھنے کو چلتے ہیں تو وہ اپنے عذاب کو ٹال دیتا ہے (مستدرک)

(۳) حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا جس دن کوئی سایہ نہ ہوگا۔ سات قسم کے لوگوں کو خدا اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے گا (۱) امام عادل (۲) نوجوان عابد (۳) مسجد کا محب (۴) دو شخص جو اللہ کی اطاعت میں اکٹھا وقت گذاریں اور اسی حالت

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

نہیں ہدایت کرتا ظالم لوگوں کو جو لوگ ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور جہاد کریں اللہ کی راہ ہیں

پر ایک دوسرے سے جدا ہوں (۵) وہ شخص جو عالم تنہائی میں اللہ کی عظمت کو یاد کر کے گریہ کرے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں (۶) وہ شخص جس کو تنہائی میں خوبصورت عورت زنا کی دعوت دے اور وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں (۷) جو شخص خفیہ صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے دیئے کا علم نہ ہو (وسائل)

(۶) حدیث قدسی میں خدا ارشاد فرماتا ہے۔ زمین پر مساجد میرے گھر ہیں طوبیٰ ہے اس شخص کے لئے جو اپنے گھر میں طہارت کر کے میرے گھر میں میری ملاقات کو آئے۔ اور میزبان پر واجب ہے کہ وہ آنے والے مہمان کی عزت کرے۔ (وسائل)

(۷) حضرت علی علیہ السّلام نے فرمایا جنت میں بیٹھنے سے مسجد میں بیٹھنا افضل ہے۔ کیونکہ جنّت میں بیٹھنا نفس کے لئے ہے۔ اور مسجد میں بیٹھنا اللہ کے لئے ہے۔

(۸) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا جو شخص مسجد کی طرف روانہ ہو۔ زمین کے خشک و تر پر جہاں بھی قدم رکھتا ہے ساتوں زمینیں اس کے لئے تسبیح کرتی ہیں۔

(۹) جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا جو شخص مسجد کی طرف چلتا ہے اس کے ہر قدم کے بدلہ میں اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ دس گناہ محو کئے جاتے ہیں اور اس کے دس درجے بلند کئے جاتے ہیں۔ (وسائل)

(۱۰) آپ نے فرمایا مسجد میں نماز کی انتظار میں بیٹھنا عبادت ہے۔ (مستدرک)

(۱۱) آپ نے فرمایا کہ خدا فرماتا ہے۔ زمین میں میرے گھر مساجد ہیں جو اہل آسمان کے لئے ایسے چمکتے ہیں جس طرح ستارے اہل زمین کو چمکتے نظر آتے ہیں۔ طوبیٰ ہے اس عبد کے لئے جو گھر میں وضو کر کے میرے گھر میں میری زیارت کو آئے اور جس کی زیارت کی جاتی اس پر اپنے زائر کی عزّت واجب ہے۔ جو لوگ تاریکیوں میں مساجد کی طرف جاتے ہیں ان کے لئے بشارت ہو کہ قیامت کے دن ان کے چہروں سے نور ساطع ہوگا۔

(۱۲) آپ نے فرمایا بہتر انسان وہ ہے جو سب سے پہلے مسجد میں جائے اور سب کے آخر میں باہر نکلے۔ (مستدرک)

(۱۳) آپ نے فرمایا جب دیکھو کسی انسان کو کہ وہ مسجد کا عادی ہے۔ تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ الاية۔ یعنی مساجد کی آبادی وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ و قیامت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز و زکوٰۃ کے پابند ہوں۔ الخ

(۱۴) آپ نے فرمایا جب لوگ مسجد میں قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو سناتے ہیں تو اس وقت وہ اللہ کے مہمان ہوتے ہیں اور فرشتے ان پر اپنے پروں سے سایہ کرتے ہیں۔ جب تک وہ اس عبادت میں مشغول رہیں۔ الخبر (مستدرک)

مسجد سے کنارہ کشی

حضرت امیر المومنین علیہ السّلام نے فرمایا جو ہمسایہ مسجد ہو کر فراغت رکھتے ہوئے بھی نماز فریضہ مسجد میں نہ ادا کرے تو اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ⑳

اپنے مالوں اور نفسوں کے ساتھ بڑے درجہ والے ہیں اللہ کے نزدیک اور وہی ہیں کامیاب

(۲) حضرت امیر علیہ السلام کو ایک مرتبہ اطلاع پہنچی کہ ایک قوم مسجد میں نماز کے لئے حاضر نہیں ہوتی تو آپ نے خطبہ پڑھا۔ اور فرمایا جو لوگ مسجد میں نماز کے لئے حاضر نہیں ہوتے تو ان کا کھانا پینا منشورہ نکاح اور باقی لین دین ہمارے ساتھ بند ہے۔ جب تک کہ ہماری جماعت میں شریک نہ ہوں۔ اور اگر وہ باز نہ آئے تو قریب ہے کہ میں ان کے گھروں کو جلا کر خاکستر کر دوں۔ پس لوگوں نے اُن سے قطع تعلق کر لی کھانا پینا وغیرہ سب بند کر دیا تو وہ مسجد میں آنے لگ گئے۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا تین چیزیں قیامت کے روز شکوہ کریں گی۔

(۱) مسجد خراب جس میں نماز کوئی نہ پڑھے (۲) جہال کے درمیان عالم (۳) قرآن لٹکا ہوا۔ جس پہ گرد و غبار جمع ہو چکا ہو۔ اور دوسری حدیث نبوی میں عالم کی جگہ عترت کا ذکر ہے۔ قرآن کہے گا۔ اے اللہ! انہوں نے مجھے جلایا تھا اور پھاڑا تھا۔ مسجد کہے گی۔ انہوں نے مجھے معطل کیا تھا اور ضائع کیا تھا۔ اور عترت کہے گی انہوں نے ہمیں قتل کیا تھا۔ جلاوطن کیا تھا اور گھروں سے نکال دیا تھا۔ پس میں زانوؤں کے بل خصومت کے لئے بیٹھوں گا تو خدا فرمائے گا اس خصومت کے لئے میں خود سزاوار تر ہوں۔

(۴) مروی ہے کہ غیر مسجد میں باجماعت نماز سے مسجد کی فرادیٰ نماز افضل ہے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ جماعت افضل ہے بہر کیف مسجد بھی ہو اور جماعت بھی ہو تو اس کے افضل ہونے میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔

(۵) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا جو شخص پہلے مسجد میں موجود ہو اور اذان سن کر باہر نکل جائے تو وہ منافق ہے مگر یہ کہ پلٹنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

آدابِ مسجد

(۱) مسجد میں باطہارت داخل ہونا چاہیئے۔ جیسے بعض احادیث کے مضمون سے معلوم ہو چکا ہے (۲) خوشبو لگانا۔ (۳) اچھا لباس پہن کر مسجد میں جانا مستحب ہے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام ٹھنڈی راتوں میں بھی صاف ستھری پوشاک پہن کر مسجد نبوی میں جاتے تھے (۴) مسجد میں جھاڑو دینا مستحب ہے۔ حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا جو جمعرات کو مسجد میں جھاڑو دے اور آنکھ میں ڈالنے کے برابر بھی خس و خاشاک نکالے تو خدا اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا جو مسجد میں جھاڑو دے اس کو ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ نیز ایک روایت میں آپ نے فرمایا جو شخص مسجد سے اس قدر خس و خاشاک نکالے جو آنکھ کو چندھا دینے میں کافی ہوتا ہے تو خدا اس کے لئے اپنی رحمت کے دو کفل معین فرما دیتا ہے۔

(۵) مسجد میں چراغ جلانا۔ حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں چراغ روشن کرے تو فرشتے اور حاملین عرش اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے جب تک کہ اس چراغ کی روشنی مسجد میں رہے گی۔

(۶) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا مسجد میں داخل ہو تو پہلے دایاں پاؤں داخل کرے اور باہر نکلتے ہوئے پہلے بائیں پاؤں سے ابتدا کرے۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾

ان کو خوشخبری دیتا ہے ان کا رب اپنی رحمت کی اور رضامندی اور باغات کی کہ ان کے لئے وہاں دائمی نعمتیں ہیں ہمیشہ

خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٢﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا

رہیں گے وہاں تحقیق اللہ کے نزدیک بڑا بدلہ ہے اے ایمان والو نہ بناؤ

تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ

اپنے آباء اور بھائیوں کو دوست اگر وہ دوست رکھیں کفر کو بدلے ایمان کے

(۷) مسجد میں درود شریف پڑھ کر داخل ہو اور قبلہ رُخ بیٹھ کر حمد وثنا بجالائے۔

(۸) ہر مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نماز تحیۂ مسجد پڑھنا مستحب ہے۔

(۹) حضورؐ نے فرمایا مسجد قرآن کے لئے ہے۔ شعر خوانی کے لئے نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص شعر پڑھتے ہوئے مسجد میں سنو تو اس کو ٹوک دو۔

(۱۰) آپؐ نے فرمایا آخر زمانہ میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو مساجد میں حلقہ باندھ کر دنیاوی باتیں کریں گے۔ پس ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا چھوڑ دو۔ کیونکہ خدا کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔

(۱۱) مسجد کے کنگرے مینار اور نقش نگار ممنوع ہیں۔ اور حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام نے ایک حدیث طویل میں فرمایا، جب حضرت قائم آل محمدؐ تشریف لائیں گے تو کنگرے مینار گرا دیں گے۔

(۱۲) مسجد کے قبلہ میں آیات قرآنی و ذکر سبحانی کی کتابت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۱۳) مسجد میں دنیاوی کاروبار کرنا مکروہ ہے۔

(۱۴) مسجد میں منہ ناک وغیرہ کی غلاظت ڈالنا مکروہ ہے۔

(۱۵) پیاز و لہسن وغیرہ کی بدبو منہ میں لے کر مسجد میں جانا مکروہ ہے۔

(۱۶) مسجد میں خرید و فروخت کرنا۔ فیصلے کرنا۔ آواز بلند کرنا۔ لغو و باطل کی گفتگو اور گم شدہ چیز کا اعلان مکروہ ہیں۔

(۱۷) وہ بچے جن کو طہارت کا پتہ نہ ہو اور اسی طرح دیوانوں کو مسجد میں ٹھہرانا مکروہ ہے۔

(۱۸) ناف سے زانوں تک کا حصہ مسجد میں داخل ہونے والے کا مستور ہونا چاہیئے۔

(۱۹) جنبی حائض اور نفاس والی عورت کا مسجد میں ٹھہرنا ممنوع ہے۔ البتہ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے علاوہ باقی مساجد سے گذر جانا ان کے لئے جائز ہے۔

(۲۰) جنبی انسان مسجد میں کوئی چیز رکھ نہیں سکتا لیکن وہاں سے حسب ضرورت چیز اٹھا سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳) قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ

اور جو ان سے دوستی رکھے گا تو وہ ظالم ہوں گے کہہ دو اگر تمہارے آبا اور اولاد اور

اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِۨقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ

بھائی اور بیویاں اور قبیلہ اور وہ مال جو تم نے کمائے اور تجارت جس کے

(۲۱) نوافل گھر میں پڑھنا مستحب ہے۔ اور فرائض مسجد میں ادا کرنا زیادہ ثواب کا موجب ہے۔

(۲۲) عورت کے لئے اپنا گھر مسجد ہے پس اس کے لئے گھر میں نماز ادا کرنے کا وہی ثواب ہے جو مرد کے لئے مسجد میں مقرر ہے۔

اَجَعَلْتُمْ[۲۵] شانِ نزول۔ بروایت مجمع البیان ایک دن حضرت عباس بن عبدالمطلب اور شیبہ ایک دوسرے پر اپنی اپنی بڑائی بیان کر رہے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام پہنچ گئے اور فرمایا کس چیز پر فخر کر رہے ہو تو عباس نے جواب دیا مجھے وہ فضیلت دی گئی ہے جو کسی کو نہیں ملی اور وہ ہے حاجیوں کا پانی پلانا۔ پھر شیبہ نے کہا مجھے مسجد الحرام کی عمارت کی فضیلت عطا ہوئی ہے۔ یہ سن کر حضرت علی علیہ السّلام نے فرمایا مجھے شرم آتی ہے ورنہ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ باوجود چھوٹی عمر کے جو فضیلت مجھے عطا ہوئی ہے تم دونوں اس سے محروم ہو۔ پس دونوں نے پوچھا یا علی وہ کونسی فضیلت ہے جو تو نے پائی ہے۔ تو آپ نے فرمایا میں نے تمہارے منہ پر تلوار مار کر تمہیں خدا و رسول پر ایمان لانے کے اہل بنایا۔ عباس یہ سن کر طیش میں آیا اور چادر کا دامن زمین پر گھسیٹتے ہوئے خدمتِ نبویؐ میں آیا اور عرض کی آپ دیکھتے ہیں حضرت علیؑ ہمیں کیسی باتیں کہتا ہے؟ پس آپ نے علی کو بلوایا اور پوچھا کیا بات ہے؟ تو علی نے عرض کی یا رسولؐ اللہ میں نے حق بات کہی ہے۔ خواہ کوئی ناراض ہو یا راضی ہو۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام نازل ہوا کہ پروردگار بعد سلام کے فرماتا ہے۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ۔ الآیۃ۔ حضرت عباس نے جونہی خطابِ خداوندی سنا تو تین مرتبہ کہا۔ ہم راضی ہیں۔ نیز یہ بھی مروی ہے کہ جنگ بدر کے موقعہ پر جب عباس اسیر ہوئے تو لوگوں نے اُن کو قطع رحمی اور کفر کا طعنہ دیا تو عباس نے جواب دیا تم لوگ ہماری برائیاں ذکر کرتے ہو۔ اور ہماری خوبیاں ذکر نہیں کرتے۔ لوگوں نے پوچھا وہ خوبیاں تم میں کونسی تھیں تو جواب دیا مسجد الحرام کی عمارت و خدمت۔ کعبہ کی دربانی۔ حاجیوں کی سقائی اور اسیروں کا چھڑانا۔ ہم یہ سب کام کرتے تھے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی جس کا یہ مقصد ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی نیکی ہی قابلِ فخر نہیں ہو سکتی بلکہ انسان کا پہلا فخر ہے ایمان۔

بروایت عیاشی حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے۔ ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ اپنی کوئی فضیلت بیان کیجئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں اور عباس اور عثمان بن ابی شیبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ عثمان نے کہا کہ مجھے جناب رسولِ خدا نے خزانہ دیا ہے۔ یعنی بیت اللہ کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔ عباس نے کہا کہ مجھے حضورؐ نے حاجیوں کی سقائی عنایت کی ہے کہ زمزم میرے ہاتھ میں ہے۔ اور یا علیؑ تجھے تو کچھ نہیں ملا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور

تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

نقصان کا تم کو اندیشہ ہے اور رہائشی مکان جو تم کو پسند ہیں (یہ سب) تم کو پیارے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے

بعض روایات میں طلحہ بن شیبہ دارمی کا نام مذکور ہے۔

اور علامہ حلّی نے اس آیت مجیدہ کو بھی حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کی دلیل قرار دیا ہے۔ چونکہ مذکورہ روایت مسلمات فریقین میں سے ہے۔ حتیٰ کہ اس کو فضل بن روزبہان نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اہل سنّت کی کتب صحاح میں موجود ہے۔ لہٰذا تقریب دلیل اس طرح ہوگی کہ مقام مفاخرت میں حضرت علیؑ نے ان دونوں سے اپنی افضلیت کا دعویٰ کیا۔ اور وہ دونوں اپنے اپنے مقام پر تمام اُمت سے بیان کردہ مضمون میں افضلیت کا دعویٰ رکھتے تھے۔ پس خداوندکریم کا علیؑ کے حق میں فیصلہ یہ ثابت کرتا ہے کہ علی ایمان ہجرت اور جہاد میں تمام اُمت سے افضل ہیں۔ اور اس کا درجہ اعظم ہے۔ خود اندازہ کیجئے جس کو خدا اعظم کہے اس کی عظمت کا کوئی کیا اندازہ کرسکتا ہے۔ پس جب تمام اُمّت سے افضلیت ثابت ہوئی تو خلافت کا استحقاق خودبخود ثابت ہوگیا۔ اور اس کے بعد فائز ہونے کی سند اور پھر رحمت رضوان اور جنّت کی بشارت حضرت علیؑ کے بلند کردار کی مقبولیت و محبوبیّت کی دلیلیں ہیں۔ اور جو شخص واقعات کو پارٹی بازی اور جنبہ داری کی سطح سے بلند ہوکر دیکھے تو اس کے لئے حق کی راہیں بالکل روشن اور واضح ہیں لیکن جس کے دل و دماغ پر ایک طرف کی محبّت اور دوسری طرف کا عناد سوار ہو وہ بے چارہ تعصب کے شکنجے سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ وہ انصاف و عدل اسی فیصلہ میں سمجھتا ہے جو اس کی طرف داری کے رجحان سے موزونیت رکھتا ہو۔ اور جو بات اُس کی منشاء طبع کے خلاف ہو۔ اُس کی تردید یا تاویل پر کربستہ ہوجاتا ہے۔ فضل بن روزبہان اگرچہ اس فضیلت کو حضرت علی کے لئے مانتا ہے۔ لیکن چونکہ خلافت کے نظریہ میں وہ علی کا طرفدار نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے یہ بات نص خلافت نہیں ہوسکتی اسی لئے ان لوگوں کے نزدیک خلافت کا معیار ہی کوئی نہیں۔ پس جس کو لوگ کہہ دیں کہ تو خلیفہ ہے تو وہ خلیفہ ہوجاتا ہے۔ اور وہ افضل بھی ہوجاتا ہے۔ ہم چونکہ ایک معیار کے قائل ہیں کہ جو افضل ہو وہ خلیفہ ہو۔ لہٰذا یہ آیت نص خلافت ہے کیونکہ اس میں اعلانِ افضلیت ہے۔ اور وہ کہتے ہیں جو خلیفہ بن جائے وہی افضل ہے۔ چونکہ علی کو خلیفہ نہ مانا گیا۔ لہٰذا وہ افضل نہ ہوسکے۔ گویا فرق صرف اتنا ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ جس کو حق سمجھا جائے اُس کی طرف جھکا جائے۔ اور وہ کہتے ہیں جس کی طرف جھکا جائے اس کو ہی حق سمجھا جائے۔

یاایّھاالّذین۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ جب ہجرت کا حکم ہوا۔ اور لوگوں نے تیاری کی تو کسی کے سامنے زوجہ رونے لگی۔ کسی کو ماں باپ نے منع کیا۔ کسی سے بچوں کی جدائی گوارا نہ ہوسکی۔ پس اس طرح کئی لوگ ہجرت کی سعادت سے محروم ہوگئے۔ تو خداوندکریم نے یہاں ہجرت کی اہمیّت کو بیان فرمایا کہ تمام دنیاوی تعلقات سے خدا و رسولؐ کا رشتہ زیادہ محبوب ہونا چاہیئے۔ اور مومن کو چاہیئے کہ ایمان کے راستہ میں حائل ہونے والے سے قطع تعلقی کرے خواہ وہ اس کے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ اور جو شخص ان رشتہ داریوں کو اور دنیاوی فوائد کو ملحوظ رکھے گا۔ اور خدا و رسول کے حکم سے کنارہ کرے گا وہ ظالم ہوگا۔ اور یہ ایک تنبیہ ہے کہ ایمان

وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور راہِ خدا میں جہاد کرنے سے تو ٹھہرو تاکہ لائے اللہ اپنا فیصلہ اور اللہ نہیں ہدایت کرتا فاسق لوگوں کو

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ

تحقیق تمہاری مدد کی اللہ نے بہت مقامات پر اور حنین کے دن جب کہ ناز تھا تم کو اپنی کثرت

كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

کا تو اس نے نہ فائدہ دیا تم کو کچھ اور تنگ ہو گئی تم پر زمین باوجود کشادگی کے

کی محبت انسان میں اگر راسخ ہے تو وہ ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے۔ اور جو شخص یہ قربانیاں نہیں پیش کر سکتا اس کا دعویٰ ایمان جھوٹا ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہجرت کا معنی صرف وطن چھوڑنا نہیں بلکہ ایمان کے منافی ہر محبت کو خیر باد کہنے کا نام ہجرت ہے۔ تفسیر باطنی کے طور پر معصوم نے ایمان سے مراد ولایت علی بیان کی ہے۔ اور اس سے منہ پھیرنے کا نام کفر ہے۔ اور ایسوں سے محبت کرنے والے ظالم ہیں تو جو لوگ دعویٰ ایمان کرتے ہیں اور غیر مومن لوگوں سے محبت و انس بھی رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان سے رشتے ناطے بھی کرتے ہیں۔ تو وہ اپنے ایمانوں کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور ایمان کی پختگی کا علاج کریں۔ جب اس سلسلہ میں ماں باپ کو چھوڑا جا سکتا ہے تو پھر دوسری رشتہ داری اور محبت کا جوڑ کیسا؟ ہاں والدین کی دنیاوی معاملات میں اطاعت کرنا ہر حال فرض عین ہوا کرتا ہے۔

رکوع نمبر ۱۰۔ جنگِ حنین کا بیان

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ۔ چونکہ اس سے پہلے مومنوں پر ہجرت کے وجوب کی تاکید فرمائی کہ تمام محبتیں چھوڑ کر اللہ و رسول کی محبت کی طرف آجاؤ۔ اور اس آیت میں اپنی نصرت کا تذکرہ فرما رہا ہے کہ باوجود تمہاری ظاہری کمزوریوں کے خداوند کریم نے تم کو کیسی کامیابی اور کامرانی عطا فرمائی ہے۔ اور ایک دو نہیں بلکہ بہت سے مقامات پر رحمتِ خدا نے تمہاری دستگیری کی۔ پس اللہ کا رشتہ تمام رشتوں سے مفید تر اور پائدار ہے لہٰذا اس رشتہ کی خاطر تمام رشتوں سے بائیکاٹ قرین عقل اور ضروری ہے۔

مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ:۔ صادقین علیہما السلام سے مروی ہے کہ ان کی تعداد اسّی تھی۔ مروی ہے کہ ایک دفعہ متوکل عباسی سخت بیمار ہوا تو اس نے منت مانی۔ اگر خدا نے شفا دی تو مال کثیر خیرات کروں گا۔ چنانچہ وہ شفایاب ہوا تو علماء کو بلا کر مال کثیر کی حد پوچھی۔ انہوں نے اس کا جدا جدا معنی بتایا جس سے متوکل مطمئن نہ ہو سکا تو کسی نے امام علی نقی علیہ السلام سے دریافت کرنے کا مشورہ دیا۔ اور آپ اس زمانہ میں متوکل کے ہاں قید تھے۔ پس بذریعہ خط سوال کیا گیا جس کے جواب میں امام علیہ السلام نے تحریر فرمایا کہ اسّی درہم صدقہ کیا جائے۔ جب اس کی دلیل طلب کی گئی تو آپ نے یہی آیت پڑھی اور فرمایا تاریخ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ مقامات اسّی ہیں جن میں مسلمانوں کی خداوند کریم نے غائبی نصرت کی ہے۔ (یاد رکھنا چاہیے کہ کثیر کا شرعی اصطلاح

ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى

پھر تم بھاگ گئے پشت دکھاتے ہوئے پھر نازل کیا اللہ نے اپنا سکون اوپر اپنے رسول کے اور اُوپر مومنوں

الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ

کے اور اتاری فوج جو تم نے نہ دیکھی اور عذاب دیا ان کو جو کافر تھے اور یہ بدلہ ہے

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

کافروں کو پھر توبہ قبول کرتا ہے اس کے بعد جس کی چاہے (جو صاف نیت رکھتا ہو) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

ہیں معنی صرف اسی نہیں ہے۔ مثلاً کثیر الشک یا کثیر السفر کا معنی یہ نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایسے مقامات پر کثیر کا ایک معنی اسّی بھی ہو سکتا ہے۔ پس آپ نے آیت قرآنی سے ایک مثال پیش کر دی۔ اور اگر اسّی سے زیادہ مراد لئے جائیں تو وہ بدرجہ اولیٰ کثیر کا فرد بن سکتے ہیں۔ پس یُوں سمجھئے کہ یہ معنی کثیر کے معنی عمومی کا ایک فرد ہے)

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ [۳۲] اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ ہزار سے بارہ ہزار تک منقول ہے۔ اور حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔

وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ان سے مُراد وہ لوگ ہیں جو حضرت رسالت مآبؐ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ ایک ان میں حضرت علیؑ اور چند آدمی بنی ہاشم سے تھے۔

واقعہ کی تفصیل :۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد ماہ رمضان کے آخر یا شوال کی ابتداء میں حضورؐ نے معہ صحابہ کے حنین کا رُخ کیا قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف سے جہاد کرنے کے لئے۔ جب اُن لوگوں کو معلوم ہوا تو قبیلہ ہوازن کے سردار لوگ مالک بن عوف نضری کے پاس جمع ہُوئے۔ اور اس کو اپنا سردار مقرر کیا اور مسلح ہو کر اپنی پُوری جمعیت کے ساتھ روانہ ہُوئے۔ مال و متاع بچے اور عورتیں سب کو ساتھ لے لیا۔ یہاں تک کہ مقام اوطاس میں نازل ہُوئے۔ قوم جشم کا سردار درید بن صمہ بھی ان میں تھا۔ اور وہ کافی سن رسیدہ ہونے کے علاوہ نابینا بھی تھا۔ اُس نے پوچھا کہ اب ہم کہاں پہنچے ہیں تو اس کو جواب دیا گیا کہ مقام وادی اوطاس ہے اُس نے کہا خوب جگہ ہے نہ زیادہ سخت ہے اور نہ بہت نرم ہے۔ اس میں گھوڑے خوب دوڑ سکتے ہیں لیکن میں اونٹوں۔ گدھوں بیلوں۔ بکریوں اور بچوں کی آوازیں سُن رہا ہوں۔ یہ کیا معاملہ ہے ؟ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ مالک بن عوف کے حکم سے بال بچے عورتیں اور مال مویشی سب ہمراہ ہیں تاکہ لوگ اپنے مال و ناموس کی غیرت سے خوب جم کر لڑیں۔ درید نے کہا رب کعبہ کی قسم یہ شخص صرف گڈریا ہی ثابت ہُوا ہے اس کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ جب وہ آیا تو اس کو درید نے کہا تو کیسا قوم کا رئیس ہے ؟ فالتو ترم کو کہیں محفوظ مقام پر بھیج دو۔ اور صرف جنگی مردوں کو گھوڑوں کی پشت پر ڈال کر بلا خوف جنگ کرو۔ یہاں صرف مرد میدان تلوار اور گھوڑے کی ضرورت ہے۔ اگر تمہاری فتح ہوئی تو باقی قوم خود بخود مل جائے گی۔ اور اگر کوئی دوسری بات ہو تو بچوں اور ناموس

کی ذلت تو نہ ہوگی۔ مالک نے درید کا مشورہ سن کر جواب دیا کہ تو بوڑھا ہوگیا ہے اور تیرا دماغ خراب ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔

ادھر جناب رسالت مآبؐ کو قبیلہ ہوازن کا وادی اوطاس میں پہنچنا معلوم ہوگیا تو آپ نے قبائل کو جمع کر کے ان کو جہاد کی ترغیب دی اور نصرت کا وعدہ دیا کہ اللہ کا وعدہ ہے۔ ان کی عورتیں بچے اور اموال سب غنیمت ہوں گے۔ چنانچہ لوگ اپنے اپنے جھنڈے بلند کر کے نکلے۔ حضورؐ نے فوج کا علم حضرت علی علیہ السلام کے حوالہ کیا اور مکہ میں پندرہ دن کے قیام کے بعد آپ روانہ ہوئے تھے۔ صفوان بن اُمیہ سے ایک سو زرہ عاریۃً لی تھی۔ اور صفوان خود بھی ہمراہ تھا۔ فتح مکہ کے نتیجے میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی دو ہزار مجاہد ہمراہ تھے اور دس ہزار مسلمان پہلے سے حضورؐ کے ہم رکاب تھے۔ پس کل بارہ ہزار کی تعداد میں روانہ ہوئے۔ بروایت امام محمد باقر علیہ السلام تازہ ملنے والوں میں سے ایک ہزار آدمی بنی سلیم کا تھا جن کا سردار عباس بن مرداس تھا۔ اور ایک ہزار آدمی بنی مزینہ کا تھا۔ ادھر مالک بن عوف نے اپنی فوج میں اعلان کیا کہ ہر سپاہی اپنے بیوی بچوں اور مال کو اپنی پیٹھ کے پیچھے رکھے اور تلواروں کے نیام توڑ ڈالو۔ اور اس وادی میں مورچے خوب جما کر بیٹھ جاؤ۔ اور صبح کی تاریکی میں یکبارگی حملہ کر دو۔ کیونکہ محمدؐ نے ابھی جنگ جو بہادروں کا منہ نہیں دیکھا۔

جناب رسالت مآبؐ نے صبح کی نماز ادا کی اور وادی میں اُترے ہی تھے کہ ہر طرف سے قبیلہ ہوازن کی فوج نے احاطہ میں لے لیا۔ اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ پس مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ سب سے آگے بنی سلیم تھے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے تو پھر سارا لشکر تتر بتر ہوگیا۔ اس موقعہ پر چونکہ مسلمانوں کو اپنی کثرت کا ناز تھا جس کو خدا نے توڑ دیا۔ صرف حضرت علیؑ بچ گئے جو برابر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ عباس بن عبدالمطلب نے حضور کی سواری کی لگام تھامی ہوئی تھی۔ فضل بن عباس اور ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب آپ کے دائیں بائیں تھے۔ غرضیکہ نو تن بنی ہاشم تھے۔ اور دسواں ام ایمن کا لڑکا ایمن تھا جو شہید ہوگیا۔

ادھر جناب رسالت مآبؐ خود آوازیں دے رہے تھے کہ اے انصار! تم کہاں جا رہے ہو۔ میں رسولِ خدا یہ موجود ہوں۔ لیکن اب کون سنتا تھا۔ کہتے ہیں قبیلہ مازن کی ایک عورت جس کا نام نسیبہ بنت کعب تھا وہ بھاگنے والوں کے منہ پر مٹی ڈالتی اور کہتی تھی کہ خدا اور رسول کو چھوڑ کر کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ اتنے میں اس کے قریب سے حضرت عمرؓ کا گذر ہوا تو کہنے لگی تم پر وائے ہو کیا کر رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا تقدیر ایسی تھی۔ جب رسولِ خدا نے لوگوں کی پسپائی دیکھی تو اپنی سواری کو حضرت علیؑ کے قریب لے گئے اور عباس کو حکم دیا کہ اس چھوٹے سے ٹیلے پر بلند ہو کر آواز دو۔ کیوں کہ عباس کا آواز بلند تھا۔ پس انہوں نے باوازِ بلند صدا دی۔ اے اصحابِ شجرہ کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ یہ رسولِ خدا موجود ہیں۔ پھر حضور نے ابوسفیان بن حارث کو فرمایا مجھے سنگریزوں کی مٹھی اٹھا کر دو۔ پس شَاهَتِ الْوُجُوْہ کہہ کر مشرکین کی طرف پھینکی۔

انصار نے جب عباس کی آواز سنی تو واپس آنا شروع ہوگئے۔ اور علم کے ارد گرد جمع ہوتے گئے لیکن شرم کے مارے حضورؐ کے

سامنے نہیں آتے تھے۔ حضورؐ نے عباس سے پوچھا یہ کون ہیں تو جواب دیا کہ حضور یہ لوگ انصار ہی تو ہیں۔ آپ نے فرمایا آج کا دن بہت سخت ہے اور فرمایا اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔ پس خداوند کریم کی جانب سے نصرت نازل ہوئی اور قبیلہ ہوازن کو شکست ہوئی۔ مالک بن عوف بھاگ کر طائف کے قلعہ میں گھس گیا۔ ایک سو کے قریب مارے گئے۔ ان کے اموال۔ بچے اور عورتیں سب مسلمانوں کے قبضے میں آگئیں۔

بنی نضر کا ایک شخص شجرہ بن ربیعہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں قیدی ہوا تو پوچھنے لگا کہ وہ ابلق گھوڑے کہاں ہیں۔ اور سفید پوش سوار کہاں ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ لڑائی کی ہے۔ اس وقت تم لوگ تو ان میں نظر بھی نہیں آتے تھے۔ تو اس کو جواب دیا گیا کہ وہ فرشتے تھے۔ اُس دن حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں چالیس مشرک واصل جہنم ہوئے تھے۔

سعید بن مسیب کی روایت ہے کہ مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا جو حنین کے دن فوج کفار میں تھا کہ جب دونوں لشکر آپس میں ملے تو ہم نے بکری کے دوہنے کی دیر تک بھی مسلمانوں کو اپنے سامنے نہ ٹھہرنے دیا اور سب کو پسپا کر دیا۔ لیکن جب حضورؐ کی سواری کے قریب گئے تو نورانی چہروں والے جوان دیکھے۔ جنہوں نے کہا شَاہَتِ الْوُجُوْہ۔ پس انہوں نے ہمیں شکست دی اور قید کیا اور وہ فرشتے ہی تھے۔

حضور مال غنیمت لے کر مقام جعرانہ پر آئے اور یہاں بدیل بن ورقاء خزاعی کو محافظ مقرر کر کے خود معہ فوج مالک بن عوف کے تعاقب میں طائف کی طرف روانہ ہوئے۔ شوال کا باقی مہینہ طائف کا محاصرہ رہا۔ اور ذوالقعدہ کے اوائل میں واپس پلٹ کر اوطاس حنین کی غنیمتوں کو تقسیم فرمایا۔ اس جنگ میں چھ ہزار غلام و کنیزیں غنیمت میں تقسیم ہوئیں۔ اور مال کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ تقسیم صرف مہاجرین اور دیگر عرب قبائل پر تھی۔ انصار کو کچھ نہ دیا گیا۔ جس سے وہ ناراض ہو گئے۔ اور حضرت رسالتمآبؐ کے سمجھانے پر وہ رضامند ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارے لئے یہ کم ہے کہ لوگ مال لے کر گھروں کو جائیں گے۔ اور تم لوگ اللہ کا رسول اپنے ہمراہ لے جاؤ گے۔ کیا یہ تمہاری شان ہے کہ چند دنیا کے سکوں سے میں نے نئے اسلام لانے والوں کے دلوں کو مضبوط کیا ہے تو تم ناراض ہو جاؤ۔ پس سب انصار راضی ہو گئے۔

اس کے بعد قبیلہ ہوازن کے وفد مسلمان ہو کر مقام جعرانہ پر حاضر خدمت نبویؐ ہوئے۔ اور ان کے خطیب نے کھڑے ہو کر عرض کی ان قیدیوں میں حضور کی خالائیں اور دائیاں بھی موجود ہیں جنہوں نے آپ کی کفالت کی تھی۔ اگر ہم نعمان بن منذر کے ساتھ لڑتے اور ہم کو شکست ہوتی اور پھر اس سے التجا کرتے تو ہمیں توقع ہے کہ وہ بھی ہم کو واپس کر دیتا۔ اور آپ کی شان تو بہت اجل ہے۔ پھر اُس نے کچھ اشعار بھی اسی مطلب کے پڑھے۔ پس آپ نے فرمایا دو چیزوں میں سے ایک اختیار کر لو۔ قیدیوں کی واپسی یا مال کی واپسی۔ تو اُس نے جواب دیا ہمیں مال سے ناموس عزیز تر ہے۔ ہم اونٹوں بکریوں کے خواہشمند نہیں ہیں۔ تو آپ نے فرمایا جو کچھ بنی ہاشم کے حصہ میں آیا ہے وہ تو میں واپس کرتا ہوں اور باقی مسلمانوں سے بھی تمہاری سفارش کرتا ہوں۔ لہٰذا تم خود بھی اپنے اسلام کا اعلان کرو۔ اور خواہش بیان کرو۔ پس جب نماز ظہر ادا ہوئی تو انہوں نے اپنا مطلب بیان کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

اے ایمان والو تحقیق مشرک پلید ہیں پس نہ نزدیک جائیں مسجد حرام کے

بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ۚ

بعد اس سال کے اور اگر ڈرو فقر سے تو عنقریب غنی کر دے گا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے تحقیق اللہ

جو کچھ بنی ہاشم کے حصہ میں ہے میں واپس کرتا ہوں۔ اور جو کچھ تم میں سے کسی کے حصہ میں آیا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی بغیر زبردستی کے اپنی رضی سے واپس کرنا چاہے تو فبہا ورنہ اگر مفت نہ واپس کرنا چاہے تو فدیہ لے لے۔ اور فدیہ میں ہی ادا کروں گا۔ پس سوائے چند کے سب نے مفت واپس کر دیا۔ اور تھوڑے لوگوں نے فدیہ لے کر واپس کیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے مالک بن عوف کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر تو مسلمان ہو کر آجائے تو میں تیرا سب کچھ تجھے واپس کر دوں گا۔ اور انعام میں ایک سو ناقہ بھی دوں گا تو وہ شخص طائف سے واپس آکر مشرف باسلام ہوا۔ اور حضورؐ نے ایفاء عہد میں اسے اپنا سب کچھ واپس کرنے کے علاوہ ایک سو اونٹنی بھی عطا فرمائی اور اس کو اپنی جانب سے اپنی مسلمان قوم کا عامل بھی مقرر کیا۔

نجاست مشرکین

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ۔ نجس کا معنی ناپاک۔ یہ لفظ جب رجس کے ساتھ مستعمل ہو تو نون پر کسرہ آجایا کرتا ہے۔ مثلاً رجسٌ نجسٌ کہتے ہیں۔ آیت مجیدہ کے ظاہر سے کفار کا نجس العین ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور مذہب امامیہ میں بلا استثنار کافر و مشرک سب نجس ہیں۔ اگر یہ کسی چیز کو تر ہاتھ لگائیں یا کسی تر چیز کو چھوئیں تو وہ نجس ہو جائے گی۔ اور ان کو نجس قرار دیا گیا تاکہ مسلمانوں کو ان سے پوری نفرت ہو جائے اور میل جول باہمی ختم ہو جائے۔ اور ان کے اعتقادات فاسدہ کے جراثیم مسلمانوں کے اذہان پر اثر انداز نہ ہو سکیں کیونکہ باہمی دوستی اور میل ملاپ اعتقادات میں تعدی کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔ مذہب امامیہ میں ناصبی۔ خارجی اور غالی بھی کفار و مشرکین کی طرح نجس ہیں۔ لہٰذا اہل ایمان کو ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا ضروری ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً۔ جب کفار کو حرم کعبہ میں داخلہ کی مخالفت ہوئی تو مسلمانوں کو ڈر پیدا ہوا کہ ہماری تجارت میں کمی واقع ہو جائے گی تو خداوند کریم ان کی تسلی و تشفی فرما رہا ہے کہ اس کا تدارک وہ خود اپنے فضل سے فرما دے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد یمن وجدہ کے لوگ مشرف باسلام ہوئے تو انہوں نے اونٹوں۔ گھوڑوں اور خچروں پر غلہ لاد کر اہل مکہ کے گھروں میں پہنچا دیا۔ اور ان کی کسر پوری ہو گئی پھر خداوند کریم نے مسلمانوں کو فتوحات دیں جن کی غنیمتوں سے وہ مالا مال ہو گئے۔

اِنْ شَآءَ۔ مشیت کا ذکر اس لئے ہے کہ انسان اپنے رزق کی وسعت کو صرف اسباب خارجیہ کا مرہون منت قرار نہ دے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھے۔ اگر وہ چاہے تو بلا اسباب ظاہریہ رزق فراوانی سے بھیج دیتا ہے۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو اسباب ظاہریہ کی کثرت بھی مفید ثابت نہیں ہوتی۔

مشرکین و کفار کی نجاست کے بارے میں رازی کی تحقیق

اہل سنت کا امام فخرالدین رازی اپنی تفسیر کبیر ج ۴ مطبوعہ مصر ص۱۸ پر آیت مجیدہ کی تفسیر میں رقمطراز ہے کہ صاحب کشاف نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اِنَّ اَعْیَانَھُمْ نَجِسَۃٌ کَالْکِلَابِ وَالْخَنَازِیْرِ۔ یعنی وہ کتے اور سور کی طرح نجس العین ہیں۔ اور آگے چل کر کہتا ہے و اما الفقهاء فقد اتفقوا على طهارة ابدانهم ترجمہ لیکن تمام فقہاء (ابوحنیفہ، شافعی۔ احمد بن حنبل اور مالک وغیرہ) نے ان کی جسمانی طہارت پر اتفاق کیا ہے۔ اور اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔ و اعلم ان ظاهر القرآن يدل على كونهم انجاسا فلا يرجع عنه الا بدليل منفصل۔ ترجمہ۔ یہ جانو کہ ظاہر قرآن ان کے نجس ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اس ظاہر سے عدول نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ کوئی الگ دلیل موجود نہ ہو۔ نیز یہاں اجماع کا دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مسئلہ اختلافی ہے۔ اس کے بعد فقہاء کی دلیلوں کو ذکر کیا ہے جو کافر مشرک کی جسمانی طہارت پر انہوں نے قائم کی ہیں۔ پھر ان سب کا جواب مختصر لفظوں میں اس طرح دیا ہے۔ و اعلم ان كل هذه الوجوه عدول عن الظاهر بغير دليل۔ یعنی جو کچھ فقہاء نے اپنے مسلک کی تصحیح کے لئے ذکر کیا ہے وہ سب قرآن مجید کے ظاہر سے بلا دلیل منہ پھیرنے کے مترادف ہے۔ بہرکیف رازی کے نزدیک کفار و مشرک نجس العین ہیں۔ اور اس کے نزدیک فقہاء اہل سنّت کے اقوال بلا دلیل ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک عجیب پتے کی بات کہی ہے کہ ابوحنیفہ اور اس کے شاگردوں کے نزدیک محدث (خواہ حدث اصغر رکھتا ہو یا حدث اکبر) کے اعضا نجس ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر انہوں نے فتویٰ دیا ہے کہ وہ پانی جو وضو اور غسل جنابت میں استعمال ہو (بدنی ظاہری طہارت کے بعد) وہ نجس ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابویوسف کے نزدیک وہ نجاست خفیفہ ہے۔ اور حسن کے نزدیک نجاست غلیظہ ہے۔ بہرکیف اس بات پر متفق ہیں کہ محدث کے اعضاء نجس ہیں۔ اور ان کو چھونے والا پانی بھی نجس ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید ان کے اس قول کو باطل قرار دیتا ہے کیونکہ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ اور اِنَّمَا کلمہ حصر ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں صرف مشرک ہی نجس ہیں اور بس۔ پس محدث کے اعضا کی نجاست کا قول مفہوم قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کا مفہوم کہتا ہے کہ صرف مشرک نجس ہے۔ اور مومن نجس نہیں ہے لیکن ان لوگوں نے بالکل اس کا الٹ کیا ہے کہ مومن بعض حالات میں جب کہ محدث ہو نجس ہے اور مشرک کسی بھی حالت میں خواہ وہ محدث بھی ہو نجس نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر وہ اس کے قائل ہیں کہ مشرک کے اعضا سے مس شدہ پانی نجس نہیں ہے خواہ وہ کسی حالت میں ہی ہو۔ اور مومن کے اعضا سے مس شدہ پانی نجس ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک اکابر انبیاء علیہم السلام کا حدث میں استعمال شدہ پانی بھی نجس ہے۔ اور اس پر جس قدر تعجب کیا جائے کم ہے۔ اس کے بعد رازی نے قرآن و حدیث و اجماع سے ثابت کیا ہے کہ مومن کسی وقت بھی نجس نہیں ہوا کرتا۔

تعجّب بالائے تعجّب

بے شک اس منطقی نتیجہ سے فخرالدین رازی کو بہت زیادہ روحانی کوفت ہوئی ہے۔ اور ان کا تعجب آخر عمر تک ختم نہیں ہو سکا کہ آخر فقہاء نے متفقہ طور پر ظاہر قرآن کے خلاف اکٹھ کیوں کر لیا۔ لیکن ہمیں تو خود رازی کے استعجاب پر تعجب ہوتا ہے کہ جن کو امام تسلیم کرتا ہے خواہ قرآن کی مخالفت کریں یا موافقت تو پھر ان کو تنقید

کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت ہے بلکہ اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر تحقیق کا مادہ طبیعت میں ہے۔ اور حق کی تلاش میں قدم آگے بڑھانا ہے تو ذرا تعصّب کی عینک اُتار کر اپنے نظریے کا جائزہ لے لے کہ رسول نے کیا فرمایا تھا کہ قرآن کی تفسیر ایسے لوگوں سے دریافت کرو جو خُود قرآن فہمی سے قاصر ہوں یا اُنہوں نے تو بار بار ارشاد فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن دوسرے اہل بیت۔ اگر قرآن فہمی کے لئے اہل بیت اطہار کے دروازے پر جھکا ہوتا تو اس ذہنی کوفت میں مبتلا کیوں ہوتا۔ خدا اس تعصّب کا بیڑا غرق کرے کہ باوجود جاننے کے کہ یہ امام قرآن کو نہیں سمجھ سکتے۔ تاہم امام انہی کو ہی کہتا ہے اور اہل بیت کو اہل سمجھنے کے باوجود ان سے دُور ہے۔

نجاست کے لیے دو اہم سبب ہیں۔

(۱) یہ کہ اس چیز کے اثراتِ بد کی تعدی سے بچنا مطلوب ہو۔

(۲) وہ چیز بنفسہ ایسی ہو کہ طبیعت انسانی اس سے متنفر ہو یعنی وہ چیز خبائث میں سے ہو۔ پس ہر نجس چیز ان دو باتوں میں سے خالی نہ ہوگی۔

وہ چیزیں جو نجس العین ہیں۔

(۱) پیشاب (۲) پاخانہ۔ ارشادِ قرآنی ہے۔ ترجمہ۔ جب تم سے کوئی شخص حاجات ضروریہ سے فارغ ہو کر آئے۔ اور پانی میسّر نہ ہو تو تیمم کرے زمین سے۔ اس حکم قرآنی کے مفہوم سے پیشاب و پاخانہ کا نجس ہونا صاف ظاہر ہے۔ عقلی طور پر اگر دیکھا جائے تو تمام عقلائے زمانہ خواہ مسلمان ہوں یا کافر پیشاب و پاخانہ کو نجس اور واجب الاجتناب جانتے ہیں (۳) منی خواہ انسانی ہو یا غیر انسانی اس کی نجاست بھی حسب سابق معلوم ہے (۴) خمر (شراب) خواہ کسی قسم کی ہو۔ قرآن میں اس کو رجس کہا گیا ہے (۵) میتہ (مردار) خواہ آدمی کا ہو یا کسی حیوان کا نجس ہے۔ البتہ آدمی کے مردہ کو غسل پاک کر دیتا ہے۔ اور حیوان پاک اگر تکبیر کے ساتھ صحیح ذبح کیا جائے تو اس کا مردہ پاک ہوگا ورنہ مردہ نجس ہوگا۔ (۶) خون ہر قسم کا نجس ہے۔ بشرطیکہ خون جہندہ رکھنے والے جانور کا ہو البتہ ذبح شدہ جانور سے حسب معمول خون نکل جانے کے بعد جو اندر بچ جاتا ہے وہ پاک ہے۔ اسی طرح جس جانور کا خون جہندہ نہ ہو مثلاً مچھر پسّو وغیرہ تو اس کا خون بھی پاک ہے۔ اور نجس العین جانور کے خون اور عورت کے مخصوص ہر سہ خون کے علاوہ کا خون درہم بغلی سے کم نمازی کے لئے لباس یا بدن سے معاف ہے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ درہم بغلی سے کم خون پاک ہوگا بلکہ وہ ہوگا تو نجس اور دوسری تر چیز سے لگے گا تو اس کو بھی نجس کرے گا۔ لیکن نماز میں خون کی اتنی مقدار معاف کر دی گئی ہے۔ (۷) خنزیر (۸) کتا (۹) کافر (مشرک)، چنانچہ فرق اسلامیہ میں سے ناصبی، خارجی اور غالی بھی انہی کے حکم میں ہیں اور ان کی وجہ نجاست پانچویں جلد میں ملاحظہ ہو۔ ص۲۴ رص۲۵

اہل کتاب کا حکم

کافر کا وجود خدا کی پاک و پاکیزہ زمین پر ایک ناپاک دھبہ ہے جو اہل حق کی پُرامن زندگی کے لئے ہر وقت باعثِ خطرہ ہے۔ پس اس ناپاک دھبہ کو مٹانا ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے مشرکین کے متعلق

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

دانا بینا ہے لڑو ان سے جو نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور نہ روزِ آخرت پر

وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ

اور نہیں حرام کرتے وہ جو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور نہیں قبول کرتے دین حق کو ان لوگوں میں سے جو

یہی خطاب تھا اور اب اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے متعلق فرما رہا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ - کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ دین حق کو قبول نہیں کرتے ان کو قتل کرو۔ یہاں تک کہ ذلیل ہو کر جزیہ پیش کریں۔ اور جزیہ کی صورت میں اُن سے قتل کو اُٹھا لیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی جزیہ کی زندگی قابلِ رشک زندگی نہیں تا کہ ان کے خیالات کی تعدی کا خطرہ ہو۔ پس ایسی صورت میں ان کی بقا اسلامی تعلیمات میں مخل ثابت نہیں ہوتی۔ اور ان کی آیندہ نسلیں خود بخود اپنی پست زندگی سے ترقی کر کے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اوج اسلام کی طرف قدم رکھنے کا شوق پیدا کریں گی۔ اور اس طریقہ سے زمین خدا دینِ حق والوں کی پُرامن قرارگاہ بن جائے گی۔ مذہبِ امامیہ میں کفار و مشرکین کی طرح یہود و نصاریٰ و مجوس وغیرہ سب نجس العین ہیں۔

آیت مجیدہ کے مضمون سے واضح ہے کہ اہلِ کتاب کے لئے تین چیزوں میں سے ایک ہے۔ اسلام یا قتل یا جزیہ۔ پس اگر اسلام لائیں تو قتل و جزیہ ختم۔ لیکن اگر اسلام قبول نہ کریں تو پھر اگر جزیہ مان لیں تو قتل سے بچ جائیں گے ورنہ قتل کئے جائیں گے۔ اور ان کا مال غنیمت ہو گا اور عورتیں بچے قید ہو کر غلامی و کنیزی میں آجائیں گے۔

کفار و مشرکین کے لئے جزیہ نہیں ہے بلکہ یا قتل یا اسلام اور ان کا حکم یہ ہے کہ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں ان کے مردوں کو قتل کیا جائے گا۔ اور ان کا مال غنیمت ہو گا۔ اور اُن کی عورتیں۔ بچے اسیری میں آجائیں گے۔

معصوم سے سوال کیا گیا کہ عورتوں سے جزیہ کیوں ساقط ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ دار الحرب میں عورتوں اور بچوں کے قتل کی خدا نے نہی فرمائی۔ سوائے اس کے کہ وہ لڑیں بلکہ ان کے لڑنے کی صورت میں بھی حتی الوسع ان کے قتل سے گریز کیا جائے بشرطیکہ کسی اہم نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو جب دار الحرب میں رہتے ہوئے ان کا قتل جائز نہیں تو دار الاسلام میں ان کا قتل کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ اب اگر عورت جزیہ سے انکار کر دے تو اس کو قتل تو کیا نہیں جا سکتا پھر اس کی وصولی کی دوسری کیا صورت ہو سکتی ہے؟ بخلاف اس کے کہ اگر مرد جزیہ سے انکار کرے گا تو یہ اس کی عہد شکنی متصور ہو گی۔ پس اس کا قتل مباح ہو جائے گا۔ جیسا کہ دار الحرب میں بھی اس کا قتل مباح تھا۔ لہٰذا عورت سے جزیہ معاف ہے۔ اور اپاہج اندھے اور بہت بوڑھے اور بچے بھی اسی حکم میں ہیں کہ ان کا قتل ناجائز ہے مگر بصورتِ مجبوری اور ان سے جزیہ بھی معاف ہے۔ نیز پاگل اور دیوانے لوگوں سے بھی جزیہ معاف ہے۔

أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُؤْتُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَقَالَتِ

کتاب دیئے گئے حتیٰ کہ دیں جزیہ دست بدست درحالیکہ وہ ذلیل ہوں کہا

الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ

یہودیوں نے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور کہا نصرانیوں نے مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں

بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى

ہیں نقل اتارتے ہیں ۔ ان کافروں کی بات کی جو پہلے گذرے لعنت ہو ان پر اللہ کی کیسے جھوٹ ہیں

معصوم سے سوال کیا گیا کہ اہل کتاب ذمی سے جزیہ کی کوئی حد بھی مقرر ہے تو آپ نے فرمایا اس کی کوئی حد مقرر نہیں بلکہ امام وقت کو اس میں اختیار حاصل ہے جس انسان سے جو چاہے وصول کر سکتا ہے وہ جزیہ دینے والے کی حیثیت کو دیکھے گا ۔ اس لئے کہ جزیہ ان کے سر کا فدیہ ہے ۔ انہوں نے قتل و غلامی کے بدلہ میں یہ چیز اپنے اُوپر قبول کی ہے ۔ لہذا جب تک مسلمان نہ ہوں گے وہ امام کی مرضی کے مطابق جزیہ ادا کرتے رہیں گے ۔ پس امام اگر چاہے تو جزیہ ان کے سروں پر رکھ دے اور چاہے تو ان کے مالوں اور دیگر آمدنیوں پر رکھ دے ۔

ایک روایت میں ہے کفار مکہ نے خواہش کی تھی کہ ہم سے جزیہ وصول کیا جائے تو حضور نے جواب دیا تھا کہ ہم جزیہ صرف اہل کتاب سے لے سکتے ہیں ۔ تم لوگوں کے لئے صرف دو چیزیں ہیں ۔ یا اسلام یا قتل ۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ مجوسی بھی تو ہم جیسے ہیں پھر ان سے آپ جزیہ کیوں قبول کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں بلکہ وہ ایک نبی کی اُمّت تھے اور انہوں نے اس کو قتل کر کے اس کی کتاب کو جلا دیا تھا ۔ یعنی وہ صاحب کتاب ہیں ۔ جزیہ قبول کر لینے کے بعد اہل کتاب ذمی کافر کہلائیں گے ۔ اب ان کی جان و مال و عزّت سب محفوظ ہو گی ۔ اور حدود و تعزیرات میں یہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں گے ۔ اور شرائط ذمہ کی مخالفت سے وہ ذمّہ سے خارج ہوں گے پھر حربیوں کی طرح ان سے برتاؤ کیا جائے گا ۔

رکوع ۱۱

يُضَاهِئُوْنَ ۔ مضاہاۃ باب مفاعلہ سے ہے ۔ اس کا معنی ہوتا ہے مشابہت ۔ ہم نے مرادی معنی نقل اتارنا کیا ہے ۔ تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک دفعہ پانچ گروہوں کے لوگ حضرت رسالتمآب کی بارگاہ فیض میں حاضر ہوئے ۔ یہود ۔ نصاریٰ ۔ دہری ۔ ثنوی اور مشرک یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے ۔ نصرانیوں نے کہا حضرت عیسےٰ اللہ کے فرزند ہیں ۔ دہریوں نے عالم کو قدیم کہا ۔ ثنویوں نے نور و ظلمت دو خداؤں کا دعویٰ کیا ۔ اور مشرکوں نے اپنے بتوں کی عبادت کو پیش کیا ۔ اور ہر ایک نے کہا کہ اگر آپ ہمارے ساتھ اتفاق کریں تو پھر ہم آپ سے افضل ثابت ہوں گے ۔ اور اگر آپ انکار کریں گے تو ہم مناظرہ کے لئے حاضر ہیں ۔ حضور نے ان سب لوگوں کی باتوں کو سن کر اپنے ایمان کا اظہار فرمایا ۔ اس کے بعد آپ نے سب سے پہلے یہودیوں سے اپنے نظریہ کی دلیل طلب فرمائی تو انہوں نے کہا حضرت عزیر نے تورات کے چلے

يُؤْفَكُوْنَ ۞ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ

پڑھے جاتے ہیں بنایا اپنے عالموں اور عبادت گذاروں کو رب بجائے اللہ کے اور عیسٰے

جانے کے بعد اس کو دوبارہ زندہ کیا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عزیر توالد وتناسل کے طریقہ پر خدا کا بیٹا ہے یا اکرام کی وجہ سے بمنزلہ فرزند کے ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ توالد وتناسل کے لحاظ سے خدا کا بیٹا کہنا تو کفر ہے بلکہ چونکہ خدا نے عزیر کو خاص عزت وکرامت بخشی تھی لہٰذا وہ بمنزلہ بیٹے کے ہے جس طرح کوئی عالم اپنے پیارے شاگرد کو بیٹا کہہ دیا کرتا ہے حالانکہ وہ اس کا نسبی بیٹا نہیں ہوتا۔ حضورؐ نے فرمایا پھر اس لحاظ سے تو حضرت موسٰے حضرت عزیر سے بلند تر ہیں کیوں کہ ان کی عزت ومنزلت خدا کے نزدیک زیادہ تھی اور اس پر اصل تورات نازل ہوئی تھی تو جس طرح پیار واکرام کی وجہ سے چھوٹے کو بیٹے سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اکرام کی بنا پر بڑے کو بھائی یا چچا یا بابا کہا جاتا ہے۔ بنا بریں اگر عزیر اکرام کی وجہ سے خدا کا بیٹا ہے تو حضرت موسٰے کو خدا کا بھائی یا چچا یا بابا ماننا چاہیئے۔ حضور کا فرمان واستدلال سن کر یہودی خاموش ہو گئے۔ پھر آپ نصاریٰ سے مخاطب ہوئے۔ اور فرمایا کیا خدائے قدیم نے حادث ہو کر عیسٰے کو بیٹا بنایا یا عیسٰے قدیم ہو کر خدائے قدیم کا بیٹا بنا۔ حالانکہ عقلاً قدیم کا حادث یا حادث کا قدیم ہونا محال ہے۔ اور اگر ازراہ کرم خدا کا بیٹا ہے تو تمہارا جواب وہی ہے جو یہودیوں کا سن چکے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا جس طرح تم ابراہیمؑ کو خلیل اللہ کہتے ہو ہم عیسٰی کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ اگر وہ درست ہے تو یہ بھی درست ہے۔ آپ نے فرمایا خلیل مشتق ہے خلّہ سے۔ جس کا معنی ہے فقر واحتیاج۔ چنانچہ جب آتش نمرود میں ڈالے گئے اور حضرت جبریل نے آکر پوچھا کہ اگر مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ حضرت ابراہیم نے جواب دیا۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل۔ پس خدا نے اس کا لقب خلیل اللہ رکھا۔ یعنی وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف حاجت مند نہیں ہوتے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلّہ تخلل کے معنی میں ہو۔ یعنی وہ خداوند کریم کے اسرار وصفات میں دسترس رکھتے تھے۔ پس خلیل اللہ کا معنی ہے عارف باللہ، لہٰذا خلیل اللہ پر ابن اللہ کا قیاس کرنا ناجائز ہے۔ پس اگر اکرام کی وجہ سے عیسٰی کو ابن اللہ کہنا جائز ہے تو حضرت موسٰے کے لئے پھر کیا خطاب تجویز کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عیسٰے نے خود کہا تھا کہ میں اپنے باپ کی طرف جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا انہوں نے تو کہا تھا کہ میں اپنے اور تمہارے باپ کی طرف جاتا ہوں۔ لہٰذا صرف حضرت عیسٰی نہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی ابناء اللہ ہوں گے جن کے متعلق حضرت عیسٰے نے فرمایا تھا۔ پھر فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ باپ سے مراد آدمؑ یا نوحؑ ہوں جو سب کے باپ ہیں۔ اور حضرت عیسٰے کا مطلب یہ ہو کہ میں حضرت آدم یا حضرت نوح کے پاس جاتا ہوں۔ یعنی اٹھائے جانے کے بعد میں ان کی صحبت میں ہوں گا۔ پس وہ لاجواب ہو گئے۔

پھر دہریوں سے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر لیل ونہار سب قدیم ہیں یعنی ابتدا میں ان کی حد نہیں تو یہ بتاؤ زمانہ کا یہ حصہ آج کل والا تم تک کیسے پہنچ گیا جب کہ اس کی پہلے کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ نیز موجوداتِ عالم سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا واقعی موجودات کو ایک دوسرے کی احتیاج ہے۔ آپ نے فرمایا اگر ایک دوسرے کی

ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

بن مریم کو حالانکہ نہیں حکم دئے گئے مگر یہ کہ عبادت کریں معبود ایک کی کہ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے

سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۱﴾ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ

پاک ہے وہ اس سے جس کو وہ شریک کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے

طرف محتاج ہونے والے تمام عالمی موجودات قدیم ہیں تو مجھے حادث کا معنی سمجھائیے یہ سن کر ان کو جواب نہ آسکا اور خاموش ہوگئے۔

پھر ثنیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہاری دلیل کیا ہے۔ انہوں نے کہا چونکہ دنیا میں دو چیزیں ہیں۔ خیر یا شر۔ یعنی اچھی چیزیں ہیں یا بُری۔ اور دونوں کا خالق ایک تو ہو نہیں سکتا لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ خالق دو ہیں۔ ایک خالق خیر اور دوسرا خالق شر۔ خالق خیر کو نور کہتے ہیں اور خالق شر کو ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر ضدیں صرف دو ہوں تو خالق دو ہوں گے لیکن اگر ضدیں زیادہ ہوں مثلاً رنگ کی قسمیں سفید۔ سیاہ۔ سرخ۔ زرد۔ سبز وغیرہ اور ہر رنگ دوسرے کی ضد ہے۔ لہذا چاہیے کہ ہر رنگ کے لئے خدا الگ الگ ہو۔ اور نیز یہ بتاؤ کہ جب دو ضدیں جمع نہیں ہوسکتیں تو دونوں کے اجتماع سے یہ عالم کیسے خلق ہوا۔ تمہارے قاعدے سے اس کی تخلیق محال ہونی چاہیئے۔ تو وہ بھی سن کر مبہوت اور لاجواب ہوگئے۔

آخر میں مشرکین سے خطاب فرمایا۔ انہوں نے بُت پرستی کی وجہ بتائی کہ ہم قرب خدا کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ ان کو تم لوگ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو پس تم ان کے صانع ہو۔ حق تو یہ تھا کہ اگر ان میں عقل ہوتی تو وہ تمہاری عبادت کرتے نہ کہ تم کو اپنی عبادت کی دعوت دیتے۔ اور خدا اجلّ ہے کہ اپنی قربت کے لئے کسی صانع کو مصنوع کی عبادت کی دعوت دے۔ اس کے بعد کافی بحث ہوئی اور آخر میں وہ لاجواب ہوگئے۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے حضور کو برحق نبی مبعوث فرمایا۔ تین روز نہیں گذرنے پائے تھے کہ پچیس آدمی یعنی ہر گروہ سے پانچ پانچ آدمی خدمت اقدس میں پہنچ کر مشرف باسلام ہوئے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ۔ تفسیر برہان کی متعدد روایات میں ہے کہ ان لوگوں نے احبار و رہبان کی پرستش نہیں کی تھی اور نہ ان کو احبار و رہبان نے اپنی عبادت کی دعوت دی تھی بلکہ معصیت خدا میں یہ لوگ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ لہذا ان کو کہا گیا کہ انہوں نے احبار و رہبان کو اپنا رب بنایا ہے۔ یعنی اگر وہ حرام کو حلال بناتے یا حلال کو حرام بناتے تو یہ لوگ بغیر سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے چلتے تھے۔ اس لئے ان کی مذمت کی گئی ہے۔ کاش جن لوگوں نے آل محمدؐ کے علاوہ غیروں کی اقتدا کو دین سمجھا وہ ان آیات سے عبرت حاصل کرتے۔

یُرِیْدُوْنَ۔ اس کا ترجمہ شاعر نے اُردو میں خوب کیا ہے ع

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

وَيَأْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۳۲) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ

اور نہیں چاہتا اللہ مگر یہ کہ پورا کرے گا اپنے نور کو اگرچہ ناپسند کریں کافر وہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنا

رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۳۳)

رسول ساتھ ہدایت کے اور دین حق کے تاکہ غالب کرے اس کو اوپر سب دینوں کے اگرچہ ناپسند کریں مشرک

هُوَ الَّذِيْٓ ۔ بروایت ابوبصیر امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اس آیت مجیدہ کی تاویل ابھی تک نہیں کھلی۔ اور وہ اُس وقت کھلے گی جب حضرت قائم آل محمد علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ پس جب آپ کا خروج ہوگا تو اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا اور امامت کے ساتھ شریک کرنے والا کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو امام کے خروج کو پسند کرتا ہو۔ پس اس وقت اگر کوئی کافر پتھر کے اندر بھی چھپ کر پوشیدہ ہوگا تو پتھر پکار کر کہے گا۔ اے مومن! میرے اندر ایک کافر پوشیدہ ہے اس کو نکال کر قتل کر۔

لِيُظْهِرَهٗ ۔ اس غلبہ سے مراد اگر غلبۂ دلیل و برہان لیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اسلام اس لحاظ سے تمام دینوں پر غالب ہے۔ اور اگر غلبہ سے مراد اقتدار ظاہری ہو تو وہ حقیقتاً اس وقت ہی ہوگا جب کہ حضرت صاحب العصرؑ کا ظہور ہوگا جیسا کہ روایت میں ہے کہ اس وقت دینِ اسلام ہر دین پر غالب ہوگا۔ اور اس وقت کے آنے سے قبل قیامت آہی نہیں سکتی۔ پس خدا کا فرمان پورا ہو کر ہی رہے گا۔ اور مقداد سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسالت مآبؐ سے سنا کہ پشتِ زمین پر کوئی کچا یا پکا گھر ایسا نہ بچ سکے گا جس میں اسلام داخل نہ ہو۔ خواہ اس کو باعزت قبول کریں یا ذلیل و رسوا ہو کر اس کے حلقہ میں داخل ہوں۔

تفسیر صافی میں بروایت اکمال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس طرح فرعون نے موسیٰ کو ختم کرنے کے لئے بنی اسرائیل کی عورتوں کے پیٹ چاک کروا دیئے تھے۔ اسی طرح بنی عباس اور بنی اُمیہ کو جب معلوم ہوا کہ جابروں اور ظالموں کا اقتدار حضرت قائم آل محمدؐ کے ہاتھوں ختم ہوگا تو انہوں نے آلِ محمدؐ کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا اور نسلِ رسولؐ کی تباہی کے درپے ہوئے۔ لیکن خدا کا نور پھیل کر ہی رہے گا۔

بروایت عیاشی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہمارے قائم کی رعب سے تائید ہوگی۔ زمین کی اطراف سمٹ جائیں گی۔ خزانے ظاہر ہوں گے۔ مشرق سے مغرب تک ان کی حکومت ہوگی۔ خدا ان کے ذریعے اپنے دین کو تمام دینوں پر غالب کرے گا۔ زمین آباد ہوگی اور حضرت عیسےٰ اُتر کر ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

مال جمع کرجانے والوں کو تنبیہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ ۳۴ یہودی علماء و راہب لوگ عوام سے کئی ناجائز طریقوں سے پیسے بٹورتے تھے۔ حکم میں رشوت لے کر بڑے بڑوں کی خوشامد کر کے اور امیروں و رئیسوں کی مرضی کے مطابق فتویٰ دے کر وغیر ذلک۔ پس خداوند کریم ان کی برائی بیان فرما کر اہل اسلام کو تنبیہ فرما رہا ہے کہ اس طرح کما کر پیٹ بھرنا حرام ہے۔ اور یہودیوں کا صریح ذکر کر کے مسلمانوں کو کنایہ کے رنگ میں منع فرما رہا ہے۔ اور یہ طریقۂ تبلیغ نہایت احسن و ابلغ

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ

اے ایمان والو تحقیق بہت سے (یہودیوں کے) عالم و عابد کھاتے ہیں مال لوگوں کا غلط طریق

النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ

سے اور روکتے ہیں اللہ کے راستہ سے اور جو لوگ خزانہ کرتے ہیں سونا اور

وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾

چاندی اور ان کو نہیں خرچ کرتے راہ خدا میں تو ان کو خوشخبری دو دردناک عذاب کی

سمجھا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ ۔ مجمع البیان میں حضرت رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ نہ ادا کی جائے وہ خزانہ ہے خواہ زمین کے اوپر ہی ہو۔ اور جس کی زکوٰۃ ادا کی جائے وہ خزانہ نہیں خواہ زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے۔

الذَّهَبَ ۔ اس کو ذہب اس لئے کہا جاتا ہے کہ چلے جانے والی چیز ہے۔ کیونکہ ذہاب کا معنی جانا ہوتا ہے اور فضہ کو فضہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ تقسیم ہو جانے اور بٹ جانے والی چیز ہے۔ پس ان دونوں کے نام ان کے فنا ہو جانے پر دلالت کرتے ہیں پس ان دونوں سے دل لگانا اور محبت کرنا فضول ہے۔ پس اسی قدر اپنے پاس رکھے جس قدر اپنا گذارا ہو سکے۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا ۔ یہ لفظ بتلاتا ہے کہ عذاب کی پیش کش ان جمع کرنے والوں کے لئے ہے جو اپنے اموال سے حقوق مالیہ کی ادائیگی سے گریز کرتے ہیں ورنہ جو لوگ اپنے حقوق ادا کرنے والے ہوں۔ زکوٰۃ ادا کریں خمس دے دیں اور حج میں پیسہ لگالیں اسی طرح دوسرے امور خیر مثلاً خیرات صدقات صلہ رحمی۔ عزاداری وغیرہ میں بھی خرچ کریں۔ اور پھر ان کے پاس پیسہ بچ رہے اور اپنے پاس کچھ چھوڑ کر مر جائیں تو وہ اس سرزنش سے یقیناً بری ہوں گے۔ پس یہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو اپنے مال سے حقوق ادا نہیں کرتے۔ بلکہ ایسے لوگ اگر اپنا تمام پیسہ حرام کاریوں۔ بدمعاشیوں میں فنا کر کے جائیں تب بھی بروز محشر ان خزانہ کرنے والوں کے ساتھ شریک عذاب ہوں گے جو بچا کر گئے تھے۔ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کتوں۔ کنجروں اور اوباشوں پر پانی کی طرح پیسہ بہا دیتے ہیں لیکن دین خدا کی ایک پیسے بھی امداد نہیں کرتے۔ بدمعاش ان کے ہاں زردے گوشت پلاؤ وغیرہ صبح شام کھاتے ہیں اور فقیر و مسکین کو ان کے دسترخوان سے ایک خشک روٹی بھی بمشکل نصیب ہوتی ہے۔ سینماؤں، کلبوں ناچ گانوں اور سیر و تماشا کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے جاتے ہیں لیکن زکوٰۃ و خمس میں ایک دمڑی کا خرچ کرنا بار خاطر ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بروز قیامت سخت ترین عذاب کے حق دار ہوں گے۔ انہی کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔

فَتُكْوٰى بِهَا یعنی ان کے منہ پہلو اور پشتوں پر ان کی جمع شدہ رقوم کو آتش جہنم میں گرم کر کے داغ دئے جائیں گے پس جب وہ لوگ درد و عذاب سے چیخیں گے اور چلائیں گے تو ان کو جواب ملے گا گھبراتے کیوں ہو یہ تمہارا اپنا جمع کردہ مال ہے

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ

جس دن گرم کیا جائے گا ان کو دوزخ کی آگ میں پس داغ دیا جائے گا ان کے منہ اور پہلوؤں اور پشتوں کو

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ

کہ یہ وہ ہے جو تم نے خزانہ کر رکھا تھا اپنے لئے پس چکھو وہ جو تم جمع کرتے تھے تحقیق

عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

تعداد مہینوں کی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں کتاب خدا میں جس دن پیدا کیا آسمانوں

جو دنیا میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اب وہ وصول کرلو اور اس کو چکھو۔ مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو حضور نے تین مرتبہ فرمایا۔ تَبًّا لِلذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ تو اصحاب پر یہ چیز شاق گذری حضرت عمر نے پوچھا یارسول اللہ پھر ہم کون سا مال جمع کریں۔ تو آپ نے فرمایا زبان ذاکر دل شاکر اور عورت مومنہ جو دین میں تمہاری ممد و معاون ہو۔

اور بعض نے کہا ہے منہ سے مراد بدن کا اگلا حصہ اور جنب سے مراد دونو طرفین اور پیٹھ سے مراد بدن کا پچھلا حصہ ہے مراد یہ ہے کہ ان کے جسموں کے تمام اعضاء داغ دیے جائیں گے۔ اور ان کا تمام جسم مبتلائے عذاب کیا جائے گا۔ اس وقت اس پیسہ جمع کرنے یا خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنے کا وبال معلوم ہوگا لیکن وہاں اس کا کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔ پس نیک بخت ہے وہ انسان جو دنیا میں سنبھل جائے اور اپنی عاقبت کی فکر کرے۔

بارہ مہینے

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ۔ کہتے ہیں یہودی لوگ اور ان کے علاوہ کئی قومیں دو سال ۱۲ مہینے قمری شمار کرتے تھے اور تیسرے سال کے مہینے تیرہ بنا دیتے تھے تاکہ شمسی حساب سے موسم میں تبدیلی واقع نہ ہو تو خداوند کریم نے اس آیت مجیدہ میں مسلمانوں کو ہمیشہ بارہ مہینوں کے شمار کا حساب بتایا ہے۔ اور دین کا معنی حساب بھی ہوتا ہے۔ پس اس جگہ فرمایا کہ یہ حساب سیدھا ہے وہ بارہ مہینے یہ ہیں۔ (۱) محرم وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ عرب اس مہینے کی عظمت وحرمت کے قائل تھے حتیٰ کہ اس ماہ میں اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو کہیں تنہا بھی پالیتا تھا تو اس سے انتقام نہ لیتا تھا لیکن کس قدر نااہل اور ناقدر شناس تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس حرمت والے مہینے میں اپنے رسول کی عزت کو ظلم کا نشانہ بنایا اور ان کو بے گناہ قتل کر ڈالا (۲) صفر اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ یہاں حرمت والے مہینے ختم ہو جاتے تھے اور لوگوں کے لیے وقت کی حرمت کی پابندی باقی نہ رہتی تھی۔ پس گھروں سے نکل کھڑے ہوتے حتیٰ کہ مکہ مردوں سے خالی ہو جاتا تھا اور صفر کا معنی بھی یہی ہے (۳) ربیع الاول (۴) ربیع الثانی، ان دو مہینوں میں زمین کی سرسبزی و شادابی کی بنا پر نام تجویز کئے گئے۔ (۵) جمادی الاولی (۶) جمادی الثانیہ پانیوں کی خشکی اور جمود کی وجہ سے ان کے یہ نام تجویز ہوئے (۷) رجب کیوں کہ یہ مہینہ بھی حرمت والا ہے اور اس میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے تھے اور رجب کا معنی بے کار رہونے سے ملتا جلتا ہے

وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا

اور زمین کو ان میں سے چار حرمت والے ہیں یہ دین سیدھا ہے پس نہ ظلم کرو اپنے نفسوں پر اور لڑو

الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

تمام مشرکوں سے جس طرح وہ لڑتے ہیں تم سب سے اور جانو تحقیق اللہ ساتھ ڈرنے والوں کے ہے

حضرت رسالت مآبؐ سے ایک روایت منقول ہے کہ جنت میں ایک نہر ہے جس کا پانی برف سے زیادہ سفید ہے اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ جو شخص ماہ رجب میں کم از کم ایک دن بھی روزہ رکھے گا اس کے لئے اس نہر پر تصرف کی اجازت ہوگی (۸) شعبان۔ شعب کا معنی ہے شاخ اور حضورؐ نے فرمایا اس کو شعبان اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں نیکی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ یعنی ایک نیکی چند در چند نیکیوں کے برابر ہوتی ہے (۹) رمضان کہتے ہیں یہ اللہ کے ناموں میں سے ہے۔ اور یہ مہینہ بالخصوص اللہ کی طرف منسوب ہے۔ نیز اس کا معنی ہے گرمی۔ اور روزہ دار کو بوجہ روزہ کے گرمی وخشکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خواہ سردیوں کا موسم ہی کیوں نہ ہو (۱۰) شوال۔ یہ شول سے ہے جس کا معنی ہے چھوڑ دینا۔ چونکہ عرب اس ماہ میں اپنے مکانوں کو چھوڑ دیتے تھے اس لئے اس کو شوال کہا جاتا ہے (۱۱) ذوالقعدہ۔ قعدہ کا معنی ہے بیٹھ جانا اور چونکہ یہ حرمت والا مہینہ ہے اس میں بھی عرب جنگ وجدال سے رک کر بیٹھ جاتے تھے پس اس کو ذوالقعدہ کہا گیا (۱۲) ذوالحجہ۔ اس کی وجہ تسمیہ واضح ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب ان مہینوں کے نام تجویز ہوئے اس وقت یہ مناسبات موجود تھیں پس یہ نام رکھ دیے گئے۔ لہٰذا بعد میں ان مناسبات کا باقی رہنا ان کی وجہ تسمیہ کا منافی نہیں ہو سکتا

مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔ چار حرمت والے مہینے یہ ہیں۔ رجب۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ اور محرم۔

فَلَا تَظْلِمُوْا۔ ان حرمت والے مہینوں میں خصوصیت کے ساتھ ظلم نفس سے منع فرمایا۔ ورنہ ہر وقت ظلم نفس ناجائز اور حرام ہوتا ہے۔ ظلم نفس سے مراد ہے ہر وہ کام جو فرمودۂ خدا کے خلاف ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ زمان ومکان کی سعادت وشرافت افعال وکردار کی جزا وسزا میں کمی یا زیادتی کی موجب ہو جایا کرتی ہے۔ مثلاً نیک وقت میں نیک کام کی جزا زیادہ اور بدفعل کی سزا زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً جمعہ کے دن کی عبادت اور ایام کی عبادت سے زیادہ ثواب رکھتی ہے۔ ماہ رمضان کی عبادت خصوصاً لیلۃ القدر کی عبادت دوسرے مہینوں اور باقی راتوں سے بدرجہا بلند وبیش قیمت شمار ہوتی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اسی طرح نیک مکان میں نیکی کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ گھر، مسجد، جامع مسجد، مسجد کوفہ اور مسجد الحرام میں نمازوں کے ثواب میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ پس جس طرح زمان ومکان کی شرافت سے نیکی کی قیمت بڑھتی ہے۔ اسی طرح برائی کی سزا میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ عام دن کی برائی اور روز جمعہ کی برائی اور ماہ رمضان کے دن میں برائی کے عذاب میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ان ایام کے مراتب میں فرق ہے۔ نیز عام مکان، مسجد اور بیت اللہ میں برائی کی سزاؤں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ ان مکانات کے مدارج میں تفاوت ہے پس اسی بنا پر حرمت والے مہینوں میں تاکید سے حکم دیا گیا کہ ان مہینوں میں بالخصوص ظلم نفس سے یعنی پروردگار کی نافرمانیوں سے بچو۔

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ

سوائے اس کے نہیں کہ تبدیلی زیادتی کفر ہے اس کے ذریعے گمراہ کئے جاتے ہیں وہ جو کافر ہیں حلال کرتے ہیں ایک سال اور حرام کرتے ہیں

تاویل آیت ۔ تفسیر برہان میں ابوحمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ ایک دن میں امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھا تھا جب اور لوگ چلے گئے۔ فرمانے لگے۔ اے ابوحمزہ ہمارے قائم کی تشریف آوری محتوم ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور جو میری بات میں شک کرے وہ کافر اور منکر ہے۔ پھر فرمایا میرا ماں باپ قربان ہو اس پر جس کا نام و کنیت میرے جیسا ہوگا۔ اور وہ میرے بعد ساتواں ہوگا۔ میرا ماں باپ قربان ہو اس پر جو زمین کو عدل و انصاف سے پُر کرے گا۔ جس طرح وہ ظلم و جور سے پُر ہوگی اے ابوحمزہ! جو شخص اس کا زمانہ پائے اور اس کے لئے وہ چیز نہ تسلیم کرے جو حضرت محمد مصطفےٰؐ و علی مرتضیٰ کے لئے تسلیم کرتا ہے تو اس پر جنّت حرام ہوگی۔ اور اس کا ٹھکانہ آتش جہنم ہوگا۔ اور اس مطلب پر واضح ترین اور روشن ترین خدا کا یہ فرمان ہے۔ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ الخ۔ فرمایا مہینوں کا پہچاننا کہ محرم۔ صفر الخ یہ دین قیم نہیں۔ کیوں کہ یہودی۔ نصرانی۔ مجوسی اور باقی مذاہب بلکہ تمام لوگ خواہ مخالف ہوں خواہ موافق ان سب مہینوں کو تو سب جانتے ہیں بلکہ اس جگہ مراد ہیں وہ امام جو اللہ کے دین کے محافظ ہیں اور حرم ان میں سے علیؑ اور ان کے تین فرزند ہیں جو اسی نام سے موسوم ہیں۔ علی زین العابدین۔ علی رضا۔ اور علی نقی۔ کیونکہ یہ نام خداوند کریم نے اپنے نام سے مشتق فرمایا۔ جس طرح نام محمد اپنے نام محمود سے مشتق کیا ہے۔

داؤد بن کثیر سے ایک روایت ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا۔ آپ نے سماعہ سے فرمایا مجھے کھجور کا دانہ اٹھا دو۔ پس آپ نے وہ کھا کر اس کی گھٹلی کو زمین میں دفن کیا۔ فوراً خرما کا درخت تیار ہوا۔ اس میں پھل لگ گیا۔ اور خوشے تیار ہو گئے۔ آپ نے ایک دانہ توڑا اور اُس کو چیرا۔ اس سے ایک کاغذ نکلا۔ اس کو کھول کر فرمایا۔ پڑھو میں نے پڑھا تو ایک سطر پر کلمۂ توحید اور دوسری سطر پر یہی آیت انّ عدة الشھور الخ۔ لکھی ہوئی تھی۔ اور پھر حضرت علی سے لے کر حضرت مہدی علیہ السّلام تک تمام ائمہ کے نام مندرج تھے۔ آپ نے مجھے فرمایا اے داؤد تم جانتے ہو کہ یہ کب سے لکھا ہوا ہے میں نے عرض کی خدا اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے مجھے فرمایا حضرت آدم کی خلقت سے دو ہزار سال قبل کی تحریر ہے۔

بروایت جابر جعفی امام محمد باقر علیہ السّلام سے مثل سابقہ روایت کے ایک حدیث مروی ہے جس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ سال کی تاویل ہمارا نانا حضرت محمد مصطفےٰؐ ہے۔ اور بارہ مہینوں کی تاویل بارہ امام ہیں جو مخلوق خدا پہ حجّت خدا اور اس کی وحی و علم کے امین ہیں۔ چار حرمت والے ہیں۔ جن کا نام علی ہے۔ ان کا اقرار کرنا دین قیم ہے۔ پس ان کے بارے میں خدا نے ظلم و تعدی سے منع فرمایا ہے اور ان تمام کا اقرار راہ ہدایت ہے۔

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ۔ نساءٌ سے ہے (مہموز اللّام) اور امام جعفر صادق علیہ السّلام کی قرأت اَلنَّسِیُّ منقول ہے۔ گویا ہمزہ کو یاء سے تبدیل کیا گیا ہے۔ عام مشہور قرأت اَلنَّسِیٓءُ ہے۔ بر وزن فعیل۔ اور یہ کہ النذیر اور النکیر کی طرح یہ بھی مصدر ہے کہ صیغہ اسم مفعول اور اس کا معنی ہے موخر کرنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اسم کا صیغہ قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ موخر کیا ہوا مہینہ گناہ و کفر

عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ

دوسرے سال تاکہ پوری کریں تعداد اس کی جو حرام کیا اللہ نے پس حلال کرتے ہیں جس کو اللہ نے حرام کیا زینت پائی ان کے لئے ان کے

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۷﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ

بداعمالوں نے اور اللہ نہیں ہدایت کرتا کافر لوگوں کو اے ایمان والو تم کو کیا ہے کہ جب کہا جائے

لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

تمہیں نکل پڑو اللہ کی راہ میں تو لگ جاتے ہو زمین سے کیا تم راضی ہو دنیا کی زندگی پر

ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ موخر کرنا گناہ و کفر ہے۔ پس اس کا مصدر ہونا درست ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ عرب لوگ حرمت والے تین مہینوں کے پے در پے آنے سے تنگ آجاتے تھے۔ پس وہ بعض اوقات اس میں تبادلہ کر لیتے تھے۔ پس محرم کی جگہ صفر کو حرمت والا بنا لیتے تھے۔ اور محرم میں جنگ چھیڑ لیا کرتے تھے۔ پھر حسب ضرورت محرم کو ہی حرمت والا قرار دے لیتے تھے۔ کہتے ہیں اس فیصلہ کا ٹھیکیدار بنی کنانہ کا ایک شخص تھا۔ جس کا نام نعیم بن ثعلبہ تھا۔ پس وہ حکم سنا دیتا تھا کہ اس سال مثلاً محرم کی بجائے صفر حرمت والا ہوگا۔ اور اس کے بعد جنادہ بن عوف اس کا فیصلہ سناتا تھا۔ اور اس کو نسی کہتے تھے۔ اور کہتے ہیں نسی کی ابتداء عمر بن لحی نے کی تھی۔ نیز اس طرح بھی کر لیا کرتے تھے کہ ایک سال محرم کو صفر بنا لیا کہ صفر اول اور صفر ثانی نام رکھ دیا۔ پھر دوسرے سال دونوں مہینوں کو محرم بنا لیتے تھے۔ یعنی محرم اول اور محرم ثانی۔ یعنی حسب ضرورت حرمت والے مہینوں کی ایر پھیر کیا کرتے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حج کو ہر مہینے چکر دیتے تھے۔ اور ہر ماہ کا نمبر دو سال رہتا تھا۔ مثلاً دو سال ذوالحجہ میں پھر دو سال محرم میں وعلی ہذا القیاس۔ اور فتح مکہ کے بعد جب سورہ برائت لائی گئی تو اس سال حج ذوالقعدہ میں تھی۔ اور دوسرے سال حجۃ الوداع ذوالحجہ میں ہوئی۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے اسی ماہ میں رہ گئی اور نسی کا قصہ ختم کر دیا گیا۔

رکوع ۱۲

اِثَّاقَلْتُمْ۔ یعنی عمداً بھارے ہو کر زمین سے چمٹ جاتے ہو۔ ثقل سے باب تفاعل تثاقل ہوتا ہے اس لحاظ سے تَثَاقَلْتُمْ ہونا چاہیئے تھا لیکن علم صرف کا قانون ہے کہ جب باب تفاعل میں فاء کے مقابلہ میں ثاء آجائے تو تاء کو ثاء سے تبدیل کر لیتے ہیں۔ اور دونوں حرفوں کو ایک دوسرے میں ادغام کر کے شروع میں ہمزہ وصلی کو بڑھا دیتے ہیں۔ پس تفاعل سے یہ باب اِفّاعل بن جاتا ہے۔ یہاں تثاقل میں تاء کو ثاء سے بدلا اور ادغام کر کے شروع میں ہمزہ بڑھایا تو اثاقل بن گیا۔ اور اثاقلتم اسی باب سے جمع مخاطب فعل ماضی ہے۔ تحت اللفظی معنی واضح ہے۔

آیت مجیدہ کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضورؐ طائف سے واپس آئے تو رومیوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ اور یہ زمانہ میوہ جات کے پکنے کا تھا۔ تو لوگوں کو گھروں سے نکلنا دشوار معلوم ہوا۔ حضورؐ نے جب ان کو جہاد کی دعوت دی

مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

آخرت کے بدلہ میں پس نہیں فائدہ زندگیٔ دنیا کا بمقابلہ آخرت مگر معمولی

تو بعض لوگوں نے عذرداری کی۔ اور چونکہ یہ جنگ سخت تھا۔ سفر لمبا تھا۔ اور دشمنوں کی جمعیت زیادہ تھی۔ اس لئے زیادہ تعداد میں مجاہدین کو سربکف ہوکر جانے کی ضرورت تھی۔ لیکن بہت سے لوگ دُور دراز کے سفر سے گھبرا گئے۔ اور ادھر میوہ جات کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ پس خداوندکریم نے ان کی سرزنش کے لئے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ اور یہ غزوہ تبوک کہلاتا ہے۔ جس کے لئے مومنوں کو تہدیدی طور پر تیاری کی دعوت دی گئی ہے؟

قوموں کی ترقی کا راز

تاریخ ماضی کے مطالعہ سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی قوم اُس وقت تک برسرِ اقتدار رہ سکتی ہے جب تک وہ جفاکش اور محنت شعار رہے۔ اور اقوامِ عالم میں کسی قوم کی سربلندی کا معیار اس کی بیداری ہی ہوا کرتی ہے۔ بخلاف اس کے جو قوم آرام طلب، عیش پرست اور سکون پسند ہوجائے وہ باوجود زندگی کے مردہ کہلاتی ہے۔ اور باوجود بیداری کے خفتہ سمجھی جاتی ہے۔ پس ایسی قوم ترقی کرنا تو بجائے خود اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ اور تنزلی و پستی کے عمیق ترین گڑھے میں دھکیل دی جایا کرتی ہے۔ آیۃ مجیدہ میں خداوندکریم مسلمانوں کو اسی نکتہ کی طرف متوجہ فرمارہا ہے کہ آرام طلبی و عیش پرستی چھوڑ دو۔ اور میدانِ جہاد میں قدم آگے بڑھاؤ۔ ورنہ اگر تم سست ہوگئے اور میدانِ عمل میں آگے بڑھنے سے گریز کرنے لگ گئے تو اس جمود کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم لوگ ذلت و خواری بلکہ عذابِ شدید میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ اور دنیا کی بیدار و متحرک قومیں تمہاری جگہ سنبھال لیں گی۔ چنانچہ فرمایا اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ یعنی اگر تم جہاد کرنے کے لئے گھروں کو نہ چھوڑو گے تو تمہیں وہ سخت عذاب دے گا۔ اور تمہارے بدلہ میں دوسری قوم کو لے آئے گا جو برسرِاقتدار ہوگی۔ الخ۔

کہتے ہیں ارسطو نے جو سکندر کو خط لکھا تھا اس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ممالک فارسیہ کے لوگوں کو آرام سے نہ بیٹھنے دو۔ ورنہ زوالِ حکومت کا خطرہ رکھو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ محنت و سختی کو زیادہ دیر تک برداشت کرسکتے ہیں۔ اور سکون و آرام کو زیادہ دیر تک نہیں برداشت کرسکتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لڑائی کے زمانہ میں جو حس و حرکت شعور و بیداری اور جو چہل پہل لوگوں میں ہوا کرتی ہے وہ آرام و سکون کی گھڑیوں میں ناپید ہوجایا کرتی ہے۔ اس کے بعد اس نے امم ماضیہ اور اقوام سابقہ کی مثالیں دے کر اپنے مقصد کی وضاحت کی کہ اقوام کی ترقی و اقتدار کا راز حس و حرکت میں ہی مضمر ہے۔ اور سکون و جمود زوالِ اقتدار کا پیش خیمہ ہے۔

بالیوں سمجھ لیجئے کہ پورا عالم مقام صعود و ارتقاء میں ہے پس جو قوم صعودی و ارتقائی کوششوں میں معروف رہے۔ وہ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو آرام کرنے کے لئے ایک جگہ جم کر بیٹھ جائے یا تھک کر پیچھے سرکنے لگ جائے تو دوسری ہوشیار و تازہ قوم ان کی جگہ لے لیا کرتی ہے۔ اور اسی طرح انسان درجہ بدرجہ ارتقائی منازل کو طے کرتا ہے۔ اور یہی خدائے علام کی

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ؕ

اگر تم نہ نکلو گے تو تم کو عذاب دے گا دردناک اور تمہارے بدلہ میں لائیگا دوسری قوم اور تم نہ ضرر دوگے اس کو کچھ

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ

اور اللہ ہر شے پر قدرت والا ہے اگر تم اس کی مدد نہ کروگے (تو کیا ہوا) اللہ نے تو اس کی اس وقت مدد کی جب

حکمت و تدبیر ہے۔ جو بقائے عالم اور اس کے تدریجی ارتقا کی کفیل ہے۔ اور اسلامیانِ پاکستان پر تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ ان کے سترہ روزہ بھارت کے دفاع نے جس قدر ان کو تعلیماتِ اسلامیہ کے قریب کیا ہے اتنے قرب کا تصور بھی قبل کے آزادی کے سترہ سال میں ان کے دماغ میں نہ آسکا۔

ہجرت کا بیان

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ ۔ سرزنش اور تہدید کے طور پر فرمارہا ہے کہ اگر تم جہاد میں میرے رسول کی نصرت نہ کروگے تو خدا تمہارا محتاج نہیں وہ مختلف طریقوں سے اپنے نبی کی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ اور مقامات کے علاوہ خدا نے اپنے حبیب کی اُس وقت مدد کی جب کہ تمام لوگ اس کو چھوڑ چکے تھے۔ اور کفار قریش قتل کے درپے تھے۔ اور وہ صرف دو ہی دو تھے کہ ان میں دوسرا رسول تھا۔ اور اس جگہ نصرتِ خداوندی کی صورت یہ تھی کہ جب رسالت مآبؐ اپنے ساتھی یعنی ابوبکر کے ہمراہ غار میں داخل ہوئے اور کفار نے ان کا تعاقب کیا تو خدا نے غار کے دروازہ پر فوراً ایک درخت لگا دیا۔ اور عنکبوت کو حکم دیا کہ اس نے جالا تن دیا اور کبوتر کے ایک جوڑے نے وہاں اپنا گھونسلا بنالیا (تفسیر مظہری) پس اس مقام پر نصرتِ خداوندی کے کئی وجوہ ہیں۔

۱۔ درخت کا اُگانا عنکبوت کو جالا تننے کا حکم دینا اور کبوتروں کے جوڑے کا بھیجنا تاکہ کفار کا تصور اس جانب سے ہٹ جائے۔ ۲۔ اپنی جانب سے سکینہ کا نازل فرمانا۔ ۳۔ کفار پر رعب طاری کرنا۔ ۴۔ ملائکہ کو بھیجنا۔

پس آیت مجیدہ میں مومنین کو نصرتِ پیغمبر میں سستی کرنے سے سرزنش کی گئی ہے کہ اگر تم مدد نہ کروگے تو کیا ہوا خدا کسی اور مخصوص ذریعہ سے اُس کی مدد کرے گا جیسا کہ شبِ ہجرت اس نے مدد کی۔

تفسیر مجمع البیان میں زہری سے مروی ہے کہ جب حضرت رسالت مآبؐ غار میں داخل ہوئے تو باذن پروردگار غار کے دروازہ پر کبوتروں نے انڈے دے دیئے۔ اور عنکبوت نے جالا تن دیا۔ جب سراقہ بن مالک تعاقب میں پہنچا تو کبوتروں کے انڈے اور عنکبوت کا جال دیکھ کر کہنے لگا اگر اس غار میں کوئی داخل ہوا ہوتا تو انڈے ٹوٹ جاتے اور جالا ختم ہو جاتا پس مایوس ہو کر واپس پلٹ گئے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ابوکرز خزاعی نے نشانِ قدم پہچان لیا۔ اور کہا غار کے دروازہ پر جو قدم کا نشان ہے یہ بعینہٖ اُسی قدم کا نشان ہے جو محمدؐ کے گھر سے نکلتے وقت تھا۔ اور ساتھ دوسرا نشانِ قدم ابو قحافہ کا ہے یا اس کے بیٹے کا ہے

الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ

اس کو کافروں نے نکال دیا تھا درحالیکہ وہ صرف دو میں سے دوسرے تھے جب کہ وہ غار میں تھے جب کہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے

إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ

غم نہ کرو تحقیق اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اس پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی کہ تم نے نہ دیکھے اور ان کے

بہرکیف وہ دونو اس مقام پر ضرور پہنچے ہیں۔ اس سے آگے یا تو وہ آسمان کی طرف پرواز کر گئے ہیں یا زمین میں روپوش ہو گئے ہیں نیز خداوند کریم نے ایک حفاظتی انتظام یہ بھی فرمادیا تھا کہ ایک فرشتہ کو غار کے دروازہ پر بصورت انسان بھیج دیا۔ جب کفار وہاں پہنچے تو اس نے ان سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ اور اِدھر اُدھر پہاڑی گھاٹیوں میں ڈھونڈو کیوں کہ وہ یہاں نہیں ہے

تفسیر برہان میں بروایت جابر منقول ہے کہ حضرت رسالت مآبؐ اپنی ناقہ عضباء پر سوار ہو کر روانہ ہوئے تو جبریل نے حاضر ہو کر عرض کی کہ میں بحکم پروردگار آپ کے ہمراہ ہوں گا۔ پس راستہ میں حضرت ابوبکر ملے۔ اور ساتھ جانے کی درخواست کی لیکن حضورؐ نے انکار کر دیا۔ پس اس نے کہا کہ اب اگر مجھ سے کفار حلفیہ آپ کے متعلق پوچھیں گے تو مجھے سچ بتانا ہو گا لہذا آپ کا راز فاش ہو جائے گا۔ لہذا مجھے اپنے ساتھ لے جائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تو ایسا ہی کرے گا تو اس نے کہا ہاں بخدا اگر وہ مجھ سے حلفیہ دریافت کریں گے تو قتل کے خوف سے اُن کو سچ ہی بتانا ہو گا۔ پس آپ نے اس کو ہمراہ لے لیا

اسی طرح بروایت ابن طاؤس ابن صباغ کی کتاب نور و برہان سے منقول ہے کہ حضورؐ نے علیؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور حضرت ابوبکر کو ہمراہ لے گئے کہ مبادا کفار کو اطلاع دے دیں۔

تفسیر برہان میں مروی ہے کہ واقعہ ہجرت جناب خدیجہ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد ہوا۔ کیونکہ ان دونوں کی وفات کے بعد مکہ میں آپ کی زندگی خطرہ میں تھی۔ اور آپ ہر وقت رنجیدہ خاطر رہتے تھے۔ پس وحی خداوندی ہوئی۔ أَخْرُجْ مِنَ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا۔ یعنی اس ظالم لوگوں کی بستی سے نکل جائیے کیونکہ اب یہاں کوئی ناصر نہیں رہا۔ تفسیر منار میں محمدؐ بن عبدہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوطالب جناب رسالت مآبؐ کی حفاظت کرتے تھے اور حضرت خدیجہ چونکہ قریش میں بلند مقام و عظمت کی مالکہ تھیں اور لوگوں کو ان کا بہت حیا تھا پس ان کا وجود بھی ایذاء رسول میں کمی کا باعث تھا پس جب یہ دونو بزرگوار ایک ہی ہفتہ میں رحلت فرما گئے تو قریش نے حضورؐ کو زیادہ ایذیتیں دینا شروع کر دیں پس انہوں نے مل جل کر قتل کرنے کا پروگرام بنایا۔ تاکہ کوئی ایک قبیلہ آپ کے خون میں ملوث نہ ہو۔ اور تمام قبیلے جب شریک ہوں گے تو خون بہا تقسیم کیا جائے گا۔ اور ہر قبیلہ اپنے حصہ کے مطابق ادا کرے گا۔ اور اس صورت میں بنی ہاشم کو مجبوراً خون بہا پر رضامند ہونا پڑے گا کیونکہ تمام قبائل سے لڑنا ان کے لئے ناممکن ہو گا۔ پس اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا اور ہجرت کے بعد شہر کا نام مدینہ منورہ ہو گیا۔ حالانکہ پہلے اس کو یثرب کہا جاتا تھا اور اس جگہ کے بعض لوگ پہلے موسم حج میں آپ پر ایمان

كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

قول کو پست کر دیا جو کافر تھے اور اللہ کا قول ہی بلند ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے

لا پچکے تھے جن کو ایمان میں تقدم کا شرف حاصل ہے۔

اسی تفسیر میں ہے کہ حضور نے لوگوں کو حکم خداوندی سنا دیا تھا کہ مجھے ایسے شہر میں ہجرت کر کے جانے کا حکم ہوا ہے جہاں کھجوریں زیادہ ہیں۔ اور اس کے دونو طرف سیاہ سنگریزے زار زمین ہے۔ پس لوگوں نے خفیہ خفیہ مدینہ کی طرف جانا شروع کر دیا تھا۔

محمد عبدہ کی تحقیق کے مطابق آپ جمعرات کو مکہ سے نکلے اور تین روز غار ثور میں قیام کر کے سوموار کے دن وہاں سے روانہ ہوئے۔ اور بعد از طے منازل دو ربیع الاول بروز سوموار مدینہ منورہ میں پہنچے۔ جب مدینہ والوں کو حضور کی مکہ سے روانگی کا علم ہوا تو انہوں نے انتظار کی گھڑیاں مشکل سے گذاریں۔ چنانچہ صبح کو شہر سے باہر آکر انتظار میں کھڑے ہو جاتے۔ اور ظہر تک انتظار کرنے کے بعد واپس گھروں کو چلے جاتے۔ پس حضور کے قدوم میمنت لزوم کے روز انتظار کر کے واپس جا ہی چکے تھے کہ ایک یہودی نے جو اپنے قلعہ پر بیٹھا تھا دیکھ لیا۔ اور مسلمانوں کو آپ کی آمد کی بشارت سنائی۔ پس تمام لوگ استقبال کے لئے دوڑے پس آپ نے پہلے پہل بنی عمرو بن عوف میں نزول اجلال فرمایا اور کچھ دن وہاں رہے۔ اور وہاں ایک مسجد بنائی۔ اور اس میں نماز بھی ادا کی۔

وہاں سے روانہ ہو کر چلے اور آپ کی سواری اس جگہ آکر بیٹھی۔ جہاں اب مسجد نبوی موجود ہے۔ یہ زمین سہل اور سہیل نامی دو لڑکوں کی تھی۔ اور انہوں نے نذرانہ کے طور پر پیش کی جو آپ نے قبول فرمائی۔ اور اس پر مسجد کی تعمیر ہوئی۔

غار ثور کا محل وقوع شیخ محمد عبدہ جو اپنے دور میں مصر کے مفتی اعظم اور جامعہ ازہر کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے اپنی تفسیر منار کے دسویں جلد میں ابراہیم رفعت پاشا کی زبانی نقل کیا ہے۔ جنہوں نے ۱۸ ذوالحجہ ۱۳۱۸ھ میں غار ثور کو دیکھا تھا۔

وہ کہتا ہے مکہ سے جبل ثور کا راستہ دو پہاڑیوں کے درمیان جاتا ہے۔ پہلے چڑھائی آتی ہے اور پھر اترائی کے بعد جبل ثور تک انسان پہنچتا ہے۔ اور یہ راستہ چند منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ راستہ پر سات پتھر نصب ہیں جو جانے والے کے بائیں طرف آتے ہیں۔ ہر دو کا درمیانی فاصلہ دو سو متر سے لے کر ہزار متر تک ہے (ایک متر تقریباً نصف فٹ کا ہوتا ہے) یہ پتھر راستہ کے ہر موڑ کے اوپر بلند مقام پر نصب ہیں جن کو چونے سے سفید کر دیا گیا ہے ہر پتھر کی بلندی تین متر ہے۔

پس پہاڑ تک پہنچ کر ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اور ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جا پہنچے کیونکہ چڑھائی اس قدر مشکل تھی کہ ہر پانچ فٹ کے بعد دو منٹ وقفہ کرنا پڑھتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات پانچ منٹ کا وقفہ آرام کیا جاتا تھا۔ رستہ نہایت خطرناک اور پُرپیچ تھا۔ یہاں تک کہ نصف پہاڑ تک میں نے ۴۵ موڑ شمار کئے اور یہ بھی تھا کہ کبھی چڑھائی آجاتی تو بعض دفعہ اترائی آجاتی۔

حتیٰ کہ بمشکل ہم غار تک پہنچ سکے یہ باوجود ان سہولتوں کے تھا جو عثمان پاشا اور اسماعیل پاشا نے راستہ کے طے کرنے کے لئے بہم پہنچائی تھیں۔ جو علے الترتیب ۱۲۹۹ھ اور ۱۳۰۱ھ میں حجاز کے حکمران ہوئے تھے۔ ورنہ یہ راستہ اس سے بھی نہایت مشکل ہوتا اور چلنے والا راستہ ہی میں بھٹک جاتا اور غار تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔ اور ان کی اصلاحات میں سے ہے کہ انہوں نے راستہ کی چڑھائی اور اترائی کو سیڑھی نما بنا دیا ہے اور بایں ہمہ چڑھائی بہت سخت ہے۔ چنانچہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا اور طاقت بدن ختم ہو گئی۔ حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اگر ہم اس کے منہ اور سینہ پر پانی نہ چھڑکتے اور اس کے منہ میں چلو بھر پانی نہ ڈالتے تو وہ یقیناً مرجاتا اور ہم ہر جانے والے کو نصیحت کرتے ہیں کہ غار ثور کی طرف جاتے ہوئے اپنے ساتھ پانی کا انتظام ضرور کریں

ہم نے دیکھا کہ وہ غار پہاڑی کی چوٹی پر ایک بڑے پتھر کا خول ہے جو بالکل کشتی نما ہے۔ اور اس میں جانے کے "دو" راستے ہیں۔ ایک شرقی۔ دوسرا غربی۔ چنانچہ میں ہاتھ آگے کی طرف پھیلا کر پیٹ کے بل رینگتا ہوا غار میں غربی راستہ سے داخل ہوا۔ اور مشرقی سے باہر نکل آیا۔ اور یہ پہلے کی نسبت ذرا زیادہ کھلا تھا۔ غربی سوراخ تین بالشت تقریباً چوڑا اور دو بالشت اونچا ہو گا۔ اور یہی وہ اصلی راستہ تھا جس سے حضورؐ داخل ہوئے تھے۔ اور شرقی راستہ بعد میں بنایا گیا تاکہ لوگ آسانی سے اندر آجاسکیں۔ اسی تفسیر میں مذکور ہے کہ حضورؐ اپنے بستر پر حضرت علی کو سلا کر گئے تھے۔ اور کفار یہی سمجھتے رہے کہ حضورؐ خود محو خواب ہیں

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ مکہ سے غارِ ثور تک پہنچنے کے لئے ایک گھنٹہ کا راستہ ہے۔ یعنی تقریباً تین میل کا فاصلہ ہے اور اسی تفسیر میں بیہقی اور ابن عساکر سے نقل کیا ہے کہ اثناء راہ میں حضرت ابوبکر کسی وقت آگے چلتے تھے اور کسی وقت پیچھے۔ نیز کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں جانب۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے وجہ دریافت کی۔ تو عرض کی کہ آپ کی حفاظت کے خیال سے ایسا کرتا ہوں تاکہ کسی جانب سے دشمن آپ پر اچانک حملہ نہ کر دے۔ حضورؐ پاؤں کے کنارے پر چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان پر آبلے پڑ گئے۔ جب حضرت ابوبکر نے دیکھا تو حضورؐ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور تیز دوڑنے لگا۔ یہاں تک کہ درِ غار پر پہنچ کر آپ کو اتار دیا اور عرض کی حضور! آپ اس میں داخل نہ ہوں بلکہ پہلے میں اندر جاتا ہوں۔ مبادا کوئی موذی جانور موجود ہو۔ اور آپ کو گزند پہنچ جائے۔ چنانچہ وہ اندر داخل ہوئے اور پھر باہر نکلے۔ اور حضورؐ کو اٹھا کر غار کے اندر داخل کیا۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ غار میں چند ایسے شگاف موجود ہیں جن میں چھوٹے بڑے سانپ رہتے ہیں تو اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر ان کو بند کیا۔ پھر بھی ایک سوراخ بچ گیا جس کو اپنی ایڑھی سے بند کیا۔ اور ایک روایت میں صرف ایک سوراخ مذکور ہے جس کو انہوں نے اپنے قدم سے بند کر دیا۔ اور سانپ جب کاٹتے تھے تو درد سے آنسو جاری ہوتے تھے۔ لیکن قدم سوراخ سے نہ ہٹاتے تھے۔ تفسیر خازن میں ہے کہ اپنی شلوار کو پھاڑ پھاڑ کر سوراخوں کو بند کیا اور صرف دو سوراخ بچ گئے جن کو اپنے دونوں پاؤں سے بند کیا۔ پس جناب رسالت مآبؐ اندر آ کر اس کے زانو پر سر رکھ کے سو گئے۔ جب سانپ نے ڈسنا شروع کیا تو وہ پاؤں کو حرکت تک نہ دیتے تھے تاکہ حضورؐ بیدار نہ ہو جائیں۔ پس رونا شروع کر دیا۔ جب رسالت مآبؐ کے چہرہ پر آنسو ٹپکے تو آپ نے رونے کی وجہ پوچھی۔ تو اس نے بتایا کہ سانپ نے کاٹا ہے۔ پس آپ نے لعابِ دہن ملا اور اس کا درد جاتا رہا پس خاموش ہو گئے۔ اس بیان کا تجزیہ صد ۹۲ پر دیکھیں۔

نکاتِ علمیہ (۱) اِنْ لَّا تَنْصُرُوْہُ ۔ شرط ہے جس کا جواب محذوف ہے ۔ یعنی فَسَیَنْصُرُہُ اللّٰہُ (ترجمہ) اگر تم ان کی مدد نہ کرو گے تو اللہ خود اس کی مدد کرے گا ۔ کیونکہ وہ مختلف طرق و متفرق ذرائع سے مدد کرسکتا ہے ۔ چنانچہ دیکھتے نہیں ہو کہ جب تمام دنیا ساتھ چھوڑ چکی تھی اور کفار درپے قتل تھے تو خدا نے ہجرت کا حکم دے کر ان کی کیسے مدد کی ؟ پس فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ ۔ الایۃ کا جملہ خدائی نصرت کی ایک مثال کا ذکر ہے ۔ لہذا اس کو جواب شرط نہیں کہا جاسکتا ۔ کیونکہ جواب شرط میں استقبال کا معنی چاہیئے ۔ اور یہ لفظاً و معنیً ماضی ہے ۔

۲ ۔ اِذْ کا کلمہ ظرف زمان ہے اور اس کا عامل نصر ہے اور اس کے بعد اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ میں اِذْ پہلے اِذْ سے بدل بعض ہے ۔ اور اِذْ یَقُوْلُ دوسرا بدل بعض ہے ۔ اور اِذْ کا یہ تکرار کلام مجید میں حسن و بلاغت کا آئینہ دار ہے ۔ نیز نصرت خداوندی اور تائید ایزدی کا ایسا اچھوتا اور پُرلطف انداز ہے جس کو صرف صاحبان ذوق ہی پاسکتے ہیں ۔

۳ ۔ اِذْ اَخْرَجَہُ ۔ یعنی جب کہ کافروں نے ان کو وطن سے نکال دیا تھا ۔ مقصد یہ ہے کہ کفار نے حالات اس قسم کے پیدا کر دیئے تھے ۔ جن کی وجہ سے حضورؐ کو مکہ چھوڑنا پڑا ۔ اور مومنین کو بھی ہجرت کرنا پڑی ۔ گویا فعل کی نسبت سبب کی طرف دی گئی ہے ۔

آیت غار سے فضائل کا استنباط اس آیۂ مجیدہ سے لوگوں نے حضرت یار غار کے بہت سے فضائل اخذ کئے ہیں

(۱) پہلی فضیلت ۔ آیۂ مجیدہ کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر جناب رسالت مآبؐ کے محبوب اور محرم راز تھے ۔ اس لئے ان کو ساتھ لے گئے اور علی کو بستر پر سلا گئے ۔ کیونکہ ان کے قتل سے اسلام کو کوئی گزند پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا ۔ بخلاف اس کے اگر ابوبکر قتل ہو جاتے تو اسلام کے کمزور ہو جانے کا اندیشہ تھا ۔ پس یہ آنحضورؐ کی حفاظتی تدبیر تھی جس کے پیش نظر ان کو اپنے ساتھ لے گئے ۔ (لوامع)

علامہ سید علی حائری مرحوم نے تفسیر لوامع التنزیل میں اس کے چار جواب دئے ہیں

۱ ۔ حضرت رسالت مآبؐ خود ان کو ساتھ نہ لے گئے تھے بلکہ یہ از خود پیچھے سے ان کو جا ملے تھے اور راز فاش ہونے کے خطرے سے آپ نے اس کو واپس کرنا مناسب نہ سمجھا تھا ۔ چنانچہ تفسیر لوامع جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۵ قلمی نسخہ میں بروایت امام ابونعیم ابن مردویہ اور سیوطی حضرت ابن عباس سے مروی ہے ۔ جن کی عبارت یہ ہے ۔

لما خرج النبیّ من اللیل لحق بغار ثور وتبعه ابوبکر فلمّا سمع رسول الله حسّهٗ خلفه خاف ان یکون الطلب فلمّا رای ذالك ابوبکر تنحنح فلما سمع النبیّ عرفه فقام له حتی تبعه ۔

ترجمہ :۔ جب حضرت نبی علیہ السلام بوقت شب گھر سے غار ثور کی طرف متوجہ ہوئے تو ابوبکر پیچھے چل پڑا ۔ جب حضور نے پیچھے سے پاؤں کی آہٹ سنی تو ڈر گئے کہ کہیں دشمن نہ ہو ۔ پس ابوبکر اس بات کو سمجھ گیا تو اس نے کھانسنا شروع کیا ۔ پس حضورؐ اس کو پہچان گئے اور انتظار میں رک گئے ۔ پس وہ حضور کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا ۔

نیز تفسیر درمنثور میں ضبتہ بن محصن کی روایت کے الفاظ سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔

دوسرا جواب۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ حضورؐ بنفس نفیس اس کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے تو اس میں کوئی فضیلت ظاہر نہیں ہوتی۔ کیونکہ سفر میں مومن و کافر اور نیک و بد بھی ایک دوسرے کے رفیق ہوا کرتے ہیں۔

تیسرا جواب۔ اگر وہ محرم رازِ نبوی ہوتے تو ان کو یقین ہونا چاہیے تھا کہ خدا اپنے رسول کا محافظ و ناصر ہے۔ لہذا بر مقام پر جزع و فزع کا اظہار نہ ہوتا۔ اور لاتحزن سے خاموش کرانے کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ اس کا جزع و فزع تو ظاہر کرتا ہے کہ خدا اور رسول کے وعدوں پر اس کو وثوق نہ تھا۔ پس فضیلت تو بجائے خود یہ چیز ان کے اصل ایمان کے منافی ہے۔

چوتھا جواب۔ اگر حضرت علی بستر رسول پر نہ سوتے تو ہجرت کا سارا قصہ ختم ہو جاتا۔ کیونکہ کفار بستر رسول کو خالی دیکھتے تو فوراً تعاقب کرتے اور غار تک پہنچنے کا معاملہ سرے سے صاف ہو جاتا۔ امن و سکون کے متلاشی جان کے پیارے تو ہزاروں مل سکتے ہیں لیکن ایسے مشکل وقت میں تن من دھن کی بازی لگانے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اور یہ علی کا کام تھا کہ نہایت اطمینان و سکون سے بستر رسولؐ پر سو گئے۔ اُدھر حضورؐ غار میں پہنچے تو درِ غار پر خدا نے اسی وقت خار مغیلان کو پیدا کر دیا۔ اور ایک جوڑا کبوتر کو حکم دیا کہ فوراً وہاں گھونسلا بنا کر انڈے دے دیں۔ اور عنکبوت کو حکم ہوا کہ جالا تن دے۔ حضرت ابوبکر خدا کی جانب سے ان حفاظتی تدابیر کو دیکھ رہے تھے۔ اور باوجود اس سب کچھ کے جزع و فزع سے باز نہ آنا صاف اس امر کی دلیل ہے کہ وہ یقین کامل نہ رکھتے تھے۔ اگر ان کا قلب صاف ہوتا اور ایمان میں پختگی ہوتی تو ایسے علائم و قرائن بلکہ خوارق عادات اُمور کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ میں ایک خوشی و سرور کی لہر دوڑ جاتی اور دل باغ باغ ہو جاتا۔ بلکہ اس مقام پر کوئی اجنبی انسان بھی اگر حضورؐ کے ہمراہ ہوتا تو ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد وہ کامل الایمان بن جاتا۔ اور جزع و فزع سے دست بردار ہو کر شکرِ خداوندی میں رطب اللسان ہوتا اس کے برعکس بستر رسولؐ کے اِردگرد ننگی تلواریں لے کر کفار آوازے کس رہے ہیں۔ اور سونے والا نہایت سکون سے محوِ استراحت ہے۔ اور تفسیر لوامع میں ابوحامد غزالی کی احیاء العلوم سے منقول ہے کہ جب حضرت علی بستر رسول پر سو رہے تھے تو خدا نے جبریل و میکائیل کو وحی فرمائی کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ قائم کیا ہے۔ نیز ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ مقرر کی ہے تو تم میں سے کون ہے۔ جو اپنے بھائی کو اپنی عمر کا کچھ حصہ دے دے۔ یہ سن کر دونو فرشتے گھبرا گئے۔ پس خدا نے وحی کی کہ تم علی جیسے کب ہو سکتے ہو۔ دیکھو میں نے علیؑ اور محمدؐ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہے۔ اور علی بستر رسول پر سو کر اپنی جان کی قربانی پیش کر رہا ہے۔ پس اب دونو کا فریضہ ہے کہ زمین پر جا کر اس کی نگہبانی کرو۔ چنانچہ جبریل حضرت علیؑ کے سرہانے بیٹھا۔ اور میکائیل پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ اور جبریل نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا بخ بخ من مثلک یا ابن ابی طالب یباھی اللہ تعالیٰ بک الملائکۃ۔ مبارک مبارک اے ابوطالب کے لختِ جگر آج تیری وجہ سے خدا فرشتوں پر فخر و مباہات کر رہا ہے۔ پس یہ آیت مجیدہ اُتری و من الناس الخ۔ اور مروی ہے کہ خدا کا حکم یہی تھا کہ علی کو بستر پر سلا کر ہجرت کریں۔ چنانچہ آپ نے اہلِ مکہ کی امانتیں علیؑ کے حوالہ کیں اور روانہ ہوئے۔ نیز مروی ہے کہ خاک ایک مٹھی میں اٹھائی اور

دائیں بائیں کفار کے سروں پر پھینکی۔ پس وہ آپ کو دیکھ نہ سکے اور آپ چلے گئے۔

اس پوری تفصیل کے بعد صاحبانِ عقلِ سلیم و اربابِ فہم و دانش خود ہی فیصلہ کرلیں کہ:۔

(۱) فداکار وہ سمجھا جائے گا جس کو حضورؐ ہمراہ لے گئے یا فداکار وہ ہے جس کو اپنے بستر پر سلا گئے۔

(۲) یقین کامل وہ رکھتا تھا جو باوجود خدا اور رسول کے وعدوں کے اور باوجود خارق عادت معجزات اور حفاظتی اقدامات دیکھنے کے جزع و فزع سے باز نہ آیا۔ حتی کہ خدا کو لاتحزن کے کلمہ سے روکنا پڑا۔ یا یقین کامل بلکہ حق الیقین کی منزل پر وہ فائز تھا جو رسول کے بستر پر اپنی جان سے لاتعلق ہو کر اطمینان سے سوگیا اور اٹھا تو مَن یَشتری کے قرآنی قصائد اپنے حق میں سن کر رضائے پروردگار کا تمغہ حاصل کرکے اُٹھا۔؟

(۳) کیا رازداری کا وثوق اسی پر ہوا کرتا ہے جس کو انسان ایک لمحہ اپنی ذات سے الگ نہ ہونے دے۔ یا رازداری کا وثوق اس پر ہوتا ہے جس کو ہزاروں جان لیوا دشمنوں میں گھرا ہوا چھوڑ کر اپنے مشن کی تبلیغ اور ادائیگی امانات کا ذمہ دار قرار دیا جائے بہرکیف اصحاب فکر و ارباب ذوق کے لئے جوہر اور کنکر یا سونا اور پیتل میں فرق کرنا بہت آسان ہے لیکن کور باطن سے انصاف کی توقع رکھنا اندھے کے سامنے شیشہ رکھنے کے مترادف ہے۔

(۴) پختگی اعتقاد تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کو بار بار حزن و ملال سے روکنا پڑا۔ کیونکہ آیت مجیدہ میں اِذْ قَالَ نہیں ہے۔ جس کا ترجمہ ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے ساتھی کو (لَا تَحْزَنْ) بلکہ اِذْ یَقُوْلُ فرمایا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ بار بار اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے۔ جب ایک دفعہ اس میں اضطراب دیکھا تو فرمایا لَا تَحْزَنْ پھر تھوڑی دیر بعد جزع فزع دیکھی تو پھر فرمایا لَا تَحْزَنْ۔ چنانچہ ابن عبدہٗ اپنی تفسیر منار جلد ۱۰ صہ۴۹ پر لکھتے ہیں۔

ای اذ کان یقول لصاحبه الّذی هو ثانیه وهو ابو بکر الصدیق حین رای منه امارة الحزن والجزع او کلما سمع منه کلمة تدل علی الخوف والفزع (لا تحزن)

یعنی اپنے ساتھی حضرت ابوبکر سے جب بھی اس سے حزن و غم کی علامت دیکھتے یا جب بھی اس سے کوئی ایسی بات سنتے جو خوف و گھبراہٹ پر دلالت کرے تو فرماتے تھے (لاتحزن) غم نہ کھاؤ خدا ہمارا ساتھی ہے۔

آگے چل کر لکھتا ہے۔

وقد عبر عن الماضی بصیغة الاستقبال (یقول) للدلالة علی التکرار المستفاد من بعض الروایات۔

یعنی ماضی کہنے کی بجائے یعنی قال کی بجائے مطلب کو یقول سے ادا کیا جو مستقبل کے لئے ہے حالانکہ واقعہ زمان ماضی میں تھا صرف معنی میں تکرار کو ظاہر کرنے کیلئے جیسا کہ بعض روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔

صاحب تفسیر نے اپنے مقام پر اس مطلب کو دبانے کی کوشش کی ہے کہ وہ بار بار جزع و فزع کرتے تھے۔ اور

حضورؐ کو بار بار روکنا پڑتا تھا۔ اسی بنا پر کہہ دیا کہ بعض روایات سے تکرار مستفاد ہوتا ہے۔ گویا اس معنے کے انکار کی جگہ ہموار کر لی۔ لیکن اُسے یہ معلوم نہیں کہ قرآن مجید کے صریح خطاب میں اذ یقول کا لفظ قیامت تک کے لئے اس قسم کے اعذار باردہ اور اوہام کاسدہ کے سدِّ باب کے لئے کافی ہے۔ روایات کہیں یا نہ کہیں خود قرآنی الفاظ کہتے ہیں کہ حضورؐ اپنے ساتھی کو لاتحزن کہتے جا رہے تھے۔ اور یہ صیغہ تکرار پر دلالت کرنے کے لئے خود کافی ہے۔ اب اگر ضعیف سے ضعیف روایت بھی اس مضمون کی مل جائے تو وہ اس مطلب کی تائید بن جائے گی۔ نیز صفحہ ۴۹۵ پر بروایت بخاری انس سے منقول ہے کہ مجھے حضرت ابوبکر نے خود بیان کیا کہ میں غار میں حضور کے ہمراہ تھا اور میں نے مشرکین کے نشان دیکھے تو عرض کی کہ اگر ان میں کوئی بھی قدم اٹھا کر نیچے کو جھانکے تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ نے فرمایا یا ابا بکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثھما۔ یعنی اے ابوبکر ان دو آدمیوں کو تشویش کی کیا ضرورت ہے جب اللہ ان کا تیسرا ہو۔ اب ملاحظہ فرمائیے اس قدر تسلّیوں اور وعدوں کے باوجود خوف وہراس اور حزن و ملال میں کمی کا نہ ہونا کونسی پختگی اعتقاد کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس سے کونسی خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ یہ واقعات تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا ساتھ جانا حضورؐ کے لئے باعثِ آزردگیٔ خاطر بن چکا تھا۔ اب ذرا اس کے مقابلہ میں بسترِ رسولؐ پر سونے والے کا اطمینان دیکھئے جو ہر طرف سے دشمنانِ اسلام کی ننگی تلواروں کے سایہ میں بالکل بے خطر سو رہے تھے اور خدا کو یہ فعل اس قدر پسند آیا کہ آیت مرضات بھیج دی۔ اب کیا موازنہ ہو اس شخص کا جس نے رسول کی صحبت میں پوری رات جاگ کر اور رو کر گذاری۔ اور آخر میں لاتحزن کا خطاب پایا۔ ایسے شخص کے ساتھ جس نے ساری رات بسترِ رسولؐ پر تنہا سو کر گذار دی۔ اور اپنے حق میں اپنے خالق سے من یشتری کا قصیدہ پڑھوا لیا۔

دوسری فضیلت۔ تفسیر منار صفحہ ۵۱ میں آیت مجیدہ سے دوسری فضیلت کا استنباط اس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت رسالت مآبؐ نے یہ پسند فرمایا کہ واقعہ ہجرت جو اسلام میں بڑا اہم واقعہ ہے اس کے جملہ مصارف حضرت ابوبکر کے مال سے ہوں جنہوں نے اپنا تمام مال خدمت نبوی میں خرچ کر دیا تھا۔ اگرچہ حضورؐ نے سواری قیمت سے لی تھی جس کا بعد میں ادا کرنا طے پایا۔

آیئے! ذرا اس کا پس منظر بھی دیکھیں کہ یہ خرچ کس طرح ہوا۔ المجالس المرضیہ مؤلفہ مولانا سیّد محمد باقر مدظلہ مجلس ۳ میں مدارج النبوت سے منقول ہے کہ حضرت ابوبکر کے پاس دو اونٹ تھے جو انہوں نے باختلاف روایات چار سو یا آٹھ سو درہم پر خریدے تھے اور ان کو گھاس چارہ کھلا کر خوب موٹا کیا ہوا تھا۔ پس وہ دونوں ہنگامِ ہجرت آپ کی خدمت میں حاضر کئے کہ ان میں سے ایک کا انتخاب کر لیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں قیمت سے لوں گا۔ چنانچہ ایک اونٹ حضورؐ نے نو سو درہم پر خرید فرمایا اندازہ کیجئے کہ کس طرح ہجرت کے مصارف حضرت ابوبکر نے برداشت کئے کہ سواری کا اونٹ بھی حاضر کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سات سو درہم یا کم از کم پانچ سو درہم بطور منافع کے وصول کر لئے۔ اور بقول صاحب تفسیر منار کے بعد میں لینے گئے اور اس کے برخلاف تفسیر روح المعانی پ کی تفسیر صفحہ ۹۷ پر صاف طور پر مذکور ہے کہ سفرِ ہجرت کے لئے حضرت علیؑ نے تین اونٹ بحرین کے اونٹوں سے خرید کر خدمت نبویؐ میں حاضر کئے تھے۔ پس حضور بمع اپنے ساتھی اور ایک تیسرے واقف راہ

کے انہی پر سوار ہو کر مدینہ میں پہنچے۔ مدینہ میں آپ کے پہنچنے کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول بروز سوموار ہے۔ جیسا کہ تفسیر جواہر طنطاوی ج ۵ صد ۱۰۱ پر مذکور ہے کہ آپ تاریخ مذکور کو بنی عمرو بن عوف کے ہاں پہنچے۔ اور آپ کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ چند دن وہاں قیام بھی فرمایا۔ اور ایک مسجد تعمیر کی جس کو مسجد تقوی کہتے ہیں، اور پھر وہاں سے روانہ ہوئے۔ اور پہلے پہل جہاں ان کی سواری کی۔ اُسی جگہ مسجد نبوی کی بنا رکھی گئی۔

تیسری فضیلت۔ چونکہ رسول کا فعل خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہوا کرتا تو گویا حضرت ابوبکر کا انتخاب بحکم خدا تھا۔ اس کا مکمل جواب پہلی فضیلت کے ذیل میں مفصل گذر چکا ہے۔

چوتھی فضیلت۔ ایسے مقام پر جہاں خداوند کریم رسول کے تمام صحابیوں کو جنگ سے گریز کرنے اور بہانے تلاش کرنے پر تنبیہ و توبیخ فرما رہا ہے وہاں حضرت ابوبکر کو ثناء عظیم کے ساتھ یاد کرنا موصوف کی ایسی فضیلت ہے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ واقعی کسی کو بار بار ایک کام سے روکنا کہ ایسا مت کرو، مت کرو مت کرو۔ ایک ایسی تعریف ہے کہ اس میں شاید اس کا کوئی شریک ہوگا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی مت ماری گئی جنہوں نے کسی کے حق میں کہے ہوئے فقرہ «مت کرو، کو بھی اس کی وصف و ثنا سمجھا۔ اگر دامن عقل و انصاف سے وابستہ ہو کر طالب تحقیق غور و فکر کرے تو یہ آیت مجیدہ حضرت رسالتمآبؐ کی عظمت پر دال ہے۔ اور ان کی ہمت و استقلال نیز اطمینان و استقامت کی مظہر ہے کہ عالم وحشت میں جب کہ ایک طرف کفار تعاقب میں تھے۔ اور پوری خاموشی اور سکون سے جان چھپانا اور بچانا مقصود تھا۔ اُس وقت بھی ساتھی ان کو ایسا ملا جو پُر سکون وقت گذارنے کی مہلت ہی نہ دیتا تھا۔ خاموشی اختیار کرنے کی بجائے بار بار اس کو دہائی دینی پڑتی تھی کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ لیکن بایں ہمہ خدا نے حفاظتی تدبیریں ایسی اختیار فرمائیں کہ ایسے دل گداز اور ہوش ربا حال میں بھی دشمن اس کا بال بیکا نہ کر سکے۔ اگر کوئی شخص انصاف کی دوربین آنکھوں کے سامنے رکھ کر اور تعصب کی پٹی اتار کر حقیقت کا جائزہ لینے والا ہو تو وہ اس نظریہ تک ضرور پہنچے گا کہ اس خطاب کو ثناء عظیم کہنے والے کو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانا چاہیئے۔

پانچویں فضیلت۔ جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ کو سورہ براءۃ کی تبلیغ کا حکم دیا تھا اور آیت غار بھی اسی میں ہے۔ گویا حضرت علی بنفس نفیس مکہ میں حضرت ابوبکر کی ثناخوانی کرتے رہے اور یہ ایسی فضیلت ہے کہ رافضیوں کو اس سے مجال انکار نہیں ہے۔ ہاں بے شک حضرت علی ہی سورہ برأت کے مبلّغ تھے اور انہوں نے آیت غار بھی پڑھی ہوگی کہ خدا نے رسول کی اُس وقت بھی نصرت کی جب کہ مکہ سے ہجرت کر کے غار ثور میں پہنچے تھے اور ایسے عالم وحشت میں جب کہ کوئی تسلی دینے والا نہ تھا بلکہ ایک ساتھی تھا تو وہ بھی ایسا کہ بجائے اس کے کہ وہ رسول کے لئے باعث تسکین و تسلی ہوتا۔ الٹا رسول کو اس کی دل جوئی کرنا پڑ گئی۔ اور رسول کو بار بار اُسے چپ کرانا پڑا۔ ایسے حال میں بھی خدا نے رسول کی نصرت فرمائی۔ اس پر سکینہ نازل کیا اور ملائکہ اس کی تائید کے لئے بھیجے۔ اگر یہ ان کی شان کا قصیدہ ہے تو حضرت علی کی اتباع میں تمام رافضی یہ قصیدہ پڑھتے ہیں۔ اور قیامت تک پڑھتے رہیں گے۔ شیعہ حضرت ابوبکر کی اس خصوصیت کا قطعاً انکار نہیں کرتے۔ لیکن علامہ طنطاوی جو اپنے دور

کے جامعہ مصر کے پرنسپل اور اہل سنت کے علماء میں سے بلند پایہ مصنف ہیں۔ اپنی تفسیر جواہر ج ۵ ص۵۹ میں صاف لکھتے ہیں کہ سورہ توبہ کے چار حصّے ہیں۔

پہلا حصہ کفار و مشرکین سے بیزاری کا اعلان اور ان کی تنبیہ و توبیخ اور یہ مَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ تک ہے۔

دوسرا حصّہ۔ جہاد اور فی سبیل اللہ خرچ کا حکم۔ یہود و نصاریٰ کا تذکرہ اور اشہر حرم کا بیان یہ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ تک ہے۔

تیسرا حصّہ۔ منافقین کا ذکر جو اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ تک ہے۔

چوتھا حصّہ۔ مومنین کا ذکر اور یہ آخر سورۃ تک ہے۔

اور حضرت علیؑ کو جس حصّہ کی تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا وہ سورہ برأۃ پورا نہیں بلکہ صرف پہلا حصہ تھا جس کی آپ نے نہایت جرأت سے تبلیغ فرمائی۔ لہٰذا مفتی محمد عبدہ کا یہ چیلنج بھی ختم ہو گیا کہ یار غار کے فضائل حضرت علی نے مکّہ والوں کو سنائے۔ بہتر تھا کہ اس سے پہلے تفسیر جواہر طنطاوی کا مطالعہ فرما لیتے تو یہ پتہ چل جاتا کہ یار غار کا ذکر تو دوسرے حصّہ میں ہے۔ اور حضرت علیؑ اس کی تبلیغ پر مامور ہی نہ تھے۔

چھٹی فضیلت:۔ خدا نے اس کو ثانی اثنین فرمایا کہ وہ دو میں سے دوسرے تھے۔

ساتویں فضیلت:۔ یہ دو ایسے تھے جن کا تیسرا خدا تھا۔

آٹھویں فضیلت:۔ رسول کا کہنا ہے کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ باذنِ خداوندی تھا تو گویا خدا نے ہی فرمایا۔ پس اس سے محبّتِ خداوندی بالخصوص ثابت ہوئی۔

اقول:۔ کسی شے کی محبّت انسان کو اندھا و بہرہ کر دیا کرتی ہے۔ حبّ الشی یعمی و یصم نیز مثل مشہور ہے الغریق یتشبث بکل حشیش۔ یعنی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا چونکہ کسی نہ کسی طرح فضائل کی ایک لمبی فہرست تیار کرنی ہے۔ لہٰذا گنواتے چلے جا رہے ہیں تاکہ عوام کالانعام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا مقصد پورا ہو جائے ورنہ ہر صاحب فہم و ادراک سمجھتا ہے کہ کسی کا کسی کے ساتھ ہونا نیز دوسرا یا تیسرا یا چوتھا ہونا خواہ گنتی کسی بڑے سے شروع ہو یا چھوٹے سے۔ یہ کوئی معیارِ فضیلت نہیں اسی طرح یہ کہنا کہ یہ دو ایسے تھے کہ ان کا تیسرا خدا تھا تو دنیا میں کہاں کوئی ایسے دو ہو سکتے ہیں جہاں تیسرا خدا نہ ہو بلکہ ہر تنہا کے ساتھ دوسرا خدا ہوتا ہے۔ اور ہر دو کے ہمراہ تیسرا خدا ہوا کرتا ہے۔ اور ہر تین کے ساتھ چوتھا خدا ہوتا ہے۔ خواہ مومن ہوں یا کافر بہرکیف خدا سے تو کسی وقت کوئی بھی دور نہیں۔ پس معیت خداوندی اس طرح ہر ایک کو حاصل ہے۔ لہٰذا ایسی باتوں کو فضائل کے شمار میں لانا صرف اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے لئے ہی ہے۔ اس کی مزید تفصیل اگلے جواب میں ملاحظہ فرمائیں۔

نویں فضیلت۔ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ۔ کہتے ہیں کہ یہاں ضمیر غائب کا مرجع صاحب ہے۔ یعنی خدا

نے نبی کے ساتھی پر سکینہ نازل فرمایا۔ اور ضمیر کا مرجع خود جناب رسالت مآبؐ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سکینہ اور تسلّی کی ضرورت تو اس کو ہے جو اضطراب و پریشانی میں مبتلا ہو۔ اور وہ حضرت ابوبکر تھے۔ لہذا سکینہ ان کے لئے ہے۔ اور رسالت مآبؐ تو مطمئن تھے۔ انہیں سکینہ کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی طبیعت کو خوش کرنے کے لئے خوب سوچا ہے۔ رسول کی تنقیص اور اسلوبِ قرآنی کی مخالفت کی قطعًا پرواہ نہیں۔ قرآن مجید میں ہر قسم کی تحریف برداشت کی جا رہی ہے۔ تفسیر بالرای کو آنکھوں پر رکھا جا رہا ہے صرف اس لئے کہ برائے نام کوئی مفروضہ فضیلت نکل آئے اور ہمیں یہ ڈھنڈورا پیٹنے کا موقعہ ملے کہ دیکھو قرآن مجید میں فلاں بزرگوار کے اس قدر فضائل مذکور ہیں۔

اسلوبِ قرآنی کے مزاج شناس منصف طبع اربابِ دانش ذرا غور فرمائیں کہ قرآن کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور لوگ اس کو کدھر لے جا رہے ہیں۔ قرآن مجید اس آیہ مجیدہ سے قبل لوگوں کو جنگ سے گریز کرنے اور نصرتِ رسول سے دست بردار ہونے پر توبیخ فرما رہا ہے۔ چنانچہ اس آیہ مجیدہ میں کھلے لفظوں اعلان فرمایا کہ اگر تم اس کی نصرت نہ کرو گے تو کوئی بڑی بات نہیں خدا خود ہی اس کی نصرت کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ اس نے اس کی ایسے آڑے وقتوں میں نصرت کی جب کہ تم میں سے کوئی بھی اس کی نصرت کے لیے حاضر نہ تھا۔ کیا وہ وقت یاد نہیں جب کفار نے آپ کو وطن چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور آپ صرف دو میں دوسرے ہی تھے۔ یعنی قلتِ عدد کا یہ عالم تھا کہ آپ کے ہمراہ دوسرا صرف ایک ہی آدمی تھا اور بس۔ جب دونوں غار میں چھپے ہوئے تھے۔ اور دشمن تعاقب کر کے غار کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ ڈر تھا کہ کہیں دشمن دیکھ نہ لیں۔ اور آواز نہ سن لیں۔ خدا نے اُن کی حفاظت کے پیش نظر فورًا غار کے دروازہ پر درخت خار مغیلاں پیدا کر دیا (بروایت تفسیر منہج ولوامع) اور جنگلی کبوتروں کے ایک جوڑے کو حکم دیا کہ گھونسلہ بنالیں۔ چنانچہ انہوں نے گھونسلہ تیار کیا۔ اور انڈے بھی دے دیئے۔ اور عنکبوت نے بحکم پروردگار جالا تن دیا۔ یہ ایسے اُمور و اسباب تھے کہ بزدل سے بزدل انسان بھی اگر ملاحظہ کرتا تو اس کا دل بڑھ جاتا۔ اور اُسے تسلی ہو جاتی کہ اب دنیا والے میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نصرتِ خداوندی میرے ساتھ ہے۔ اور اگر کوئی کافر بھی آپ کے ساتھ ہوتا تو یہ معجزات دیکھ کر فورًا مسلمان ہو جاتا لیکن آپ کا ساتھی غار میں داخلے کے بعد غار کے ارد گرد جب کفار کو دیکھا تو خدائی حفاظتی اُمور کو نظر انداز کر کے اس قدر گھبرایا کہ بقول تفسیر مظہری ج چہارم ص۲۱۲ رونے لگ گئے۔ اور بروایت بیہقی نقل کیا ہے۔ فاشفق ابوبکر و بکی و اقبل علیہ الھم والحزن والخوف۔ یعنی پس ابوبکر ڈر گئے۔ اور غم و اندوہ سے رونے لگ گئے۔ پس حضورؐ نے تسلّی دی کہ گھبراؤ نہیں۔ غم نہ کرو۔ خدا کی نصرت و تائید ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن انہیں تسلّی نہیں ہوتی تھی۔ پس حضور بار بار ان کو لاتحزن کی تلقین فرماتے تھے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ساتھی کا وجود انسان کے لئے سہارا بنے۔ لیکن خدا تعالےٰ اپنے حبیب کی تنہائی اس طرح بیان فرماتا ہے کہ آپ کے ساتھ صرف ایک ساتھی تھا وہ بھی ایسا کہ وہ بجائے اس کے کہ موجب سکون ہوتا اُلٹا سلبِ سکون کا موجب بن گیا۔ اور خطرے کے مقام پر بار بار چپ کرانا پڑا۔ پس ایسے روح فرسا بلکہ جان لیوا حالات میں خدا نے اپنے رسول پر سکینہ نازل فرمایا اور ملائکہ کے ذریعے اس کی تائید فرمائی۔ اور قرآنی اسلوب و نظم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ضمیر کا

مرجع حضورؐ کو قرار دیا جائے۔ کیونکہ اس سے قبل کی ضمیریں سب آپ کی طرف راجع ہیں۔ پس اس بیان سے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں فضیلت کی قلعی بھی کھل گئی۔

دسویں فضیلت ۔ ایدہ کی ضمیر کا مرجع بھی وہی ہے کہ خدا نے ملائکہ سے اس کی تائید فرمائی۔ دیکھیے محبت کی رَو میں بہ جانا اور تعصب کی سیل میں کود پڑنا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ حالانکہ اکثر اہل سنت کے مفسرین بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ تائید ملائکہ حضرت رسالت مآبؐ کے لئے ہے۔ بلکہ منصف مزاج مفسرین سب اس کے قائل ہیں کہ تمام ضمیریں غائب کی حضرت رسالت مآبؐ کی طرف راجع ہیں جس طرح کہ اسلوب کا تقاضا ہے۔

گیارھویں فضیلت ۔ خدا نے حضرت ابوبکر کے صحابی ہونے کا اعلان فرمایا۔ اندازہ کیجئے کس قدر افراط فی الحب ہے کہ ہر بات کو فضیلت کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ بھلا کسی کا ساتھی یا صحابی ہونا بھی کوئی فضیلت ہے۔ نبی کے ساتھ ہونا اور اس کا صحابی ہونا اس وقت فائدہ مند ہے۔ جب نبی پر ایمان رکھتا ہو۔ اور زندگی بھر نبی کا وفادار رہے۔ وہ کون شیعہ ہے جو ایسے صحابیوں کو نہیں مانتا بلکہ شیعہ فرقہ وفادار صحابۂ رسول کو سردار سمجھتا ہے۔ اور ان کی غلامی کو فخر خیال کرتا ہے۔ دیکھیے یہاں صرف صاحب کا لفظ وارد ہے۔ اور اس کو فضیلت پر محمول کیا جا رہا ہے لیکن انّما ولیکم اللہ الخ۔ میں باتفاق مفسرین علی کو ولی کہا گیا ہے لیکن اس کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ بیسیوں اس قسم کی آیات ہیں۔ جن میں اہل بیت عصمت کا تذکرہ آتا ہے۔ تو ان کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ ویسے اگر تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر حقائق کا جائزہ لیا جائے تو خود ساتھی ہونا اپنے مقام پر معیارِ فضیلت نہیں ہے۔ نبیوں کے ساتھ کفار و منافقین بھی رہتے رہے ہیں۔ حضرت یوسف کے قید کے دو ساتھیوں کو قرآن میں ان کا صاحب کہا گیا ہے۔ حتیٰ کہ عربی زبان میں جانور ساتھی پر بھی صاحب کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہاں اگر معیارِ فضیلت ہے تو وہ ہے ایمان اور عمل۔ اور یہ چیز بلندی کا وہ زینہ ہے۔ جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

بارھویں فضیلت ۔ خدا نے فرمایا لاتحزن۔ یعنی جس کو اللہ تسلی دے۔ اس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے (ز بریں عقل و دانش بباید گریست۔ اصل بات یہ ہے کہ جو بھائے اس کی ہر بات بھائے۔ اور جو نہ بھائے اس کی کوئی بات بھی نہ بھائے والا معاملہ ہے۔

تیرھویں فضیلت ۔ خداوند کریم نے مخصوص کر کے قرآن مجید میں سوائے ابوبکر کے کسی کی تعریف نہیں کی۔ لہٰذا وہ اس فضیلت میں یکتا ہیں۔

جواب ۔ اگر آیت مجیدہ میں ان کی تعریف و فضیلت ہے تو یہ ان کو نصیب رہے۔ ہاں باقی کسی کی فضیلت قرآن میں عقل کے اندھوں کو کب نظر آسکتی ہے جو چشم بصیرت رکھتے ہیں۔ وہ آیت ولایت آیت شہادت آیت مرضات آیۂ تبلیغ آیت اکمال دین۔ آیت تطہیر اور آیت مباہلہ اور اس کی بیسیوں آیتیں قرآن میں پاتے ہیں جو بالخصوص حضرت علیؑ کی فضیلت میں نص ہیں جن کو متعصب ترین لوگ بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

نتیجہ۔ یہ تیرہ فضیلتیں ہیں جو اپنے عہد کے مصر کے مفتی اعظم محمد بن عبدہ نے اپنی تفسیر منار میں آیت غار سے استنباط کی ہیں۔ انہوں نے صاحب غار کے فضائل تلاش کرنے میں بہت بڑی محنت و کاوش سے کام لیا۔ اور بہت تگ و دو کی لیکن سب کی سب سعی لاحاصل کے سوا اور کچھ نہیں جس طرح کہ واضح کیا جا چکا ہے۔

بہرکیف انہوں نے جہاں غار کی حقیقت بیان کی اور غار کی طرف پہنچنے کا راستہ کسی کی زبانی نقل کیا تو اس فضیلت کو ذکر کرنے کی جرأت تک نہ رہی کہ حضرت ابوبکر حضرت رسالت مآبؐ کو غار تک کندھوں پر اٹھا کر لے گئے تھے۔ جیسا کہ تفسیر روح المعانی میں ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ وہ اس امر کو بھانپ گئے کہ غار تک پہنچنے میں اس قدر صعوبت کے باوجود کسی دوسرے کو کندھے پر اٹھا کر لے جانا ایک فرضی افسانہ ہی بن کر رہ جائے گا۔ جو باقی مفروضہ فضیلتوں کی ناؤ کو بھی ڈبو کر رہے گا۔ لطف یہ ہے کہ صاحب روح المعانی نے بعد کی گرفت سے بالکل بے نیاز ہو کر بڑے طمطراق سے لکھ دیا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت رسالت مآبؐ کو غار کے باہر اتارا اور عرض کی کہ پہلے میں اندر جا کر غار کو صاف کرتا ہوں تاکہ کوئی موذی جانور آپ کو گزند نہ پہنچائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا پھر غار کے باہر آکر حضورؐ کو اٹھا کر غار کے اندر لے گئے۔ جس طرح کہ کوئی بڑا آدمی کسی بچے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے اٹھا کر سلا دیا کرتا ہے۔ یا جس طرح کوئی تندرست کسی مریض کو یا طاقتور جوان کسی بڑے بوڑھے ناتواں ضعیف کی خدمت کیا کرتا ہے۔ گویا صاحب کتاب نے رسول کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیا کہ حضرت ابوبکر کے رحم و کرم پر ہی ان کا انحصار تھا۔ اب بھلا ایسی بے تکی بات کو مفتی مصر کیسے اپنی تفسیر میں درج کر سکتا تھا جب کہ وہ غار کی تحقیق میں یہ بھی لکھ چکا تھا کہ داخلے کے لئے غربی راستہ تھا جو ۲-۳ بالشت کے اندازہ سے تھا کہ داخل ہونے والا پیٹ کے بھر لیٹ کر مشکل سے اندر جا سکتا تھا۔ اب یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک پورا آدمی اپنے ہم عمر کو اٹھا کر بغیر کسی کلفت کے اندر لے گیا۔ ہاں یہ باتیں صرف وہی لکھ سکتا ہے جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ کیا لکھا ہے۔ اور جو لکھا ہے اُس کو عقل و فکر تسلیم بھی کرتا ہے یا نہیں؟ البتہ وہ عوام جو ایسے نایاب فضائل کے لئے ترستے ہیں ان کے کانوں کی لذت کا سامان خوب مہیا ہو گیا۔ وہ بے شک اندھا دھند واہ واہ بھی کریں گے اور خوشی سے سر بھی ماریں گے۔ اور ساتھ یہ بھی تحریر ہے کہ غار کے اندر پہنچ کر حضرت ابوبکر کے زانو پر سر رکھ کر رسول پاکؐ سو گئے تھے۔ اور جن سوراخوں میں حضرت ابوبکر نے اپنے پاؤں رکھ لئے تھے اُن سے سانپوں نے ڈسنا شروع کر دیا تھا تو پاؤں کو حرکت تک نہ دیتے تھے کہ مبادا رسول کی نیند خراب ہو۔ حالانکہ رسول کی شان یہ ہے کہ وہ ہماری طرح بے ہوش ہو کر نہ سوتے تھے۔ اور نہ غافل ہوتے تھے۔ اور آرام کے وقت بھی غافل نہ سونے والا نبی بھلا ایسے پرخطر ماحول میں کیوں کر اتنا غافل سویا کہ ساتھی کی تکلیف کا احساس جاتا رہا۔ اور پھر ساتھی کے زانو پر سر رکھ کر سونا اور مضحکہ خیز ہے۔ گویا رسول پاکؐ کو اپنی تھکاوٹ کا احساس تھا۔ اور ساتھی کی تھکاوٹ کا قطعاً خیال بھی نہ فرمایا۔ غالباً انہی چیزوں کو ملحوظ رکھ کر ابن عبدہ مفتی مصر کو ان فضائل کے شمار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

نیز بوقت روانگی جب زادراہ حضورؐ کو دیا جانے لگا تو اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی اسماء نے اپنے نطاق یعنی کمربند کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑے کے ساتھ زادراہ کو باندھا جس کی وجہ سے اس کا لقب ذات النطاقین پڑ

؎ روح المعانی کی روایت صد ۵۳ پر گزر چکی ہے

گیا ۔ یہ بات بھی فضیلت کی تھی ۔ بہر کیف اس قسم کی گئی فضیلتیں تلاش کر کے اگر ذکر کرتے جاتے تو فضائل کی ایک طولانی فہرست بن جاتی ۔ لیکن انہوں نے صرف انہی مذکورہ فضیلتوں پر اکتفا کیا ۔ اور آگے قدم نہ بڑھایا ۔

کاش : اہل بیت عصمت سے مسلمانوں کو عداوت کا عناد نہ ہوتا ۔ اور وہ چشم بصیرت سے حقائق کا جائزہ لیتے تو یقیناً اس نظریہ پر پہنچتے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ہر خطرہ کے مقام پر حضرت رسالت مآبؐ کے سینہ سپر رہے اور حضرت علیؑ کی ادنی سے ادنی فضیلت کا بھی اگر تمام دنیا سے مقابلہ کیا جائے تو وزنی ثابت ہو گی ۔ اسی شبِ ہجرت کو لے لیجئے ۔ (۱) تفسیر مظہری ص۲۰۹ پر ہے ۔ رسولِ پاک خود حضرت علیؑ کو امانتیں ادا کرنے کے لئے مدینہ میں ٹھہرا گئے تھے ۔ اب اگر حضورؐ کی نظر میں علی سے بڑھ کر کوئی دوسرا صحابی ہوتا تو کیوں نہ اُس کو مقرر فرماتے (۲) حضرت علی کو اپنے بستر پر سلا کر جانا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ پوری اُمت میں سے حضرت علی ہی اس لائق تھے کہ وہ بسترِ رسولؐ پر سوئیں ۔ گویا رسولؐ نے اہل مکہ کی آنکھیں کھول دیں کہ میرے بعد اگر کوئی شخص میرے فرائض ادا کر سکتا ہے ۔ یا میری جگہ لے سکتا ہے تو وہ میرا بھائی علی بن ابی طالب ہے میری مسند کا وارث بھی یہی ہے ۔ اور میری امانتوں کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی یہی ہے ۔ کافروں کی امانت سے مومن کی بلکہ خدا کی امانت زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔ تو جن کو کفار کی امانت کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار دینا گوارا نہیں کیا جاتا اس کو خدائی امانت یعنی عہدۂ حفاظتِ اسلام کیسے سپرد کیا جا سکتا ہے ۔ پس رسول عملاً اعلان کر گئے کہ صرف علی ہی میری جگہ کو پر کر سکتا ہے ۔ اور یہی میرا حقیقی جانشین ہے ۔ (۳) حضرت علی بسترِ رسول پر اس طرح معلوم ہوتے تھے کہ خود بنفسِ نفیس رسولِ پاک استراحت فرما ہیں ۔ اور مشرکین مکہ کو بھی ساری رات یہی گمان رہا کہ حضورؐ آرام فرما ہیں ۔ اور خدا کو حضرت علی کی فداکاری اور وفاداری ایسی پسند آئی کہ آیت من لشیری اتار دی ۔ اندازہ کیجئے ۔ کہاں وہ افشاء راز کہ بار بار خاموشی کی تلقین کرنے کی ضرورت ہو ۔ اور کہاں یہ رازداری کہ صبح تک مشرکین رسول و علی میں فرق ہی نہ کر سکے ۔ کہاں کسی کو ایک فعل سے روکنا اور کہاں مدح و ستائش میں لب کشا ہونا ۔ بہر کیف انصاف و تدبّر کے ساتھ ذوقِ سلیم کے لئے راستہ صاف ہے ۔ حق اور باطل کے درمیان اور تصنّع و حقیقت کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے دُور رس اور حقیقت جو بصیرت کی ضرورت ہے ۔

تائید ملائکہ ۔ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ ۔ الخ ۔ تفسیر منہج میں ہے کہ دروازہ غار پر بھی خداوند کریم کی جانب سے ملائکہ مقربین کا پہرہ تھا ۔ جن کو لوگوں کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں ۔ خداوند کریم کے پاس ملائکہ کی فوج اس قدر ہے کہ انسان اس کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ تفسیر لوامع التنزیل میں کتاب جواہر القرآن سے منقول ہے کہ آدمی جنوں کا دسواں حصہ ہیں ۔ اور یہ سب مل کر بحری مخلوق کا دسواں حصہ ہیں ۔ اور ان سب سے صرف زمین کے ملائکہ دس گنا ہیں ۔ اور ان سب کو ملایا جائے تو پہلے آسمان کے فرشتے ان سے دس گنا ہیں ۔ ان سب سے دوسرے آسمان کے فرشتے دس گنا ۔ وعلیٰ ہذا القیاس ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے فرشتوں سے کرسی کے فرشتے دس گنا زیادہ ہیں ۔ اور ان سب سے عرش کے ایک سرادق کے فرشتے دس گنا ہیں ۔ حالانکہ سرادقات کی تعداد چھ لاکھ ہے ۔ اور یہ سب مل کر عرش کے فرشتوں کا دسواں حصہ ہیں ۔ آسمانوں میں کوئی قدم رکھنے کی

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

چلو بخوشی یا بغیر خوشی اور جہاد کرو اپنے مالوں اور جانوں سے راہ خدا میں یہ بہتری ہے تمہاری

جگہ ایسی نہیں جہاں رکوع۔سجود یا قیام میں کوئی ملک موجود نہ ہو وہ سب کے سب تسبیح و تقدیس پروردگار میں مشغول ہیں۔اور یہ سب مل کر عرش کے طواف کرنے والوں کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے قطرہ سمندر کے مقابلہ میں۔اور پھر لوح کے فرشتے جن کا سردار اسرافیل ہے۔اور پھر جبریل کے ماتحت کام کرنے والے۔پس اللہ کے لشکروں کو سوائے اس کی ذات کے اور کوئی نہیں جان سکتا وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔

کلمہ اللہ کی بلندی

آیت مجیدہ میں بطور نتیجہ کے اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ نے کفار کے کلمہ کو سرنگوں کیا۔اور کلمہ توحید ہی سربلند رہا۔اس مقام پر کلمہ کا معنی دو طرح سے کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کلمہ اللہ سے مراد دین اسلام ہو۔اور کلمہ کافرین سے مراد شرک و کفر و جہالت ہو یعنی خدا نے کفر و شرک کو زیر کیا۔اور اسلام کو حضور کی ہر جگہ امداد و نصرت فرما کر سربلند فرمایا۔گویا یہ اعلان بطور پیشین گوئی کے ہے جو حرف بحرف سچی ثابت ہوئی۔

(۲) کلمہ کافرین سے مراد ان کا وہ مشورہ و منصوبہ ہے جو حضور کے قتل کے متعلق تیار کیا گیا تھا کہ رات کو شب خون مار کر حضور کو اپنے بستر پر قتل کر دیا جائے۔اور ہر قبیلہ کے ایک آدمی کو شریک کیا جائے تاکہ بنو ہاشم کے لئے قصاص لینا مشکل ہو جائے۔اور ناچار وہ خون بہا پر رضامند ہوں۔پس خدا نے حضور کو بذریعہ وحی خبر دے دی۔اور آپ نے ہجرت کر کے کفار کے سارے منصوبے کو ناکام ثابت کر دیا۔پس آیت کا معنی یہ ہو گا کہ کافروں کا منصوبہ فیل ہوا۔اور اللہ کا منصوبہ کامیاب ہوا یعنی رسول پاک بچ گئے اور تبلیغ اسلامی میں کفار کوئی رخنہ نہ ڈال سکے۔

خِفَافًا وَّثِقَالًا۔اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں۔

۱۔جوان اور بوڑھے۔۲۔بخوشی و ناخوشی۔۳۔بے کار و مشغول۔۴۔غنی و فقیر۔۵۔تنگ دست و مالدار۔۶۔تنہا و عیال دار۔۷۔سوار و پیادے۔۸۔کاریگر و بے ہنر۔۹۔تندرست و مریض۔۱۰۔بے ہتھیار و باہتھیار ۱۱۔کمزور و طاقتور۔

لہٰذا اگر معنی عام لیا جائے جو ان تمام کو شامل ہو تو خوب ہے۔

جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔مال و نفس سے جہاد کے وجوب کا حکم ہے۔اور اس میں شک نہیں کہ دنیا میں اپنے طور پر کوئی انسان باوقار و پرسکون زندگی گذارنے کا اہل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ جہاد کا اپنے آپ کو عادی نہ بنائے۔سست اور کاہل انسان صرف اپنی ذات اور قبیلہ کے لئے نہیں بلکہ وہ انسانیت کے لئے بھی بدنما داغ ہوتے ہیں۔ان کا وجود صحیفۂ انسانیت پر ناقابل برداشت داغ ہوا کرتا ہے۔اسی طرح اجتماعی طور پر کوئی قوم من حیث القوم باوقار اس وقت تک زندہ رہ سکتی ہے جب تک مشغول جہاد ہو۔اور اپنے ترقیاتی منصوبوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آگے بڑھتی چلی جائے۔ورنہ جہاں بھی اس

کے قدم رک جائیں گے اور اس کی دفاعی کمزوری رونما ہوگی۔ وہاں دوسری دنیا کی ہوشیار قومیں اُسے اپنے مقام سے دھکیل دیں گی اور خود اس کی جگہ سنبھال لیں گی۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

دورانِ جنگ میں پاکستان

ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کا یہ دَور نہایت پُرآشوب تھا جب کہ بھارت نے اس ملک کے غیور جوانوں کو للکارا۔ اور پُوری قوم دفاعِ ملک کی خاطر جانی و مالی ہر قسم کی قربانی کے لئے تُل گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک و قوم کے دفاع کی خاطر جو انبساط و سرور اس دَور میں دیکھنے میں آیا تھا وہ اس سے قبل مفقود تھا لوگوں کی چہل پہل بتلاتی تھی کہ ہماری قوم ایک زندہ قوم ہے۔ اور باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ اکثر دنیا کے ممالک آج تک یہ نہیں باور کر سکے تھے کہ پاکستان بھی کوئی دنیا میں الگ اور خود مختار آزاد ملک ہے۔ حتیٰ کہ انگلستان کے عوام بھی اب تک پاکستان کو بھارت کا ایک صوبہ سمجھے ہوئے تھے۔ لیکن چھ ستمبر ۱۹۶۵ء سے ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء تک کی سترہ یوم کی تاریخی جنگ اور افواجِ پاکستان کا انتہائی بے جگری سے بھارتی ٹینکوں کے بھرپور حملے کو روکنا اور اُسے پس پا کرنا نیز نہتے مجاہدین کا ٹینکوں اور توپوں کے منہ میں کود کر ان کو تہس نہس و زیر و زبر کرتے ہُوئے جان پر کھیل جانا ایسا اہم کردار تھا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا اور تاریخ پاکستان میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا پس جہاں اٹھارہ سال متواتر پاکستان کے سفارت خانے شب و روز کی محنت و کاوش اور کروڑوں روپے کے صرف کے باوجود صرف پاکستان کا مستقل وجُود اقوامِ عالم سے تسلیم کرانے میں قاصر رہے تھے۔ وہاں پاک بھارت کی سترہ دن کی تاریخی جنگ میں مجاہدین پاکستان کا بے پناہ عزم و شعور جذبہ فرض شناسی اور جرأت و ایثار اور باوجود انتہائی قلت و بے مائیگی کے طاقتور سرمایہ دار اپنے سے پانچ گنا دشمن کا منہ توڑ دینا بلکہ ان کے کبر و غرور کو توڑ دینا اس قدر نتیجہ خیز ثابت ہوا کہ اب اقوامِ دنیا کو صرف پاکستان کا استقلال ہی نہیں تسلیم کرنا پڑا بلکہ انہیں ماننا پڑا ہے کہ پاکستانی قوم دنیا کی زندہ قوموں میں سے ہے۔ پس جو کام اٹھارہ برسوں میں سفارت خانے نہ کر سکے تھے وہ سترہ دنوں میں باحسن وجُوہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

نیز اس لڑائی نے قوم کی خفتہ صلاحیتوں کو جگایا بلکہ پوری قوم کی کایا پلٹ گئی۔ بزدل کو جذبۂ شجاعت ملا۔ مال دار میں جذبۂ سخاوت پیدا ہوا۔ عوام میں جوشِ ایثار رونما ہوا۔ مختلف جماعتوں میں جذبۂ اتحاد و اتفاق کارفرما ہوا۔ جوانوں میں فرض شناسی کا احساس آ گیا۔ فوجیوں میں شوقِ شہادت پیدا ہوا۔ بچّوں میں ذہنی انقلاب نے تربیت کی جگہ پائی۔ بوڑھوں کے حوصلے بڑھ گئے اہلِ قلم میں تحریری سلجھاؤ نے ترقی کی۔ مقررین و خطباء و واعظین کے بیانات سے جذبہ حب الوطنی کا پرچار شروع ہوا۔ حکام و رعایا نے کسی حد تک اپنے اپنے رویّوں میں اعتدال پسندی کی طرف رُخ کیا۔ بہر کیف اس سترہ دن کی مختصر لڑائی نے قوم کے دلوں میں ایسے اَن مٹ نقوش چھوڑے جو صدیوں تک محو نہ ہو سکیں گے۔ اور ایسے مؤثر درس دیئے جو کتابوں سے صدیوں تک حاصل نہ ہو سکے۔ اور یہ اس سترہ روزہ جنگ کی اعجاز نمائی تھی کہ شہری عورتوں میں فیشن پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان یکبارگی رک گیا تھا۔ اور اس کی جگہ اسلامی اقدار کی طرف توجہ ہونے لگی تھی۔ آوارہ چہل پہل اور خوش گپیوں کی بجائے اُمورِ خانہ داری کا احساس دلوں میں کارفرما ہو گیا۔

غرضیکہ مغربیت کے جمے ہوئے قدم ایک دم اکھڑ گئے۔ اور بھولا ہوا اسلام یاد آیا۔ لیکن جونہی جنگ بندی کا اعلان ہوا تو رفتہ رفتہ قدم پیچھے کو سرکنے لگ گئے۔ اور اعلان تاشقند کے بعد تو نہ صرف جنگ سے قبل کی یاد تازہ ہوئی بلکہ لادینیت کا سیلاب پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک صورت میں ظاہر ہوا۔

آئیے اس جنگ سے قبل سوادِ اعظم کے نزدیک علی کا نام لینا اور اس کی شجاعت کا منبروں پر بیان کرنا بارِ خاطر تھا۔ اور واقعاتِ کربلا کا بیان کرنا بدعات میں سے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وقت آنے پر وہ سب یکسر منسوخ ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اخبارات میں علیؑ علیؑ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ فوجیوں میں یا علی یا علی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ریڈیائی گانوں کی جگہ قومی ترانوں نے لے لی جن میں علیؑ علیؑ کا ورد اکثر ہونے لگا۔ اور شعراء نے اپنے کلام منظوم کو شجاعتِ حیدری کے بیان پر وقف کر دیا۔ جہاں شجاعت کا جوش دلانے کی ضرورت ہوئی تو کہا گیا علی علی کرو۔ اور آگے بڑھو۔ اور جہاں مرنے والوں کے وارثوں کو صبر کی تلقین کی گئی تو واقعات کربلا کو دہرا دیا گیا۔ اب واعظین وذاکرین نیز علماء ومجتہدین جو کام صدیوں نہ انجام دے سکے تھے وہ جوش جنگ اور شوق جہاد نے سترہ دنوں میں انجام دے دیا۔ اب تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ کہے علی علی کہنا گناہ ہے۔ فوجیوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ "جب نام علی منہ سے نکل جاتا ہے۔ گرتا ہوا انسان بھی سنبھل جاتا ہے"۔ اور مدت سے ایک شعر پڑھا سنا لکھا جاتا تھا کہ "اسلام کے دامن میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں۔ اک ضرب یداللٰہی اک سجدہ شبیری"۔ اس سترہ روزہ جنگ نے اہلِ پاکستان پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ ایسے آڑے وقتوں میں شجاعت کے لئے علی کے کارنامے اور صبر آزما حالات میں حسینی مصائب کے سوا مسلمان کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ پس علیؑ وحسینؑ کی اطاعت ہی حقیقی اسلام ہے اور بس۔

عوامی تاثرات۔ اس مقام پر مناسبت کے لحاظ سے روزنامہ نوائے وقت ۲۶ر اکتوبر ۶۵ء کے تیسرے صفحے کے کالم ۲ سے ایک جملہ ملاحظہ فرمائیے۔ جنگ کے سترہ دنوں میں بڑے انقلاب آئے ہیں۔ انقلاباتِ زمانہ میں سے ایک انقلاب یہ بھی ہے کہ جو ادیب، شاعر اور دانشور "بسم اللہ" پڑھتے ہوئے شرماتے تھے۔ اب اعلانیہ کلمہ پڑھنے لگے ہیں۔ وہ ایسے مشرف باسلام ہوئے ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ترقی پسندوں کی نسل ہے جو اسلامی شعار کو رجعت پسندی کی نشانیاں قرار دیا کرتی تھی اب وہ اس طرح علی علی کے نعرے لگا رہے ہیں کہ اس طرح کبھی کسی صنم نے بھی ہری ہری نہیں پکارا ہو گا۔

نیز اسی اخبار کے ۱۸ر نومبر ۶۵ء کے تیسرے صفحے پر جنگ کے عنوان سے جو مضمون درج ہے اس میں یہ فقرات مذکور ہیں۔

سنتِ الٰہیہ یہ ہے کہ کبھی کبھی اس کا فضل وکرم، قہر وغضب کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کو مصائب ومشکلات میں مبتلا کر کے ان کی سربلندی وسرفرازی کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اس کا قہر وغضب، لطف وکرم کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ کہ انسان کو رزق کی فراوانی اور مال کی فراوانی دے کر عیش وعشرت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ مقصد زندگی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اب کے اس کا فضل وکرم ہندوؤں کے عیارانہ حملہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ مسلم خوابیدہ توپوں کی گھن گرج سے بیدار ہوا اس کے منتشر عناصر بجلی کی سرعت اور مقناطیس کی کشش کی طرح آناً فاناً ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ ان کی باہمی عداوتیں،

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ

اگر تم جانو | اور اگر ہوتا نفع نزدیکی | اور سفر آسان | تو اتباع کرتے

وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ

ولیکن لمبا سوجھا ان کو فاصلہ | اور ابھی اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہماری طاقت ہوتی تو تمہارے ساتھ چلتے

يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٤٢﴾ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ

وہ اپنے آپ کو ہلاک کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں | اللہ کی عفو میں رہو انہیں کیوں اذن دیدیا

رقابتیں، کدورتیں اور رنجشیں سب کافور ہوگئیں۔ اختلافات مٹ گئے۔ دشمن۔ دوست اور مخالف موافق بن کر ایک ہی صف میں دشمن کے سامنے صف آرا ہو گئے۔ ناجائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور فسق و فجور کے دروازے یکایک اور خود بخود بند ہو گئے۔ ڈاکوؤں۔ لٹیروں، راہزنوں، قاتلوں اور چوروں نے جرائم سے ہاتھ روک لئے جو دین سے بیزار تھے وہ دیندار بن گئے۔ جو شراب کے رسیا تھے وہ غازی بن گئے۔ جو اسلام کا نام آتے ہی بغلیں جھانکنے لگتے یا اس کا مضحکہ اڑانے لگتے تھے۔ وہ اب اسلام کے گیت گانے لگے۔ جو ترقی پسند تھے رجعت پسند بن گئے۔ اور لینن لینن کی بجائے علی علی کرنے لگے۔ ریڈیو پاکستان جو قوم کو راگ و رنگ، رقص و سرود کی تعلیم و تربیت دینے۔ عریاں اور فحش فلمی گیت سنانے کے لئے وقف تھا مومن بن گیا۔

عَرَضًا قَرِيْبًا:- یعنی وہ جو انسان کو پیش آئے (منفعت میں سے) اور قریب ہو۔ یعنی ایسی منفعت جو بلا تکلیف حاصل ہو۔

قَاصِدًا :- یہ تامر اور لابن کی طرح ہے یعنی جس طرح تامر کا معنی صاحب تمر اور لابن کا معنی صاحب لبن ہے۔ اسی طرح قاصد کا معنی صاحب قصد ہے۔ یعنی جس کا قصد کرنا آسان ہو۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مادہ پرست ہیں۔ ان کو مذہب کی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ پس اگر ان کو مادی فائدہ ہوتا۔ اور بغیر تکلیف کے مال و دولت کے حصول کا لالچ ہوتا تو بلا تردد آپ کے پیچھے چل پڑتے لیکن یہاں تو وہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ سفر لمبا بھی ہے۔ اور باعث تکلیف بھی۔ اور علاوہ ازیں موت بھی سامنے ہے۔ اسی لئے قسم قسم کے بہانے تراش کر معذرت پیش کرتے ہیں۔

وَسَيَحْلِفُوْنَ - یعنی جب آپ جنگ سے واپس آئیں گے تو یہ لوگ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور خیر خواہی کو جتلانے کی خاطر قسمیں کھا کھا کر اپنی معذرت کا اظہار کریں گے۔ حالانکہ وہ بالکل غلط بیانی ہو گی۔ جس کا ایمان و صداقت سے کوئی واسطہ نہ ہو گا۔

رکوع ۱۳۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ - بعض لوگوں نے حیلہ سازی اور چاپلوسی کر کے آپ سے گھر بیٹھ رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی تو خداوند کریم تنبیہ فرما رہا ہے۔ اس طرح کہ سرزنش سے قبل عفو کا اظہار فرمایا۔ یعنی آپ کا ان کو اجازت دینا۔ اور ان کی معذرت کو قبول کرنا اگرچہ قابلِ مواخذہ نہیں۔ کیونکہ اس بارہ میں آپ مختار کل ہیں۔ لیکن آئندہ ایسے بہانہ کرنے والوں

حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ ﴿۴۳﴾ لَا یَسْتَاْذِنُکَ

یہاں تک کہ تم کو معلوم ہو جائیں وہ جو سچ کہتے ہیں اور جان لو جھوٹوں کو نہیں پوچھتے آپ سے وہ

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰہُ

لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور قیامت پر یہ کہ آیا جہاد کریں اپنے مالوں اور جانوں سے اور اللہ

عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

جانتا ہے تقوی کرنے والوں کو پس پوچھتے وہی ہیں جو نہیں ایمان رکھتے اللہ اور قیامت پر اور

وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا

شکی ہیں ان کے دل اور وہ حالت شک میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور اگر وہ جانا چاہتے تو اس کے لئے

کو فوراً اجازت نہ دیا کرو۔ بلکہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر کے عمل کیا کرو تاکہ ان میں سے سچے اور جھوٹے کا پتہ چل سکے۔ یہ آیتیں غزوۂ تبوک سے مسلمانوں کی سستی کی مذمت کے لئے اُتری تھیں۔

لَا یَسْتَاْذِنُکَ۔ یعنی جن لوگوں کے دلوں میں ایمان راسخ ہے وہ تن من دھن سے جہاد کے لئے حاضر ہیں لہٰذا بار بار آپ سے پُوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن جو لوگ منافق ہیں اُن کے دل تو پہلے سے ہی شک میں ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس طرح سے ان کی گلو خلاصی بھی ہو جائے گی۔ اور موردِ عتاب بھی نہ بنیں گے۔ لہٰذا بار بار آپ سے ان کا سوال کرنا اسی بدباطنی ہی کا پیداوار ہے۔

مصلحت جہاد۔ پروردگار کی مصلحت یہ ہے کہ انسان اپنی اس مختصر تمدّنی زندگی میں جیتی جاگتی شخصیّت بن کر رہے ایسا نہ ہو کہ دنیا والے اُسے باوجود زندہ ہونے کے مُردوں کے برابر سمجھیں۔ نیز ایسا نہ ہو کہ خود غافل رہے۔ اور گذشتہ مجاہدین کے کارناموں پر فخر و مباہات کو مآل زندگی قرار دینا رہے بلکہ ایسی مجاہدانہ زندگی بسر کرے کہ گذشتہ ارواح اس کو خراج تحسین پیش کریں۔ اور آئندہ نسلیں اس کے کردار کو مشعل راہ بنائیں۔ پس اگر کوئی زندہ گذشتہ اکابر کے کارناموں پہ فخر کرے تو یوں سمجھیئے کہ وہ زندہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے۔ جو مردہ لوگوں کے کارناموں پہ فخر کو مآل زندگی سمجھے۔ اور وہ مُردہ مُردہ نہیں بلکہ زندہ ہے۔ جو اپنی چند روزہ زندگی میں ایسے آثار چھوڑ کر جائے کہ زندہ قومیں اس پر فخر و مباہات کرتی رہیں۔ پس ہر دور میں مجاہدانہ زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ لہٰذا اپنے مال و جان کو جہاد کے لئے ہر وقت تیار رکھنا فریضہ انسانیت ہے۔ اور قوموں کی مجموعی زندگی کی کامیابی اسی نقطہ نظر سے ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ وہ قومیں زندہ ہیں جو حرکت و شعور میں ہوں۔ اور وہ قومیں مردہ ہیں جو دوسروں کے دستِ نگر رہیں۔ قرآن مجید نے مالی و جانی ہر دو قسم کے جہادوں کا حکم دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی حیثیت و موزونیت سے قومی

لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

تیاری کرتے لیکن اللہ نے ناپسند کیا ان کا جانا پس ان کو روک دیا اور کہا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھ رہنے والوں میں (کیونکہ)

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ

اگر وہ جاتے تو نہ زیادہ کرتے مگر فساد اور تم میں رہ کر سازشیں کرتے تمہارے درمیان کہ تم میں پھوٹ ڈال دیتے

الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ

اور تم میں ایسے ہیں جو ان کی سنتے ہیں اور خدا جانتا ہے ظالموں کو البتہ ایک مرتبہ پہلے بھی انہوں

مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ

نے پھوٹ ڈالی اور تمہاری تدبیر کو الٹا یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا امر غالب ہوا حالانکہ

لسانی جہاد میں حصہ لے سکے۔ یعنی مرد اپنی حیثیت سے عورت اپنے انداز سے جوان اپنی موزونیت سے اور بوڑھے اپنی بساط سے علماء اپنی پوزیشن کے ماتحت اور عوام اپنی صلاحیت سے۔ فقراء اپنی حیثیت سے۔ اور تونگر اپنی طاقت سے۔ گویا ہر شخص کو اپنی اپنی حیثیت کا سپاہی بن کر گذارنا چاہیئے۔

— لَوْ خَرَجُوْا۔ پچھلی آیت کی تفسیر ہے۔ اور منافقین کی قلبی کیفیت کا بھانڈا پھوڑا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جو آپ سے جنگ کی اجازت چاہتے ہیں، درحقیقت یہ جنگ پر آمادہ نہیں ورنہ کم از کم کچھ نہ کچھ تیاری تو کر لیتے۔ اور اچھا ہوا کہ نہیں گئے ورنہ ان کی نیتیں خراب تھیں۔ اور خدا کو ان کا جانا گوارا نہیں تھا۔ پس اس نے ان کی رکاوٹ کے اسباب پیدا کر دیئے۔ اور وہ بیٹھے ہی رہے۔ کیونکہ اگر جاتے تو کفار کی طرف سے جاسوس بن جاتے۔ اور مسلمانوں کے رازوں کا افشاء کر کے مسلمانوں میں کمزوری کا باعث بنتے۔ یا مسلمانوں میں چغلی و غیبت کو ہوا دے کر ان کی آپس میں پھوٹ کا باعث ہوتے۔ اور یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ قِيْلَ اقْعُدُوْا الخ۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ان کو اس طرح کہا گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ خدا نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ ان کو بیٹھ جانے کا بہانہ دستیاب ہو گیا۔ پس یہ تعبیر سمجھانے کے ہے۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ۔ یعنی منافق گروہ نے اس جنگ یعنی غزوہ تبوک سے پہلے بھی اپنی بدباطنی اور انتشار پسندی کا ثبوت دیا۔ یعنی سب سے پہلے جنگ احد میں انہوں نے شر پسندی کا بدترین مظاہرہ کیا تھا جب کہ عبداللہ بن ابی نے بمعہ جماعت کے عین موقعہ پر ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ تاکہ مسلمانوں کے قدم ڈگمگا جائیں۔ لیکن خدا نے فتح و نصرت دے کر ان کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور اسلام کا بول بالا کر کے ان کو شرمسار اور رسوا کیا۔

وَلَا تَفْتِنِّيْ۔ یعنی بعض کہتے ہیں کہ ہمیں آپ معاف فرمائیں۔ اور آزمائش میں نہ ڈالیں کہ آپ کی اطاعت نہ کر کے ہم

كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ

ناپسند کرتے تھے اور ان (منافقوں) میں سے بعض کہتے ہیں کہ مجھے اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے آگاہ ہو وہ آزمائش میں تو آگئے

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ

اور تحقیق جہنم اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے کافروں کو اور اگر پہنچے تمہیں فائدہ تو انہیں برا لگتا ہے اور اگر پہنچے تمہیں

مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ

مصیبت تو کہتے ہیں ہم نے تو اپنا بچاؤ کر لیا پہلے سے اور خوشی خوشی واپس جاتے ہیں کہہ دیجئے

لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

ہمیں نہیں پہنچتا مگر وہ جو مقرر کیا اللہ نے ہمارے لئے وہ ہمارا مولا ہے اور اللہ پر ہی بھروسا کرنا چاہیئے مومنوں کو

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ

کہہ دیجئے کہ تم نہیں انتظار کرتے ہمارے متعلق مگر دو میں سے ایک کا جو ہمارے فائدہ کی ہیں (غنیمت یا شہادت) اور ہم تمہارے متعلق

آزمائش میں پڑ جائیں گے۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ ۔ چونکہ جس جنگ میں مومنوں کو کافی مال غنیمت ہاتھ لگتا تھا اور فتح و نصرت سے واپس آتے تھے تو منافقین کو دل میں کافی دکھ پہنچتا تھا۔ اور اگر ظاہری طور پر مومنوں کو جسمانی یا مالی کوئی نقصان پہنچتا تو وہ خوشی سے بغلیں بجاتے تھے۔ پس خداوند کریم ان کی سرزنش میں فرماتا ہے کہ ان جاہلوں کو حقیقت کی خبر نہیں کیونکہ یہ اگر فاتح ہوں تو اسلام کی سربلندی کے ساتھ ان کو مالی فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ اور وقار و عظمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور مارے جانے کی صورت میں وہ درجہ شہادت پر فائز ہوتے ہیں۔ جس سے ان کی اُخروی زندگی سدھر جاتی ہے۔ بہر حال مسلمانوں کو ہر طرح سے فائدہ ہی ہے۔ پس منافق لوگ ان کے متعلق جو پہلو بھی سوچیں گے وہ ان کے فائدہ کا ہی ہوگا۔ خواہ دنیاوی فائدہ ہو یا اُخروی۔ لیکن بخلاف اس کے چونکہ منافقوں کا فائدہ منحصر ہے دنیاوی منافع میں۔ اور وہ اس سے محروم ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کا ہی بول بالا رہے گا۔ اور اُخروی وقار اس لئے نہیں کہ نعمتِ ایمان سے محروم ہیں۔ پس ظاہری ایمان کی وجہ سے ان کی جان و مال ایک مصلحت کے ماتحت محفوظ ہے۔ لہٰذا وہ ہر طرح عذاب کا ہی لقمہ بنیں گے۔ یا تو ان کے متعلق حکم بھیجے گا۔ پس ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں دنیاوی عذاب چکھنا پڑے گا۔ اور یا وہ خود عذاب بھیج دے گا۔ ورنہ عذاب آخرت تو ان کے لئے ہے ہی۔ پس ان کا خسارے میں ہونا حتمی ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا ۔ منافقین کے لئے سرزنش ہے کہ وہ اپنے اموال اگر خرچ کریں خواہ اپنی مرضی سے کریں یا مجبور ہو کر

بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ

(صرف ایک) سوچتے ہیں کہ اللہ تم پر اپنا عذاب بھیجے گا اپنی جانب سے یا ہمارے ہاتھوں سے پس تم بھی منتظر رہو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں کہہ دیجئے

اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

کہ خرچ کرو خواہ خوشی سے یا بد دلی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے کیونکہ تم فاسق لوگ ہو

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ

اور کوئی رکاوٹ نہیں اس سے کہ ان کا دیا ہوا قبول ہو مگر یہ کہ وہ انکاری ہیں اللہ اور اس کے رسول سے

وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور نہیں پڑھتے نماز مگر بد دلی سے اور نہیں خرچ کرتے مگر ناپسندیدگی سے

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى

بس نہ تعجب میں ڈالیں تمہیں ان کے اموال و اولادیں بجز اس کے نہیں کہ اللہ ان کو معذب رکھنا چاہتا ہے ان کی بدولت

کریں۔ ان کا یہ خرچ عند اللہ مقبول نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ دولتِ ایمان سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ اور اللہ اور اُس کے رسول سے کفر کرنے والوں کی نیکیاں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ اور اُن کے عدمِ ایمان کی نشانی یہ ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو سُستی اور بددلی سے۔ ورنہ اگر ان کا خدا پر ایمان ہوتا تو نماز کی یہ حالت نہ ہوتی۔ اسی طرح جو صدقات و زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ بھی بدل ناخواستہ اور تاوان سمجھ کر۔ ورنہ اگر ان کا ایمان درست ہوتا تو اُسے عبادت سمجھ کر کرتے اور مستحقِ ثواب ہوتے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار پر فروعاتِ دین کی بجاآوری واجب ہے۔ اگرچہ ایمان کے بغیر وہ حدِ مقبولیت کو نہ پہنچیں گے۔

نیز یہ آیات ان لوگوں کو بھی سرزنش کر رہی ہیں جو اسلام و ایمان کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے قریب تک نہیں جاتے۔ خداوند کریم سُستی سے نماز پڑھنے اور بدل ناخواستہ زکوٰۃ ادا کرنے کو ان کے کفر کی دلیل قرار دے رہا ہے۔ تو بالکل نہ پڑھنے والے اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے والے کیسے مسلمان یا مومن کہلانے کے حقدار قرار دئے جا سکتے ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ۔ یعنی کفار و منافقین کے پاس مال و اولاد کی کثرت سے یہ اندازہ نہ کیا جائے کہ خدا ان پر راضی ہے کیونکہ وہ بڑے خوش حال ہیں۔ بلکہ یہی مال و اولاد دنیا میں بھی ان کے لئے وبال ہے کہ وہ ہر وقت ان کی وجہ سے عذابِ خداوندی میں گرفتار رہتے ہیں۔ اور جب مریں گے تو ان کا مال و اولاد سب کا سب ان کے لئے باعثِ حسرت و ارمان ہوگا۔ اور

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ

دنیاوی زندگی ہیں اور ان کے روح نکلتے ہیں درحالیکہ وہ کافر ہوتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی

إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَأً

کہ وہ تم ہیں سے ہیں حالانکہ وہ تم ہیں سے نہیں بلکہ وہ لوگ ڈر کے مارے (تمہارے ساتھ) ہیں اگر وہ پاتے کوئی جائے پناہ یا

أَوْ مَغٰرٰتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ

غار یا داخل ہونے کی جگہ تو اس کی طرف جلدی سے چلے جاتے اور بعض ان میں سے تم پر صدقات

فِي الصَّدَقٰتِ فَإِنْ أُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَإِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

(کی تقسیم) کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں پس اگر ان کو دیا جائے تو راضی ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو وہ ناراض ہوتے ہیں

اسی عذاب سے معذّب ہو کر رخصت ہوں گے تو پھر قیامت میں اس سے بھی زیادہ عذاب ان کے لئے تیار ہوگا۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ محذوف سے متعلق ہو کر اَوْلَادُھُمْ کی صفت بن جائے۔ اور معنی یہ ہو کہ ان کے اموال و اولاد جو ان کو زندگانی دنیا میں عطا ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں تعجب میں نہ ڈالیں۔ کیونکہ یہ خدا کی طرف سے ان کا استدراج ہے۔ اور درحقیقت یہ چیزیں ناشکری کی وجہ سے ان کے اخروی عذاب کا پیش خیمہ ہیں۔ اور پہلے معنی کی رو سے اگرچہ مومن بھی مال و اولاد کی وجہ سے دنیا میں گرفتار مصائب تو ہوتا ہے لیکن چونکہ ایمان کی بدولت وہ دل میں یہ تسلی رکھتا ہے کہ اس محنت و کاوش کے نتیجہ میں مجھے اخروی درجات نصیب ہوں گے تو وہ دنیاوی تکالیف میں بھی ایک قسم کی راحت قلبی محسوس کرتا ہے بخلاف کافر کے کہ وہ چونکہ آخرت پر تو ایمان نہیں رکھتا۔ لہذا دنیا میں مال و اولاد کی وجہ سے ہر تکلیف اس کے لئے صرف عذاب ہی عذاب ہوتی ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ۔ یعنی ان منافقوں میں سے ایسے ہیں کہ صدقات کی تقسیم میں آپ کی عدالت کو چیلنج کرتے ہیں کہ آپ نے عادلانہ تقسیم نہیں کی۔ اصل ان کے نزدیک معیار یہ ہے کہ اگر ان کو حصہ دیا جائے تو وہ راضی ہیں لیکن اگر صحیح مستحقین میں صدقات کی تقسیم ہو۔ اور ان کو حصہ نہ دیا جائے تو پھر وہ ناراض ہوتے ہیں۔ اور یہ صرف اس زمانہ کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ آج کل بھی یہی حالت ہے کہ اگر کہیں کوئی شخص زکوٰۃ یا خمس کی رقوم کو مستحقین میں تقسیم کرے تو جن لوگوں کو حصہ مل جائے وہ تو کسی حد تک راضی ہو جاتے ہیں لیکن جو محروم رہ جائیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دینے والے نے جن مستحقین میں تقسیم کیا ہے وہ مجھ سے زیادہ مستحق تھے یا کم از کم وہ بھی مستحق تھے۔ بلکہ ہر قسم کی لعن وطعن اس پر کرتے ہیں اور ہر گند کیچڑ اس پر اچھالتے ہیں بلکہ میں نے بعض ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ مستحقین کی ان بے اعتدالیوں کی وجہ سے انہوں نے آئندہ کے لئے عہد کر لیا ہے کہ پھر کبھی اعلانیہ تقسیم نہ

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا

اور اگر وہ خدا اور رسول کے دیے پر راضی ہو جاتے اور کہتے ہیں ہمیں خدا کافی ہے عنقریب اللہ اپنے

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ

فضل سے ہمیں دے گا اور اس کا رسول تحقیق ہم طرف اللہ کے رغبت کرنیوالے ہیں (تو یہ اُن کے لئے بہتر ہوتا) بس صدقے فقیروں کے لئے

کریں گے۔ بلکہ جو واجب الادا ہو گا وہ کسی دوسرے طریقہ سے مستحق تک پہنچا دیں گے۔ خدا ایسے لوگوں کو خود سمجھے۔ بہر کیف آیت مجیدہ میں خداوند کریم نے ایسا کرنے والوں کو منافقوں کے زمرے میں ذکر فرمایا ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے درست راہ یہ تجویز فرمائی ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کریں کہ اگر اس دفعہ تقسیم میں اس کو نہیں ملا تو خدا کسی دوسرے راستہ سے ان کی امداد کر دے گا۔ کیونکہ اُس نے رزق تو دینا ہی ہے۔ اگر وہ یہ طریقہ اختیار کرتے تو ان کے لئے زیادہ موزوں و مناسب تھا۔

لَوْ اَنَّهُمْ۔ یہ شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے۔ یعنی لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ یعنی اگر ایسا کرتے تو اچھا ہوتا۔

رکوع ۱۴۔ زکوٰۃ کا بیان

مقام کی موزونیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔ مختصر اور جامع طور پر اس کی مصلحت و افادیت شرائط وجوب اور جنس زکوٰۃ وغیرہ اہم پہلوؤں کے ذکر کے بعد مستحقین زکوٰۃ کا بیان چونکہ زیادہ قریب فہم ہوگا۔ لہذا پہلے ان کا بیان کرنا ضروری ہے

زکوٰۃ کی مصلحت و افادیت

انسان چونکہ مدنی الطبع ہے۔ یعنی اجتماعی اور باہمی تعاون کے بغیر اس کی زندگی نہایت مشکل ہے۔ لہذا اسی تمدن کی ضرورت کے پیش نظر خالق نے انسانی افراد کو ایک دوسرے کا محتاج قرار دیدیا۔ تاکہ ایک دوسرے کے قریب رہ کر ملے جُلے۔ زندگی کی ناؤ کو آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ اور اسی بنا پر نقدی کے ایجاد کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کیونکہ اگر ایک کے پاس غلّہ ضرورت سے وافر موجود ہے۔ اور دوسرے کے ہاں کپڑا زائد از ضرورت ہے تو ہر شخص اپنے پاس کی زائد چیز دے کر دوسرے سے حسب ضرورت اُس کی زائد از ضرورت شے کے لینے کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ اندازہ کرنا کہ کتنی شے اس کو دے کر اس کی کتنی مقدار کی چیز وصول کرنی چاہیئے۔ مشکل تھا بس سوچ بچار کے بعد ایک تیسری چیز ایجاد کی گئی جس کا نام نقدی ہے اور اس کو اشیا کے باہمی تبادلہ کا معیار قرار دے دیا گیا تاکہ ہر شئ کے افادی اور ضروری پہلوؤں کے پیش نظر نقدی کے ذریعے سے اس کی قیمت کا اندازہ مقرر کر لیا جائے۔ اور بعد میں اسی مناسبت سے اشیاء کا باہمی لین دین عمل میں لایا جائے۔ (ہم نے اس مطلب کو تفسیر کی تیسری جلد ص۵۱ میں وضاحت سے بیان کیا ہے) بہر کیف تقاضائے فطرت اور فیصلۂ عقل کے ماتحت تمدن جبھی برقرار رہ سکتا ہے کہ دنیا کی ضروری اشیاء اور خدائے قدوس کی نعماتِ متکاثرہ ادل بدل ہو کر تمام انسانی نفوس کے لئے حسب ضرورت محل انتفاع و استفادہ بنتی رہیں۔ اور کوئی فرد بشر اپنی بقاء اور ارتقا میں اسباب کی بندش اور صعوبت کا شکوہ نہ کر سکے۔

وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ

اور مسکینوں اور اس پر کام کرنے والوں اور وہ جن کے دلوں کو مائل باسلام کرنا مطلوب ہو اور غلاموں کی آزادی اور قرضداروں

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اور خوشنودیٔ خدا کے راستوں اور مسافروں کے لئے ہیں یہ فریضہ ہے اللہ سے اور اللہ علیم و دانا ہے

چونکہ خداوند حکیم نے اپنی حکمت کاملہ اور تدبیر تامہ کے ماتحت انسان میں جذبۂ خواہش اور شہوت بھی پیدا کر دیا ہے۔ جس کے ماتحت ہر انسان اپنی ہر محبوب اور فائدہ مند چیز کو اپنی طرف کھینچنے کے درپے ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اسباب کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے مقصد کے آگے حائل شدہ ہر رکاوٹ کو ہر ممکن کوشش سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر نعمت سے مجھے زیادہ سے زیادہ انتفاع کا موقعہ دستیاب ہو۔ بنابریں نفس پرستی کا یہ جذبہ اُسے دوسروں کے کچلنے اور روندنے پر بھی آمادہ کر دیتا ہے۔ پس اپنی برتری اور فوقیت کی برقراری کی خاطر ہر جائز اور ناجائز حیلہ سے دوسروں کو زیر کرنا اور اُن کو کمزور کرنا اور اپنا دستِ نگر بنانا اسی جذبہ کا ہی شاخسانہ ہے۔ اور یہی جذبہ بعض اوقات جہاں دوسروں کے لئے قتل و غارت۔ لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تعدی کا موجب بنتا ہے۔ وہاں اپنی ذات میں حسد۔ بغض۔ کینہ۔ عداوت اور رنج بلکہ ہر انصاف سوز اور عدل کش خیالات کے جنم کا باعث ہوتا ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح بلکہ اظہر من الشمس ہے کہ ہر شخص کی اس سلسلہ میں جدوجہد کا بار آور ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ ہر کوشش منتہا کو پہنچتی ہے۔ علاوہ بریں طبعی و جبلی اور مزاجی و فطری تفاوت بھی تمام کوششوں کے نتیجہ خیز ہونے کے منافی ہے۔ بنابریں افرادِ انسانی میں غریب و امیر اور متمول و نادار کا فرق ضروری ہے۔ اور اسی سے احساس کمتری اور احساس برتری کے جذبات نمودار ہوتے اور شریف و رذیل نیز نیک و بد بلکہ دوست و دشمن وغیرہ جیسے الگ الگ خصوصیات و عادات افراد انسانی میں جگہ لیتے چلے گئے۔

اس مقام پر اگر بحث کو آگے بڑھایا جائے تو موضوع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لہذا اسے ایک تمہید قرار دے کر ہم اصل مقصد کو واضح کرتے ہیں کہ خدا نے جب زمین کی پیداوار سے انتفاع حاصل کرنا تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر جائز اور حلال قرار دیا ہے۔ اور تمدنی زندگی میں فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان نعماتِ خداوندی سے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھائے پس جن لوگوں کی مساعی پیہم ناکارہ رہیں۔ اور وہ حسبِ ضرورت نعماتِ خداوندی سے انتفاع کے لئے خود اپنے کفیل نہ بن سکے۔ یا کمزوریٔ اعضا نے انہیں تحصیل ضروریات سے عاجز بنا دیا۔ یا کسی وجہ سے ان کے اسبابِ جدوجہد مفلوج ہو کر رہ گئے۔ تو ان کے حق زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے خدائے بزرگ و برتر نے اپنے خوانِ نعمت پر حاضر ہونے والے دوسرے اربابِ طاقت و قوت کو دعوت دی کہ میری نعمات کا شکر تم پر واجب ہے۔ اور اس شکر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ

تم نادار اور غریب طبقہ پر رحم کرو۔ اور زندگی کی راہ میں اُن کے سامنے حائل شدہ رکاوٹوں کو دُور کرنے کی طرف قدم بڑھاؤ اور ساتھ ساتھ اُن کو زیادتی نعمت کی پیش کش بھی کر دی۔ اور فرمایا لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔ (یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ نعمات عطا کروں گا) تاکہ زیادتی کی توقع کا حرص اس بخل کو ختم کر دے جو سخاوت کی وجہ سے مالی کمزوری کے احساس کی پیداوار ہے۔

نیز اسی جذبہ غرباء نوازی کو اَور بڑھانے کے لئے صدقہ کے فوائد و اثرات حسنہ اس قدر بیان فرمائے کہ انسان ان پر یقین رکھنے کے بعد ناممکن ہے کہ بخل کا تصوّر بھی کر سکے۔ مثلاً جب میدانِ محشر میں بے سروسامان پیش ہوگا۔ اَور خدا کے بھرے دربار میں حساب و کتاب کی نوبت آئے گی۔ اُس وقت غضب پروردگار سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف صدقہ ہی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ معصوم میں وارد ہے۔ دُوسرے مقام پر صدقہ کی اہمیّت کو واضح کرنے کے لئے حدیثِ قدسی میں ہے۔ اَلْمَالُ مَالِیْ وَالْفُقَرَاءُ عِيَالِیْ فَمَنْ بَخِلَ بِمَالِیْ عَلٰی عِيَالِیْ اُدْخِلُهُ النَّارَ وَلَا اُبَالِیْ (خدا فرماتا ہے مال سب میرا ہے۔ اور فقراء میری عیال ہیں۔ تو جو شخص میرے مال کا میری عیال پر خرچ کرنے سے بخل کرے گا اُس کو جہنم میں داخل کروں گا۔ اور اُس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ بہرکیف صدقہ کی ترویج اور غرباء پروری کے رجحان کو بڑھانے کے لئے کہیں صدقہ کو زیادتی نعمت کا موجب قرار دیا گیا۔ کہیں تخفیفِ غضب پروردگار کا سبب بتلایا گیا۔ کسی جگہ نہ دینے والے کو جہنم کی دھمکی دی۔ کسی مقام پر حفاظت جان و مال کا ضامن قرار دیا۔ کہیں استجابت دعا کا سبب ٹھہرایا۔ کہیں مشکل و مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا زینہ مقرر کیا۔ کسی مقام پر اپنی رضامندی اور جنّت کی پیش کش کی۔ اور کئی مقامات پر ایک کا بدلہ دس یا ستر یا ہزار یا لاکھ یا اَن گنت دینے کا وعدہ فرمایا۔ تاکہ نعماتِ پروردگار اَور ضروریاتِ زندگانی انسان کسی ایک فرد یا ایک طبقہ تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ ہر فرد بشر بقدر ضرورت فائدہ حاصل کر سکے۔

پھر واجب صدقہ کے علاوہ مستحب صدقات جگہ جگہ دینے کا حکم دیا۔ مثلاً تعمیرِ مکان کے لئے شادی کے بعد سفر سے پہلے بلکہ ہر اچھے کام کی ابتداء کے لئے تاکہ وہ بابرکت ثابت ہو۔ علاوہ ازیں نذر، نیاز، ہدیے، کفارے اور قربانیاں وغیرہ ایک لمبی فہرست ہے۔ جس سے شریعت اسلامیہ کے نقطۂ نظر کی خوب وضاحت ملتی ہے کہ خدائے منافع دنیاویہ میں تمام انسانی افراد کو حق دے رکھا ہے اور اپنے مال سے حقوقِ واجبہ مثلاً خمس۔ زکوٰۃ۔ فطرہ یا نذر فدیہ و کفارہ وغیرہ اس مقصد کی بولتی ہوئی زبان ہے کہ خداوند کریم نہیں چاہتا کہ مال و دولت ایک جگہ محبوس و مقید ہو کر رہ جائے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ چلتی پھرتی رہے اور ہر آدمی اُس سے منتفع ہونے کا موقع حاصل کر سکے۔ اِسی بنا پر خزانہ کرنا مذموم قرار دیا گیا ہے۔ اور سخاوت کو ایک خصلتِ حمیدہ کا درجہ قرار دیا گیا ہے۔

دفعِ اشتباہ۔ میرے اس بیان سے وجوب زکوٰۃ کی مصلحت و افادیت پر جامع طور پر روشنی ڈالی جا چکی ہے لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ مالدار اور صاحبانِ زر سے ان کے اموال و دولت چھین کر برابر فقراء پر تقسیم کر دی جائے تاکہ امیر و

غریب کا دنیا میں فرق ہی نہ رہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اُمراء اور مالدار طبقہ جو نعماتِ خداوندی سے بدرجۂ اتم اور بحدِ کمال انتفاع حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنے پُورے اور کھلے اخراجات کے بعد بھی ان کے پاس دولت کی فراوانی رہتی ہے تو اس صورت میں وہ خدا کا شکر کریں۔ بایں طور کہ جو لوگ دنیا میں بے بس اور مفلوک الحال زندگی بسر کر رہے ہیں اُن کی خبرگیری کریں۔ اور اپنے برابر نہیں بلکہ اس قدر کہ وہ اپنی زندگی باعزت گذار سکیں۔ اور فاقوں مرنے والے کم از کم پیٹ بھر کر کھانے کو ترسیں۔ اسی وجہ سے چالیسواں یا بعض مقامات پر سو میں سے ۵ یا دس کا ایک حصہ ان کے لئے مقرر فرمایا۔ تاکہ امیر اپنی حیثیت سے زندگی بسر کر سکے۔ اور غریب اپنی حیثیت سے زندہ رہ سکے۔ اس میں نہ ظلم لازم آتا ہے۔ اور نہ کمیونزم کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک بین بین اور سیدھا راستہ ہے جس کو عقلِ سلیم آسانی سے قبول کر سکتی ہے۔

چند احادیث۔ مناسب ہے کہ اس ذیل میں معصومینؑ کے چند فرمان پیش کئے جائیں تاکہ ایمان میں تازگی پیدا ہو جائے۔

(۱) امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ میرے نزدیک ایک حج کرنا محبوب تر ہے ایک غلام آزاد کرنے دو غلام آزاد کرنے بلکہ دس غلام اور اننے اور پھر اور۔ اور حتیٰ کہ فرمایا ستر غلام آزاد کرنے سے۔ لیکن اگر ایک مومن بھوکے گھرانے کو پیٹ بھر کھانا کھلاؤں۔ اور اُن کے برہنہ کو لباس دے دوں۔ اور اُن کے چہروں کو گداگری کی ذلت سے بچالوں تو مجھے ایک حج سے دو حجوں سے حتیٰ کہ ستر حجوں سے محبوب تر ہے۔

(۲) امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا۔ اپنے بیماروں کا صدقہ سے علاج کرو۔ مصائب کو دعاؤں سے دفع کرو۔ اور رزق کو صدقہ کے ذریعے سے طلب کرو کہ وہ (صدقہ) اس (رزق) کو سات سو شیطانوں کے پنجہ سے چھڑالاتا ہے۔ اور مومن کو صدقہ دینا جس طرح شیطان پر گراں ہے اسی طرح اور کوئی چیز اس پر گراں نہیں ہے۔ اور صدقہ بندہ (مستحق) سے پہلے خدا کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

(۳) جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ صدقہ بُری موت کو دُور کرتا ہے (یہ روایات کافی سے منقول ہیں)

(۴) بروایت شیخ امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ خداوند کریم نے سوائے صدقہ کے ہر چیز کے الگ خازن مقرر فرمائے ہیں لیکن صدقہ کو وہ خود لیتا ہے۔ اور میرے والد ماجد کا دستور تھا کہ صدقہ سائل کے ہاتھ پر رکھ کر ایک دفعہ واپس لیتے تھے اور اس کو بوسہ دے کر دوبارہ سائل کے ہاتھ میں پلٹا دیتے تھے۔ نیز رات کو (خفیہ) صدقہ دینا غضب پروردگار کو بجھاتا ہے۔ اور بہت بڑے گناہ کو مٹاتا ہے۔ اور حساب کی آسانی کا موجب ہے۔ اور دن کو صدقہ دینا یعنی اعلانیہ صدقہ مال کو بڑھاتا اور عمر کو زیادہ کرتا ہے۔

(۵) بروایت کافی امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا جو زکوٰۃ کا ایک قیراط (کم از کم مقدار) نہ ادا کرے وہ نہ مومن ہے نہ مسلم۔

(۶) ایک روایت میں آپ نے فرمایا جو ایک قیراط بھی زکوٰۃ نہ دے وہ چاہے یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی ہو کر مرے۔

(۷) فقیہ کی ایک روایت میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا۔ اے علیؑ اس

امت کے دس قسم کے لوگ کفر کے مرتکب ہوں گے۔ اور ان میں سے ایک وہ ہے جو زکوٰۃ نہ ادا کرے۔ نیز آٹھ قسم کے لوگ ہیں۔ جن کی دعا مقبول نہیں ہوتی۔ اور ان میں سے ایک تارک الزکوٰۃ ہے۔ الحدیث

(۸) بروایت فقیہ و کافی امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام سے منقول ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب فقراء کا پیٹ بھرنے اور امراء کا رزق بڑھانے کے لئے ہے۔

(۹) کافی سے بروایت امام رضا علیہ السّلام امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خداوند کریم نے ایک ہزار سے پچیس (چالیسواں حصّہ) زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ اتنی مقدار فقراء کے گذارہ کے لئے کافی ہے۔ اگر لوگ اتنا ہی حصہ زکوٰۃ ادا کرتے تو کوئی محتاج نہ رہتا۔

(۱۰) بروایت فقیہ امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب امیر و غنی طبقہ کے امتحان اور فقراء طبقہ کی اعانت کے لئے ہے۔ اگر لوگ اپنے مالوں سے زکوٰۃ ادا کرتے تو کوئی فقیر و محتاج نہ رہتا۔ اور زکوٰۃ کی مفروضہ مقدار سے ہی سب لوگ غنی ہو جاتے۔ اور لوگوں کا فقر و احتیاج اور بھوک و ننگ صرف امراء و مالدار طبقہ کے گناہ کا نتیجہ ہے۔ (یعنی وہ اپنا فرض ادا کرتے تو ایسا نہ ہوتا) اور اللہ کے لئے سزاوار ہے کہ اس کا حق ادا نہ کرنے والے پر رحمت بند کر دے۔ اور مجھے خدا کی قسم جس نے مخلوق کو پیدا کیا اور رزق کو عام کیا کہ خشکی یا تری میں جہاں بھی کوئی مال تلف ہوتا ہے وہ صرف زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی کہیں بھی کوئی شکار دام صیاد میں نہیں آتا جب تک کہ اپنی تسبیح کو ترک نہ کر دے۔ خواہ خشکی میں ہو خواہ تری میں ہو۔ اور خدا کا محبوب ترین انسان وہی ہے جو سخی ہو۔ اور سخی ترین انسان وہ ہے جو زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔ اور اپنے قرض کی ادائیگی میں مومنین پر بخل نہ کرتا ہو۔

شرائط وجوب زکوٰۃ۔ پانچ شرطوں سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

پہلی شرط۔ بالغ ہونا۔ پس نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ جیسا کہ اکثر احادیث میں صراحت سے وارد ہے کہ یتیم کے مال میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور مقتضائے اصل بھی یہی ہے کیونکہ وہ مکلف نہیں۔

مسئلہ:۔ لڑکا جب بالغ ہوگا تو اس کے مال کا سال شروع ہوگا۔ اور اختتام سال پر بشرط نصاب اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ اگر گیارہ ماہ مال پر گذرے اور بارھویں مہینہ میں وہ بالغ ہو گیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مسئلہ:۔ نابالغ کے مال سے اگر اس کا ولی تجارت کرے تو نفع نابالغ کا ہوگا۔ اور اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی مستحب ہوگی۔

مسئلہ:۔ اگر بچے کا ولی مالدار ہو۔ اور بچے کا مال بطور قرض اپنے ذمہ لے کر اس سے تجارت کرے تو نفع بھی اس کا ہوگا۔ اور زکوٰۃ بھی استحباباً اُسی پر عائد ہوگی۔

مسئلہ۔ اگر ولی مالدار نہ ہو تو بچّے کے مال کو بطور قرض لے کر تجارت نہیں کر سکتا۔ اور اگر ایسا کرے تو بصورت خسارہ ضامن ہوگا۔ اور بصورت نفع اس کو کچھ نہ ملے گا بلکہ نفع بھی بچے کا ہوگا۔ اور بچے کے مال کو قرض لینے کے لئے ولی کے مالدار

ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ بصورت تلف بچے کے مال کی اپنے ذاتی مال سے تلافی کر سکے۔

مسئلہ۔ بچے کا باپ اور دادا اگر ولی ہوں تو بلا شرط بچے کے مال کو اپنے ذمہ کر کے اس سے تجارت کر سکتے ہیں۔

دوسری شرط۔ عاقل ہونا۔ پس دیوانے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

اگر جنون دائمی ہو تو زکوٰۃ کے واجب نہ ہونے میں کوئی اشکال نہیں، لیکن اگر جنون کا دورہ پڑتا ہو تو ظاہر یہی ہے۔ کہ جن چیزوں میں زکوٰۃ کے لئے سال کی شرط ہے۔ اُن چیزوں کی زکوٰۃ اُس پر واجب نہ ہوگی۔ اگر دوران سال میں جنون کا دورہ پڑ جائے لیکن زکوٰۃ غلات میں اگر بوقت وجوب مجنون نہ ہو بلکہ عاقل ہو تو اُس پر زکوٰۃ کا وجوب عائد ہوگا۔

تیسری شرط۔ آزاد ہونا۔ پس غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوا کرتی۔

چوتھی شرط۔ مالک نصاب ہونا۔ اگر دو شخص مل کر مالک نصاب بنیں تو ان دونوں میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

پانچویں شرط۔ تصرف کر سکنا۔ پس اگر نصاب کا مالک ہو لیکن غاصب یا ظالم یا چور و ڈاکو کی وجہ سے اپنے مال میں تصرف نہ کر سکتا ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی کو قرضہ دیا ہو۔ اور واپس نہ مل رہا ہو تو تا واپسی قرض اُس پر زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا لیکن جب واپس ہوگا تو زکوٰۃ فوراً واجب نہ ہوگی بلکہ سال گذرنے کے بعد تک نصاب کی بحالی کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئلہ۔ اگر قرضدار قرضہ واپس کرنے پر تیار ہو لیکن قرض خواہ وصول کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہو تو باقی شرائط کے ساتھ اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئلہ۔ مال وقف پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ کیونکہ وجوب زکوٰۃ میں ملک شرط ہے اور وقف کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔

مسئلہ۔ مستحق تک سرِ دست پہنچا سکنا وجوب زکوٰۃ کی شرط نہیں ہے۔ پس اگر سرِ دست مستحق نہ بھی مل سکتا ہو۔ تب بھی زکوٰۃ اُس پر واجب ہوگی۔ ہاں اگر مستحق موجود ہو۔ اور عمداً اُس کو دینے میں تاخیر کرے گا تو بصورت تلف دوبارہ اپنی گرہ سے ادا کرنے کا ضامن ہوگا۔ لیکن مستحق کی عدم موجودگی کی صورت میں اس کی تاخیر موجب ضمان نہ ہوگی۔ بشرطیکہ اس کی اپنی کوتاہی نہ ہو۔

زکوٰۃ کون کون سی چیزوں پر واجب ہوتی ہے؟

زکوٰۃ کل نو چیزوں پر واجب ہوتی ہے (۱) اونٹ (۲) گائے بھینس (۳) بھیڑ بکری (۴) گندم (۵) جو (۶) خرما (۷) انگور (۸) سونا (۹) چاندی۔ ان کے علاوہ اور کسی چیز پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اونٹ کی زکوٰۃ کا نصاب

اونٹ کی زکوٰۃ کے بارہ نصاب ہیں۔ اور ان کی تفصیل کے لئے ایک روایت بیان کر دی جاتی ہے۔ بروایت من لا یحضرہ الفقیہ۔ صحیحہ زرارہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پانچ سے کم اونٹوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں لیکن جب پانچ ہو جائیں تو اس کی زکوٰۃ ایک بکری ہوگی۔ پھر جب دس ہو جائیں تو دو بکریاں۔ اور اسی طرح ۱۴ تک۔ پھر پندرہ سے ۱۹ تک ۳ بکریاں۔ پھر بیس سے چوبیس تک ۴ بکریاں اور پچیس پر پانچ بکریاں۔ پھر ۲۶ سے ۳۵ تک ایک بنت مخاض۔ اگر بنت مخاض نہ ہو تو ابن لبون دے دے۔ پھر ۳۶ سے ۴۵ تک ایک

بنت لبون اس کے بعد ۴۶[ہشتم] سے ۶۰ تک ایک حقہ پھر ۶۱[۹] سے ۷۵ تک ایک جذعہ۔ پھر ۷۶[۱۰] سے ۹۰ تک دو بنت لبون۔ پھر ۹۱[۱۱] سے ۱۲۰ تک دو حقے اور[۱۲] اس سے اگر بڑھ جائے تو ہر پچاس پر ایک حقہ اور ہر چالیس پر ایک بنت لبون زکوٰۃ ہوگی۔ مثلاً ۱۲۱ پر چالیس کے حساب سے ۳ بنت لبون ہوں گی۔ اور ۱۲۹ تک یہی صورت رہے گی جب ۱۳۰ ہونگے تو ۲ بنت لبون چالیس چالیس کے حساب سے اور ایک حقہ پچاس کے حساب سے زکوٰۃ بنے گی اور ۱۳۹ تک یہی صورت رہے گی پھر ۱۴۰ پر دو حقے پچاس پچاس کے حساب سے اور ایک بنت لبون چالیس کے حساب سے ہوگی اور ۱۴۹ تک یہی صورت ہوگی پھر ۱۵۰ پر تین حقے اور ۱۶۰ پر چار بنت لبون وعلیٰ ہذا القیاس اور وہ عدد جو پچاس اور چالیس دونوں پر صحیح تقسیم ہوتا ہو مثلاً دو سو تو ایسی صورت میں مالک کو اختیار ہے کہ پچاس کی تقسیم کا لحاظ کر کے چار حقے دیدے یا چالیس کی تقسیم کے حساب سے پانچ بنت لبون دیدے

توضیحات

(۱) اونٹ کا بچہ جب دوسرے سال میں داخل ہو تو نر کو ابن مخاض اور مادہ کو بنت مخاض کہا جاتا ہے۔ اور جب وہ دو سال پورے کر کے تیسرے سال میں داخل ہو تو نر کو ابن لبون اور مادہ کو بنت لبون کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب چوتھے سال میں داخل ہو تو اس کو حقہ کہتے ہیں۔ اور پانچویں سال میں داخل ہونے والے کو جذعہ کہتے ہیں۔

۲۔ بارہ نصاب یعنی ۵۔ ۱۰۔ ۱۵۔ ۲۰۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۳۶۔ ۴۶۔ ۶۱۔ ۷۶۔ ۹۱۔ ۱۲۱ ہیں۔ پس پہلے نصاب سے پہلے اور ہر دو نصابوں کے درمیان معافی ہے۔

۳۔ بروایت کافی حضرت امیر المومنین علیہ السّلام نے زکوٰۃ وصول کرنے والے اپنے کارندے کو ایک حکم نامہ میں لکھا کہ جس مالدار پر زکوٰۃ میں جذعہ (چھ سالہ) واجب ہو لیکن مال میں جذعہ کوئی موجود نہ ہو بلکہ حقہ (پنجسالہ) موجود ہو تو اس سے حقہ لے لو۔ اور علاوہ دو بکریاں یا بیس درہم بھی لو۔ لیکن اگر اس پر حقہ واجب ہو۔ اور حقہ کی بجائے اس کے پاس جذعہ موجود ہو تو جذعہ لے کر اس کو دو بکریاں یا بیس درہم واپس کرو۔ اسی طرح حقے کی بجائے بنت لبون لو تو دو بکریاں یا بیس درہم بھی زائد لو۔ اور بنت مخاض کی جگہ اگر بنت لبون لو تو دو بکریاں یا بیس درہم واپس کرو۔ یعنی ایک سال کا تفاوت شرعی نقطہ نظر سے دو بکریوں یا بیس درہم کے برابر ہے۔

(۴) نر اور مادہ میں عمر کا فرق اسی سابق حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بنت مخاض کی جگہ ابن لبون لیا جا سکتا ہے یعنی ایک سال کی مادہ ایک سال زیادہ کے نر کے ساتھ قیمت میں برابر قرار دی گئی ہے۔

(۵) تفاوت کی صورت میں بیس درہم یا دو بکریوں میں سے مالک جو چاہے چن لے۔ یہ چناؤ زکوٰۃ لینے والا نہیں کر سکتا۔ خواہ بازاری قیمت اس کے برابر ہو یا کم و بیش ہو۔

(۶) زکوٰۃ میں ادا ہونے والے جانور کے اگر متعدد افراد ہوں مثلاً اس پر بنت لبون واجب ہے۔ اور اس کے پاس بنت لبون متعدد ہوں تو مالک کو اختیار ہے جو چاہے دے دے۔ امام کے نمائندے یا فقیر کو جھگڑا کرنے کا کوئی حق نہیں اور حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے اس کا طریقہ یہ وارد ہے کہ اگر زیادہ ہیں تو دو حصے کر کے مالک کو کہے۔ اپنا حق چن لو۔ پھر باقی کے دو حصے کر کے چناؤ مالک پر چھوڑ دے اور اس طرح کرتا رہے۔ حتیٰ کہ آخر میں حق زکوٰۃ بچ جائے۔ پس وہ لے لے۔

گائے بھینس کی زکوٰۃ کا نصاب — تمام علمائے امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ گائے بھینس کی زکوٰۃ کے دو نصاب ہیں۔

پہلا نصاب تیس ہے۔ اور اس پر ایک تبیع یا تبیعہ دینا واجب ہے۔ اور دوسرا نصاب چالیس ہے۔ اور اس پر ایک مسنّہ واجب ہے۔ تبیع وہ گائے کا بچّہ جو دوسرے سال میں داخل ہو۔ نر کو تبیع اور مادہ کو تبیعہ کہا جاتا ہے۔ اور مسنّہ وہ جو تیسرے سال میں داخل ہو۔

مسئلہ۔ تیس سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اور نہ تیس اور چالیس کے درمیان زکوٰۃ ہے۔

مسئلہ۔ گائے بھینسوں کی زکوٰۃ ہمیشہ اسی طریقہ سے چلے گی کہ ہر عدد میں تیس یا چالیس کی تقسیم کا حساب کیا جائے گا۔ اور اسی اعتبار سے زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ مثلاً چالیس سے ساٹھ تک معاف ہے۔ اور ساٹھ پر دو تبیع واجب ہوں گے۔ اور ستر پر ایک تبیع اور ایک مسنّہ واجب ہوگا۔ کیونکہ چالیس کے حساب سے ایک مُسنّہ اور تیس کے حساب سے ایک تبیع بنتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

بھیڑ بکری کی زکوٰۃ کا نصاب

بھیڑ بکری کی زکوٰۃ کے پانچ نصاب مشہور ہیں۔ جس طرح کہ ایک روایت صحیحہ میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السّلام سے منقول ہے کہ چالیس سے کم پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ جب چالیس ہو جائیں تو ایک زکوٰۃ میں دے دے۔ اس کے بعد ۱۲۰ تک یہی صورت رہے گی جب ۱۲۱ ہو جائیں تو دو زکوٰۃ میں دیگا پھر دو سو تک یہی فریضہ رہیگا اور جب ۲۰۱ ہونگی تو تین زکوٰۃ میں دیگا اور تین سو تک یہی صورت رہے گی۔ اور جب ۳۰۱ ہو جائیں تو چار دینی پڑیں گی۔ اور چار سو تک اسی نصاب کے ماتحت زکوٰۃ ہوگی۔ پس جب ۴۰۰ ہو جائیں تو وہ سابق حساب ختم ہوگا اور اب ہر سو پر ایک بکری واجب ہوگی۔

توضیحات

۱۔ پانچ نصاب اس طرح ہوئے۔ (۱) ۴۰ (۲) ۱۲۱ (۳) ۲۰۱ (۴) ۳۰۱ (۵) ۴۰۰۔ پس پہلے نصاب سے پہلے اور ہر دو نصابوں کے درمیان کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

۲۔ بھیڑ یا بکری جو اونٹوں کی زکوٰۃ میں دی جائے۔ یا اپنی جنس سے ادا کی جائے۔ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اگر بھیڑ دے تو سات مہینہ کی یا اس سے زیادہ کی ہو۔ اور اگر بکری دے تو کم از کم ایک برس سے زیادہ ہو۔

۳۔ تندرست مال میں سے بیمار یا جوانوں میں سے بوڑھی۔ یا موٹی تازیوں میں سے کمزور۔ یا بے عیبوں میں سے عیب دار کو زکوٰۃ میں نہ لیا جائے گا۔ ہاں اگر سب مال ایک جیسا بیمار یا کمزور یا عیب دار ہو تو ان میں سے ان جیسی زکوٰۃ میں قبول کی جائے گی۔ اور اگر مال میں بیمار و تندرست اور عیب دار و بے عیب وغیرہ ملے جلے ہوں تو نسبت سے زکوٰۃ نکالی جائے۔

۴۔ حیوانوں کی زکوٰۃ میں فحل (جو مادہ کو حاملہ کرتا ہے) کھانے کے لئے پالتو اور شیر دار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۵۔ اونٹ کی ہر نسل ایک ہی جنس شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا وجوب زکوٰۃ کی صورت میں جس نسل سے ادا کیا جائے گا ٹھیک ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اعلیٰ اور ادنیٰ نسل میں سے اپنی اپنی نسبت کا لحاظ رکھنا بہتر ہے۔ اور بھیڑ اور بکری میں بھی قیمت کے اختلاف کی صورت میں ہر ایک جنس کی الگ نسبت سے زکوٰۃ کا ادا کرنا بہتر ہے۔

۶۔ غلہ کی زکوٰۃ میں تو عین کی بجائے قیمت وقت کا ادا کرنا بھی جائز ہے لیکن حیوانوں کی زکوٰۃ میں بھی آیا قیمت کا دینا

جائز ہے جب کہ عین سے زکوٰۃ کا ادا کرنا ممکن ہو تو اس بارے میں علماء امامیہ کے دو قول ہیں۔ شیخ طوسی اعلی اللہ مقامہ نے جواز کا قول اختیار فرمایا ہے۔ اور یہی قول قوی معلوم ہوتا ہے۔

حیوانات میں وجوبِ زکوٰۃ کے شرائط

حیوانوں میں وجوبِ زکوٰۃ کی چار شرطیں ہیں۔

۱۔ نصاب۔ اس کا بیان ابھی ابھی مفصل گذر چکا ہے۔

۲۔ سال۔ یعنی سال برابر نصاب مالک کے پاس موجود ہے۔ اور دورانِ سال میں کسی وقت کم نہ ہو۔ پس جب گیارہ ماہ گذریں گے۔ اور بارہواں مہینہ شروع ہوگا تو اس مال پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

۳۔ سوم۔ چرنا۔ یعنی سارا سال باہر چر کر پیٹ بھریں۔ ورنہ اگر سال کا کچھ حصہ چریں۔ اور کچھ حصہ مالک کے ہاں سے گھاس پر ان کا گذارا ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ البتہ دورانِ سال میں کسی ایک یا دو دن بوجہ بارش کے اگر چرائی نہ ہو سکے۔ اور مجبوراً ان کو گھر میں چارہ ڈالنا پڑے تو اس صورت میں زکوٰۃ معاف نہ ہوگی۔

۴۔ یہ کہ عوامل نہ ہوں۔ یعنی ان سے سال بھر کام کوئی نہ لیا جاتا ہو۔ اگر اونٹ سواری یا باربرداری کے ہوں یا بیل ہل جوتنے یا کنواں چلانے کے لئے رکھے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مسئلہ۔ حیوانات میں اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کے وجوب کی تین شرطیں ہیں۔

۱۔ **نصاب**۔ سونے کا نصاب بیس دینار ہے۔ اس میں نصف دینار زکوٰۃ ہوگی۔ اور اس کے بعد ہر چار دینار کے اضافہ سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور چاندی کا پہلا نصاب دو سو درہم ہے۔ اس میں پانچ درہم زکوٰۃ ہوگی۔ اور اس کے بعد ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکوٰۃ ہوتی جائے گی۔ پس اگر سونا اور چاندی اس مقدار سے کم ہوں تو زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

۲۔ **سال**۔ یعنی یہ نصاب سال برابر مالک کے پاس موجود رہے۔ اگر دورانِ سال میں کم ہو جائے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۳۔ **سکہ دار ہونا**۔ یعنی سونے اور چاندی پر زکوٰۃ تب واجب ہوگی۔ جب اس پر شاہی سکہ کی مہر ہو۔ پس زیورات پر یا مطلق اس سونا چاندی پر جو سکہ دار نہ ہو۔ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ خواہ کتنے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔

مسئلہ۔ اگر تین شرطوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہوئی تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مسئلہ۔ موجودہ دور میں جو نوٹ مروج ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ جس طرح کہ دوسری دھاتوں پر باوجود سکہ دار ہونے کے زکوٰۃ نہیں ہے۔ لہٰذا نوٹوں کا سونے یا چاندی سکہ دار پر قیاس کرنا باطل ہے۔

غلات یعنی گندم۔ جو۔ خرما اور انگوروں کی زکوٰۃ

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے کہ خداوند کریم نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کو مال میں واجب

کیا۔ اور جناب رسالت مآب ﷺ نے نو چیزوں میں اس کا وجوب بیان کیا۔ اور باقی چیزوں سے معاف فرمایا۔ اور وہ نو چیزیں یہ ہیں۔ سونا۔ چاندی۔ اونٹ۔ گائے۔ بکری۔ گندم۔ جو کھجور اور انگور ان کے علاوہ معاف ہے۔

نصاب زکوٰۃ غلّہ

پس گندم یا جو یا انگور یا خرما میں سے ہر ایک جنس پر زکوٰۃ تب واجب ہوگی۔ جب الگ الگ نصاب کو پہنچ جائیں ورنہ اگر مل جل کر نصاب بنیں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اور غلہ کی ان چاروں جنسوں کا نصاب پانچ وسق ہے۔ جب کہ ہر وسق ساٹھ صاع کا ہوا کرتا ہے۔ اور ایک صاع کا وزن چھ رطل مدنی اور ایک رطل کا وزن ۱۹۵ درہم اور ایک درہم اڑتالیس جو کے متوسط دانوں کے ہم وزن ہوا کرتا ہے۔ اور ہم نے اس کا صحیح وزن اس طرح معلوم کیا ہے۔ ۴۸ جو پاکستانی اوزان کی مقدار کے لحاظ سے ۲ ماشہ ۲ رتی بنتے ہیں۔ گویا ایک درہم بوزن پاکستان ۲ ماشہ ۲ رتی ہوا۔ پس ۱۹۵ کے ساتھ ضرب دینے سے رطل کا وزن سات چھٹانک ایک تولہ چھ ماشہ اور چھ رتی نکلا۔ پھر ۶ سے ضرب دے کر صاع کا وزن معلوم کیا جو ۲ سیر ۱۱ چھٹانک ۴ تولہ ۴ ماشہ ۴ رتی نکلا۔ اور اس کو ۶۰ کے ساتھ ضرب دی تو وسق کا وزن ۴ من ۴ سیر ۸ چھٹانک ۲ تولہ ۶ ماشہ نکلا۔ پس پانچ وسق جو نصاب زکوٰۃ ہے۔ بیس من بائیس سیر دس چھٹانک ۲ تولہ اور ۶ ماشہ ہوئے۔ گویا احتیاطاً ساڑھے بیس من کو نصاب زکوٰۃ سمجھنا چاہیئے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ ۔ جب گندم اور جَو کا دانہ قائم ہو جائے۔ اور انگور و خرما کے خوشوں پر عرفِ عام میں انگور اور خرما کا اطلاق کیا جا سکے۔ تو زکوٰۃ اس سے متعلق ہو جائے گی۔ بشرطیکہ نصاب کی حد کو پہنچ جائے۔ اگرچہ ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب ان کو صاف اور اکٹھا کیا جائے گا۔

مسئلہ ۔ جو شخص وقتِ وجوب سے قبل ان جنسوں کو فروخت یا ہبہ کر دے تو اس سے زکوٰۃ ساقط ہوگی۔ اور اُس پر واجب ہو جائے گی جو وقتِ وجوب سے پہلے مالک ہو جائے گا۔

مسئلہ ۔ بارش سیلاب اور دریا وغیرہ سے جن کی سیرابی ہو تو اس میں سے زکوٰۃ دسواں حصہ ہوگی۔ لیکن اگر کنواں نلکا اور ڈول وغیرہ سے سیرابی ہو تو زکوٰۃ بیسواں حصہ ہوگی۔

مسئلہ ۔ اگر بعض فصل بارانی اور بعض چاہی ہو تو مجموع کے نصاب تک پہنچ جانے کے بعد دسواں حصہ یا بیسواں حصّہ زکوٰۃ۔ بارانی یا چاہی فصل کی الگ الگ نسبت سے ہوگی۔ یعنی بارانی کا دسواں اور چاہی کا بیسواں حصہ زکوٰۃ ہوگی۔

مسئلہ ۔ اگر ایک ہی فصل چاہی اور بارانی یا نہری ہو تو نسبت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرے۔ لیکن اگر دونوں کا دخل برابر برابر ہو تو فصل کے برابر دو حصّے کر کے ایک نصف سے دسواں حصّہ اور دوسرے نصف سے بیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرے۔ مثلاً اگر چالیس من گندم ہوئی ہو تو تین من زکوٰۃ ہوگی۔ کیونکہ ایک نصف سے ایک من ہوگی۔ اور دوسرے نصف سے دو من نکلے گی۔

مسئلہ ۔ آج کل ٹیوب ویل کا زمانہ ہے۔ لہٰذا اگر ٹیوب ویل سے فصل ہوئی ہو تو اُسے چاہی فصل کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

مسئلہ۔ اکثر علمائے محققین کا یہ مسلک ہے کہ جنس زکوٰۃ پر زمانِ کاشت سے زمانِ برداشت تک جس قدر خرچہ ہوا ہے وہ سب زکوٰۃ سے مستثنےٰ ہوگا۔ حتی کہ مالیانہ آبیانہ و دیگر سرکاری مطالبات جن کا تعلق اسی فصل سے ہو زکوٰۃ سے مستثنےٰ ہوں گے۔

مسئلہ۔ آیا نصاب کا اعتبار مذکورہ بالا خرچہ نکالنے کے بعد ہوگا یا پہلے ؟ اس میں تین قول ہیں۔

۱۔ یہ کہ نصاب کا اعتبار پہلے ہوگا۔ پھر خرچہ نکال لینے کے بعد دسواں یا بیسواں حصّہ زکوٰۃ دی جائے گی۔ خواہ خرچہ نکال لینے کے بعد نصاب سے کم مقدار ہی بچ جائے۔

۲۔ یہ کہ خرچہ نکال لینے کے بعد نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر نصاب بچے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۳۔ زکوٰۃ کے تعلق اور وجوب سے پہلے کا خرچ نکال کر نصاب کا اعتبار ہوگا۔ یعنی گندم یا جو کا دانہ بننے سے پہلے جو خرچ ہوا مثلاً مالیہ۔ آبیانہ یا کاشت وغیرہ۔ ان کو نکالنے کے بعد اگر نصاب ہوگا تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ پھر کٹائی و صفائی کے اخراجات نکال کر ادا کر دی جائے گی۔ پہلا قول احتیاط کے قریب تر ہے۔ لہٰذا اسی پر ہی عمل کرنا مناسب و موزوں ہے۔

مسئلہ۔ زکوٰۃ جس طرح زمیندار پر واجب ہے۔ اسی طرح مزارع پر بھی واجب ہے جب کہ اس کا حصہ نصاب تک پہنچ جائے

مسئلہ۔ مزدور پیشہ لوگ جن کو اُجرت میں گندم دی جاتی ہے۔ مثلاً لوہار، ترکھان اور حجام وغیرہ تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اگرچہ نصاب کو پہنچ بھی جائے۔

مسئلہ۔ ٹھیکہ پر زمین کو حاصل کرنے والا مالک زمین سمجھا جائے گا۔ اور بعد از نصاب اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئلہ۔ اگر جنس کچھ عمدہ اور کچھ ناقص یا کچھ بلند قیمت اور کچھ کم قیمت ہو تو زکوٰۃ نسبت سے ادا کی جائے گی۔

مسئلہ۔ زکوٰۃ ادا کرنے والا عین ادا کرنے کی بجائے موجُودہ وقتی نرخ سے قیمت بھی ادا کر سکتا ہے۔

مسئلہ۔ مال تجارت اور چار مذکورہ جنسوں کے علاوہ زمین کی باقی پیداوار جو کیل و وزن رکھتی ہو۔ ان سب پر زکوٰۃ مستحب ہے

مستحقین زکوٰۃ

اس مقام تک زکوٰۃ کے متعلّق نہایت ضروری مسائل کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اب آیت مجیدہ کی شرح کی جاتی ہے جس میں زکوٰۃ کے مستحقین کا بیان ہے۔ آیت مجیدہ میں مستحقین کی آٹھ قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ فقراء ۲۔ مساکین ۳۔ عاملین ۴۔ مولفۃ القلوب ۵۔ غلام ۶۔ قرضدار ۷۔ خوشنودیٔ خدا کے طریقے ۸۔ مسافر۔

مسئلہ۔ فقیر اور مسکین کے درمیان فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ اور ان سے مُراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی اور اپنے واجب النفقہ افراد کی کفالت سے عاجز ہو۔ اور غنی کا مفہوم اس کے مقابلہ میں ہے کہ جو اپنی اور اپنے واجب النفقہ افراد کی کفالت خود کر سکتا ہو۔ خواہ بیک وقت سال کے مصارف اپنے پاس جمع رکھتا ہو۔ یا دورانِ سال میں اپنی کد و کد سے محنت کر کے عہدہ برا ہونے پر قادر ہو۔

مسئلہ۔ ہر شخص کی احتیاج کا اس کے شایانِ شان اندازہ کیا جائے گا۔ لہٰذا صاحبانِ مروّت و عزت کے پاس گھوڑے یا غلام کا ہونا استحقاق زکوٰۃ سے ان کو خارج نہیں کرتا جب کہ وہ اپنی شان کے مطابق خرچ نہ رکھتے ہوں۔ اسی طرح ذخیرۂ کتب و

مہمان خانہ یا اپنی وضع کے مطابق لباس پہننا منافیٔ استحقاق نہ ہوں گے۔

مسئلہ ۔ دورِ حاضر میں ترویجِ علومِ دینیہ کے پیشِ نظر مدارسِ دینیہ میں پڑھنے والے طلبہ اس سلسلہ میں زیادہ مستحق ہیں بلکہ مستحقین کی باقی اصناف سے ان کو سبقت حاصل ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت طالبانِ علومِ دینیہ کو ہی ترجیح دینا زیادہ مناسب ہے۔

مسئلہ ۔ اگر ایک شخص مستحقِ زکوٰۃ ہو۔ لیکن وہ زکوٰۃ لینے سے اپنی خفت محسوس کرتا ہو تو اس کو زکوٰۃ بعنوانِ ہدیہ یا اعانت دی جائے تو جائز ہے۔

مسئلہ ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت خیال کرنا چاہیئے کہ ہر مستحقِ زکوٰۃ کو شایانِ شان حصہ دیا جائے مثلاً صاحبانِ مروت، اور اربابِ علم کو ان کے شایانِ شان حصہ دے اور مستحقِ غیر سائل کو پیشہ ور گداگر پر ترجیح دے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

مسئلہ ۔ عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی پر حاکمِ شرع کی جانب سے متعین ہوتے ہیں۔ پس ان کو حاکمِ شرع اسی زکوٰۃ کی مد سے گذر اوقات عطا فرماتا ہے۔

مسئلہ ۔ مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام کی طرف راغب کرنے یا اسلام پر ان کو ثابت قدم کرنے کے لئے بیت المال سے کچھ دیا جاتا ہے۔

مسئلہ ۔ وہ کنیز و غلام جو سختی و شدت میں ہوں۔ ان کو آزاد کرانے کے لئے بھی ایک حصہ زکوٰۃ سے معین تھا جس کی اب ضرورت ہی نہیں ہے۔

مسئلہ ۔ مستحقِ زکوٰۃ کی چھٹی قسم مقروض لوگ ہیں۔ یعنی جنہوں نے اپنے جائز ضروری اخراجات کے لئے قرضہ اٹھایا ہو اور اس کی ادائیگی سے قاصر ہوں تو ایسے لوگوں کی زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد کی جاسکتی ہے۔

مسئلہ ۔ اگر ایک شخص کا کسی پر قرض ہو۔ اور جانتا ہو کہ مقروض قرضہ کی ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ مستحقِ زکوٰۃ بھی ہے۔ تو قرض خواہ اپنی زکوٰۃ مقروض کے قرضہ میں حساب کر سکتا ہے بلکہ اگر مقروض مر بھی جائے تب بھی قرض خواہ وہ قرضہ زکوٰۃ سے حساب کر سکتا ہے۔

مسئلہ ۔ زکوٰۃ کے مستحقین کی ساتویں قسم سبیل اللہ ہے۔ یعنی ہر وہ کام جو خوشنودیٔ خدا کا باعث ہو تو اس میں زکوٰۃ لگ سکتی ہے۔ پس مساجد، امام باڑے و مسافر خانے بلکہ رفاہِ عامہ کے لئے جملہ امور اس ضمن میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان سب میں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اس دورِ پُر آشوب میں مدارسِ دینیہ کی ترقی و توسیع۔ اور یہ وہ بنیادی ادارے ہیں جن کی بدولت دین اور دین والے دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ اور انہی کی بدولت زمین خدا کلمۂ حق سے معمور ہے۔ اور یہ وہ مراکز ہیں جن کا وجود ہر دشمنِ دین کی آنکھوں کا خار ہے۔ پس خیرات و صدقات کی جملہ رقوم زیادہ سے زیادہ انہی اداروں کے حوالہ کی جائے۔ تاکہ حفاظتِ مذہب کی یہ حصاریں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو کر ہر قسم کے مخالفت و شدید طوفان و تلاطم کا منہ موڑ سکنے میں کامیاب ہوں۔

مسئلہ ۔ مستحقین زکوٰۃ کی آٹھویں قسم ابن سبیل (مسافر) ہے۔ اور بعضوں نے اسے مہمان سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس سے مُراد وہ شخص ہے جو سفر میں اپنا زادِ راہ ختم کر چکا ہو۔ اور اعانت کا محتاج ہو۔ پس اس کو زکوٰۃ کے فنڈ سے دیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ اپنے وطن میں غنی ہی کیوں نہ ہو۔

مسئلہ ۔ زکوٰۃ کو مستحقین کی ان مذکورہ آٹھوں قسموں پر برابر تقسیم کرنا ضروری نہیں بلکہ حسب مصلحت کم و بیش دیا جا سکتا ہے نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ زکوٰۃ پوری آٹھ قسموں کو دی جائے بلکہ بعض قسموں کو بھی دی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک قسم اور اس میں سے ایک فرد کو بھی دی جا سکتی ہے۔

مستحقین زکوٰۃ کے اوصاف

آیت مجیدہ میں اگرچہ یہ پابندی نہیں کہ مستحقین کی شمار کردہ آٹھ صفتوں کے علاوہ کسی اور قید یا صفت کا اعتبار کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ خداوندی عطیہ ہے۔ لہٰذا اس کی حدود کا تعین ضروری ہے۔ مخلوق خدا ہونے میں تو سب انسان یکساں ہیں۔ لیکن بعض کے اموال میں سے دوسرے بعض کا حق مقرر کرنا اگر کسی استحقاقِ معنوی کی بنا پر نہ ہو بلکہ صرف ظاہری فقر و فاقہ کو ہی معیار قرار دیا جائے تو ایک ناقابلِ فہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور وہ استحقاقِ معنوی ہے ایمان۔ جیسا کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے فرامین بھی اسی بات پر شاہد ہیں۔

۱۔ صحیحہ برید عجلی ۔ کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک شخص کے متعلق سوال کیا کہ اس نے ولاءِ آلِ محمدؐ میں داخل ہونے سے پہلے حج کیا تھا۔ کیا وہ درست ہے تو آپ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اس کے سنّی زمانہ کے باقی تمام اعمال ٹھیک ہوں گے سوائے زکوٰۃ کے۔ پس زکوٰۃ اس کو دوبارہ ادا کرنی پڑے گی جو اُس نے اصل مستحقین کو نہیں دی تھی۔ کیونکہ وہ صرف ولاءِ آلِ محمدؐ رکھنے والوں کے لئے ہی ہے۔

۲۔ روایت ابوبصیر ۔ کہ اُس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا اگر ایک شخص کے رشتہ دار محتاج ہوں لیکن شیعہ نہ ہوں تو کیا ان کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ اگر ان کو دینا ہے تو زکوٰۃ کے مال کے علاوہ اپنی گرہ سے دے۔ زکوٰۃ کو اپنے مال کی آڑ نہ بنائے۔

۳۔ ایک روایت میں امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں نے اپنے والد بزرگوار سے سُنا۔ جب کہ میں بیٹھا تھا اور ایک شخص حاضرِ خدمت ہُوا پس اُس نے عرض کی کہ حضور میں اہل رَے سے ہوں۔ اور میرے پاس زکوٰۃ ہے۔ فرمائیے کس کو دُوں۔ تو آپ نے فرمایا۔ ہمیں دے دیجئے۔ اُس نے عرض کی کہ حضور صدقہ تو آپ پر حرام ہے۔ آپ نے فرمایا۔ جب تو ہمارے شیعوں کو دے گا تو گویا تو نے ہمیں دی۔ اُس نے عرض کی۔ مجھے وہ نہیں مل سکتے تو آپ نے فرمایا۔ ایک سال تک انتظار کر۔ اس نے عرض کی۔ اگر پھر بھی نہ ملیں۔ آپ نے فرمایا۔ دو سال تک انتظار کر۔ حتیٰ کہ چار سال تک انتظار کا حکم دیا اور اگر پھر بھی نہ مل سکے تو ان کو تھیلیوں میں بند کر کے دریا میں پھینک دو۔ کیونکہ خداوند کریم نے ہمارے اور ہمارے شیعوں کے مال ہمارے دشمنوں پر حرام کئے ہیں (حدائق)

دوسری شرط:۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ مستحق زکوٰۃ وہ ہے جس میں عدالت پائی جائے اور بعض نے صرف گناہان کبیرہ کے ترک کو شرط قرار دیا ہے۔ اور روایت میں صرف شرابی کو زکوٰۃ نہ دینا وارد ہے۔ بہرکیف زکوٰۃ ادا کرنے والا اپنی جانب سے کوشش کرے کہ ایسی جگہ اس کا پیسہ جائے جہاں زیادہ سے زیادہ بہتر و موزوں جگہ پر صرف کیا جا سکے۔

تیسری شرط۔ زکوٰۃ اس کو دی جا سکتی ہے جو زکوٰۃ دینے والے کے واجب النفقہ افراد میں سے نہ ہو۔ پس زوجہ و اولاد پر زکوٰۃ نہیں صرف کی جا سکتی۔ اور اسی طرح اولاد کی زکوٰۃ ماں باپ پر بھی نہیں صرف ہو سکتی۔

مسئلہ۔ متعہ والی عورت کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ واجب النفقہ نہیں ہوتی۔

مسئلہ۔ زوجہ پر اگر زکوٰۃ واجب ہو۔ اور شوہر مستحق ہو تو وہ اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔

مسئلہ۔ جن رشتہ داروں کی واجب النفقہ ہونے کے علاوہ کفالت و تربیت کرتا ہو۔ ان کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

چوتھی شرط:۔ غیر سید کی زکوٰۃ سید نہیں لے سکتا۔ اور سید کی زکوٰۃ سید و غیر سید سب لے سکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں زکوٰۃ بہترین مصرف

اس زمانہ میں جب کہ مغربیت اور لادینی کے رجحان کے ہمہ گیر سیلاب نے تمام دنیا والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور اسلام کے شیدائی کہلانے والے افراد بھی اس تاثر کے نتیجہ میں اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہونا گوارا نہیں کرتے۔ اور دین صرف ان لوگوں کی جاگیر بن کر رہ گیا ہے۔ جو غربت و افلاس کی بدولت مغربیت کی رنگ رلیوں میں دلچسپی نہیں لے سکتے۔ تو ایسے پُرآشوب زمانہ میں مدارس دینیہ کی اہمیت کا اندازہ کرنا نہایت آسان ہے۔ اور یہی وہ مراکز ہیں جو دین و اسلام پر ہر قسم کے حملہ کا منہ توڑ جواب مہیا کر سکتے ہیں۔ پس ان کی ہر ممکن امداد کرنا چونکہ سب قوم کا فرض ہے۔ لیکن مغربیت کی رَو میں بہنے والے افراد ایسے اداروں کا وجود ہی اپنے لئے بارگراں سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان میں پیسہ دینا ہی فضول خرچی سمجھتے ہیں۔ پس اکثر فقراء اور شاذونادر امراء جو دینی اُمور سے قدرے دلچسپی لیتے ہیں۔ وہی ہیں ان اداروں کا سرمایۂ حیات۔ اسی لئے اگر اپنی گرہ سے نہیں بلکہ رقوم واجبہ زکوٰۃ و فطرہ وغیرہ سے ہی ان مدارس کی اعانت کی جائے تو وہ خاطر خواہ کام کر سکتے ہیں۔ بنابریں زکوٰۃ کا دورِ حاضر میں مدارسِ دینیہ کی امداد سے بہترین مصرف اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ پس اربابِ خیر کو چاہیئے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اپنے قریب ترین یا مستحق ترین مدرسۂ دینیہ کو ضرور حصہ دے تاکہ اس کا پیسہ علومِ آلِ محمدؐ کی نشر گاہوں میں صرف ہو کر اس کے لئے زیادتیِ ثواب کا باعث بنے

اسرار و رموز

آیت مجیدہ میں زکوٰۃ کے مستحقین کی آٹھ قسمیں بیان کرتے ہوئے یہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے کہ پہلی چار قسموں کے لئے لامِ تملیک کا استعمال کیا ہے۔ اور آخری چار قسموں کے لئے فی کا استعمال ہے جو ظرفیت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے بنیادی مصرف دو ہیں۔ ایک مصالح شخصیہ جہاں لامِ تملیک کے ذریعہ سے ان کو اپنے حصص کا مالک ظاہر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مصالح عامہ جہاں فی کا استعمال بتاتا ہے کہ یہاں شخصی تملیک نہیں بلکہ ان کاموں میں بنی نوع انسان کی عمومی خیر خواہی کے لئے زکوٰۃ کا خرچ کیا جاتا ہے۔ گویا اسلام نے شخصی بقاء و ارتقا کے

وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ

اور بعض ان میں وہ ہیں جو نبی کو اذیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ کن رسیا ہے کہدیجئے اچھا کن رسیا ہے تمہارے

بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ؕ

لئے اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنوں کی مان لیتا ہے اور رحمت ہے ان کے لئے جو تم میں سے ایمان لائے

ساتھ ساتھ نوعی بقاء وارتقا کو برابر ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً سختی میں بسر کرنے والے غلاموں کو اسی فنڈ سے آزاد کرایا جائے۔ مقروضین کی خبر گیری کی جائے۔ مہمان نوازی کو اپنا شعار بنایا جائے۔ اور دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں کو (مثلاً پلیں بنانا سڑکیں تعمیر کرنا۔ مساجد و مدارس کی بنا وغیرہ) انجام دیا جائے۔

مصالح عامہ میں جہاں فی کا استعمال ہے۔ ان میں سے پھر سبیل اللہ پر فی کا تکرار کرکے اس نوع کی اہمیت کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ یعنی شخصی مصالح میں سے اہم ترین مصلحت ہے۔ نوع انسان کی فلاح و بہبودی کے ذرائع پر خرچ کرنا اور اسی کو سبیل اللہ کہتے ہیں یعنی اللہ کی خوشنودی کے طریقے اور ان سب میں سے دین اسلام اور شریعتِ محمدیہ کی بقا وارتقا کے مراکز اور ترویج علومِ آلِ محمدؐ کی نشر گاہوں کا قیام آج کل کی اہم ترین قومی اجتماعی مصلحت ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ توجہ اسی طرف دینے کی ضرورت ہے۔

۲۔ بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اہم فالاہم کے لحاظ سے اقسام مستحقین کو ترتیب دی گئی ہے۔ اگرچہ اس ترتیب پر عمل کرنا واجب نہیں۔ جیسا کہ واو کا استعمال بتاتا ہے۔ یعنی فقیر اہم ہے مسکین سے۔ اور وہ مقدم ہے عامل سے۔ اور وہ مقدم ہے مولفۃ القلوب سے۔ اسی طرح رفاہِ عامہ کے کاموں میں غلام آزاد کرنا سب سے بڑی انسانی خدمت ہے۔ پھر مقروضین کی خبر گیری اور یہ عمومی اداروں کی تشکیل اور عمومی نفع مند سکیموں کی تاسیس سے بہتر ہے۔ اور مسافر کی امداد سب سے اخیر کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن سبیل اللہ پر فی کا تکرار ظاہر کرتا ہے کہ عمومی مصالح سب سے اہم ہیں۔

وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ۔ شانِ نزول۔ مروی ہے کہ ایک مرتبہ چند منافق ایک جگہ جمع تھے۔ جن میں جلاس بن سوید نامی بھی تھا۔ تو انہوں نے مسلمانوں کے متعلق نازیبا باتیں کیں۔ پس ان میں سے کسی نے ایسا کرنے سے روکا کہ آنحضورؐ کو خبر ہوگئی تو ہماری گت بنے گی۔ جلاس نے کہا اس بات کو چھوڑیئے ہم اپنی صفائی پیش کر دیں گے کیونکہ وہ تو ہر ایک کی بات آسانی سے مان لیتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک منافق نے قابل گرفت کلمات کہے۔ اور حضورؐ کو اللہ کی جانب سے اطّلاع مل گئی۔ پس آپ نے اس کو بلایا۔ اور پوچھا تو اس نے اپنی بے گناہی کے لئے قسمیں کھائیں۔ پس آپ نے درگذر فرمالیا تو وہ حضور کی معافی کو اس غلط انداز میں بیان کرتا تھا کہ وہ تو کن رسیا ہیں۔ یعنی ہر ایک کی سنتے ہیں اور باور کر لیتے ہیں۔ چنانچہ میرے متعلق اس کو شکایت پہنچی تو اس کو سن لیا۔ اور مان لیا۔ اور میں نے جا کر قسمیں کھا کر اپنی صفائی پیش کر دی تو میری بات بھی مان لی۔

قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ۔ اس کی ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ اُذُنُ خیر مضاف و مضاف الیہ ہیں اور خبر ہیں۔ مبتدا محذوف کی یعنی

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ

اور جو اذیت دیتے ہیں اللہ کے رسول کو ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے لئے تاکہ تم کو راضی کریں

ٹھہری اور معنی یہ ہوگا کہ وہ اچھا کن رسیا ہے تمہارے لئے۔ اور یہ موصوف کی اپنی صفت کی طرف اضافت ہے۔ چنانچہ بعضوں نے اضافت کے بغیر بھی پڑھا ہے۔

اُذُنٌ کا معنے ہے کان اور مبالغہ کے طور پر انہوں نے آپ کو اُذُن کہا کہ وہ ہر کی سنتے ہیں۔ جس طرح عین کا معنی آنکھ ہوتا ہے اور جاسوس کو مبالغہ کی بنا پر عین کہا جاتا ہے۔ پس یہ اطلاق مجاز مرسل کے طریقہ پر ہے۔

مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ حضورؐ پر کن رسیا ہونے کا عیب لگاتے تھے کہ جس طرح بڑے آدمی یا بادشاہ ہر معتبر وغیر معتبر کی بات پر جلدی سے باور کر لیتے ہیں۔ اور اس پر اثر مرتب کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ حضورؐ بھی اسی طرح کانوں کے کچے ہیں۔ بس جس نے جو بات کہہ دی فوراً مان لی تو خداوند کریم ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ بے شک رسول ہر کی بات کو سنتا ہے جو اچھی ہو۔ اور بُری بات نہیں سُنتا۔ اور جو بات سُنتا ہے یا مانتا ہے وہ تمہارے فائدہ کے پیش نظر الیا کرتا ہے۔

فائدہ۔ علمائے اُصول نے اس آیت مجیدہ کو خبر واحد کی حجیت کی دلیل قرار دیا ہے کہ خداوند کریم اپنے حبیب کی مدح فرما رہا ہے کہ وہ مومنوں کی بات سنتے ہیں۔ اور اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ پس مومن کی بات کی تصدیق خبر واحد کے قبول کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اور آیت مجیدہ میں ہے کہ اللہ اور مومنوں کی بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی اللہ کی تصدیق اوّلی و ذاتی حیثیت سے ہے اور مومنوں کی تصدیق ثانوی و عرضی حیثیت سے ہے کہ ان کی بات اس لئے مانتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور غالباً اسی پر یؤمن کے لفظ کو مکرر بیان فرمایا۔ نیز اللہ کے ساتھ حرف با اور مومنوں کے لئے حرف لام استعمال کرنے کی بھی یہی مصلحت ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنا ذاتی و اوّلی حیثیت رکھتا ہے اور دلیل و برہان کے ماتحت ہے لیکن مومنوں کی بات ماننا ان کی رعایت کے لئے ہے۔ اور ان کی دلجوئی کی خاطر ہے اور یہی وجہ ہے کہ مومن کی ہر بات سُنی جاتی ہے۔ لیکن اس پر اثر مرتب کرنے کے شرائط اس کے علاوہ ہیں۔ مثلاً گواہی میں ایک مومن کی بات پر عمل نہیں کیا جاتا نیز کچھ مومن اگر کسی کی شکایت کریں۔ اور وہ خود اپنی عذر داری پیش کر دے تو باقی مومنوں کی بات کو ردّ کر کے اُس کی عذر خواہی کو پذیرائی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بہر کیف مومنوں کے لئے اس کا وجود رحمت ہے اور وہ ان کی باتوں کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اور منافقوں کو کہا گیا ہے کہ تمہارے لئے اذنِ خیر ہے بایں معنی کہ باوجود ان کی قلبی امراض پر مطلع ہونے کے ان سے اچھا برتاؤ اور مسلمانوں کا سا سلوک کرتا ہے اور اکثر اوقات ان سے درگذر فرماتا ہے۔ اور ان کے عذر کو بھی قبول فرما لیا کرتا ہے۔

ایذاء رسول گناہ ہے

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ۔ مفتی محمد عبدہٗ نے اپنی تفسیر منار میں ذکر کیا ہے کہ ایذاء رسول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو انکارِ رسالت کی وجہ سے ہو۔ اور یہ کفر ہے۔ اور دوسری وہ جو اقرار رسالت کے بعد بعض ناروا حرکات و سکنات و اقوال و کردار کی وجہ سے ہو۔ اور یہ حرام ہے اگرچہ کفر نہیں پھر آگے چل کر کہتا ہے کہ

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ

حالانکہ خدا اور رسول زیادہ حقدار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرتے اگر وہ مومن ہوتے کیا نہیں جانتے کہ جو تجاوز کرے اللہ

يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾

اور اس کے رسول کی حدوں سے تحقیق اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی رسوائی ہے

بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کی رحلت کے بعد ان کو ایذا دینا مثل اسی ایذا کے ہے جو زمان زندگی میں آپ کو دی جائے مثلاً اس کی ازواج سے شادی کرنا یا حضورؐ کے والدین یا اہل بیت کے متعلق ایسی باتیں کرنا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً ناراض ہوتے اور یہ باتیں گناہ ہیں کفر نہیں۔ اور بے شک ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کوئی ایسی بات نہ کرے جس کے متعلق اُسے علم باطن ہو کر حضورؐ ہوتے تو ناراض ہوتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذاتی اور مالی تنازعات میں بھی آل و عترت پیغمبرؐ کی ایذا حرام ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جو آل کی طرف نسبت کا مدعی ہے۔ وہی درحقیقت غلطی پر ہو۔ اور گنہگار ہو اور اس ساری تمہید کو ایک مطلب کی طرف کھینچ لایا ہے۔ چنانچہ تھوڑا سا آگے چل کر لکھتا ہے) کہ جناب فاطمہؑ اہل بیت کی عورتوں کی سردار بلکہ عالمین کی عورتوں کی سردار (مثل مریم) کو صدیق اکبر سے ایذا پہنچی (جو کہ ان کے باپ کو تمام مردوں میں سے محبوب تر تھا۔ جیسے کہ وہ خود تمام عورتوں میں سے محبوب تر تھیں) اور ایذا کی وجہ یہ تھی کہ جو حضورؐ کی طرف سے بطور میراث ملنے کا اُن کو ظن تھا وہ اُس نے نہ دیا یہ عذر کر کے کہ میں اُن کے حکم کو نافذ کرنے والا ہوں اور اُن کی شریعت کی پاسداری کرنے والا ہوں۔ اور میں نے اپنے کانوں آپؐ سے سنا تھا کہ نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ اور جو وہ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوا کرتا ہے۔ پس اس (ابوبکر) کا حضورؐ کی وصیت پر عمل کرنا ایذا نہیں ہو سکتا۔ لہذا بی بی کو جو ایذا پہنچی ان کی طرف سے نہیں تھی۔ الخ۔ تفسیر منار ج ۱۰ ص۶۰۵۔

فخر الدین رازی اور اہل سنّت کے اکثر اکابر علماء نے کوشش کی ہے کہ خاتون جنت اور ابوبکر کے درمیان باہمی نزاع کو صلح وصفائی سے ختم کرا دیا جائے اور ناراضگی و رنجش کا ذکر ہی درمیان میں نہ آئے۔ چنانچہ غضبت اور ہجرت کی تاویلیں کی گئیں اور یہ مشہور کر دیا گیا کہ خاتونِ جنّت بعد میں راضی ہو گئی تھیں۔ جیسا کہ ہم نے تفسیر انوار النجف کی چوتھی جلد ص۱۴۰ پر ذکر کیا ہے مرور زمانہ سے ہر بعد میں آنے والا گذشتگان کی باتوں میں جدّت پیدا کرتا ہی رہتا ہے۔ اور سابقہ اعتراضات چونکہ اس کی نگاہوں میں ہوتے ہیں۔ لہذا ہر ایراد و اعتراض سے بچنے کی نت نئی راہیں پیدا کرنا علمی تفوق کا معیار سمجھا جاتا ہے مفتی محمد عبدہٗ نے دیکھا کہ فریقین میں صلح وصفائی کا ڈھنڈورا سنجیدہ طبائع کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ نیز بخاری شریف کی تصریح موجود ہے کہ مرتے دم تک بوجہ ناراضگی کے بی بی نے ابوبکر سے کلام تک نہ کیا۔ اور یہ کہ بی بی کے جنازہ اور دفن میں بھی ان کو شریک نہ کیا گیا تو ان حقائق کے پیش نظر صلح وصفائی کا اعلان تو صرف مضحکہ خیز ہی ہے۔ لہذا معاملہ کو رفع دفع کرنے کی خاطر یہ ایک نئی چال ہے کہ قرآن کے تہدیدی فرمان سے بھی گلو خلاصی ہو جائے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو بھی رسولؐ کو اذیت دیتا

ہے۔ اس کے لئے دردناک عذاب ہے) اور حدیث پیغمبر ہے۔ الفاطمۃ بضعۃ منی من اذاھا فقد اذانی کہ فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ جس نے اس کو ایذا پہنچائی اُس نے مجھے ایذا پہنچائی۔ اور عوام کی آنکھوں میں بھی دھول ڈالی جا سکے۔ حالانکہ یہ بے چارہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ بی بی کو ناراض کرنے والا یقیناً رسول کا موذی ہے۔ اور اسی آیت مجیدہ کی رو سے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لیکن اس کو چونکہ اکابر کی دیکھا دیکھی پر اپنا پیش رو مان لیا ہے۔ لہٰذا اُسے اور اپنی جان کو دوزخ سے بچانے کا اپنے نفس کو اور عوام کو دھوکا دیتے ہوئے یہ بہانہ تلاش کیا ہے کہ بی بی کی ناراضگی غلط فہمی پر مبنی تھی۔ لہٰذا اس ایذا کا ابوبکر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ بی بی کی پاکدامنی پر دھبہ لگتا ہے۔ کیونکہ ان کو حقیقت معلوم نہ تھی۔ اور وجہ یہ بتلائی ہے کہ ابوبکر نے رسول اللہ سے سنا تھا کہ ہم نبیوں کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔

امام فخر الدین رازی کے اعتراف کے مطابق بی بی نے اس حدیث کے جواب میں یُوصِیکُمُ اللہ کی آیت پڑھی تھی کہ خداوند کریم نے ہر اولاد کو اپنے والدین کا وارث قرار دیا ہے۔ اور قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں جو اس عام حکم کی تخصیص کرتی ہو کہ نبیوں کے علاوہ باقی لوگوں کے لئے یہ حکم ہے بلکہ قرآن مجید میں تو اس کی تائیدیں ملتی ہیں کہ مثلاً سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔ اور ذکریا نے اپنے لئے وارث کی دُعا مانگی تھی وغیرہ۔ پس جب آیت میں وراثت کا حکم عام ہے تو خبر واحد اس حکم کو کیسے توڑ سکتی ہے۔ حالانکہ علماء کے نزدیک یہ مسلّمہ ہے کہ خبر واحد قرآن کی مخصص نہیں ہوسکتی۔

نیز وراثت کا تعلق اولاد سے ہوا کرتا ہے یا اقربا سے۔ پس اگر رسول نے یہ حکم جاری کرنا تھا کہ ہماری جائداد ورثہ میں نہیں جایا کرتی تو بطور وصیت کے اپنے جائز وارثوں کو بلا کر فرماتے اور سمجھاتے کہ دیکھو ہمارا کوئی وارث نہیں ہوا کرتا بلکہ نبیوں کا ترکہ صدقہ ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا تم لوگ وراثت کا سوال نہ اٹھانا۔ اور کوئی عام سے عام انسان بھی ایسی غلطی نہیں کرتا کہ وصیت کا جن لوگوں سے تعلق ہو اُن سے اشارۃً بھی ذکر نہ کرے۔ اور غیر متعلق لوگوں کو ساری باتیں سمجھا دے۔ پس رسول کریم پر ضروری تھا کہ اُمت کے اختلافات کا سدباب کرتے ہوئے اپنی اکلوتی بیٹی کو فرما کر جاتے کہ دیکھو میراث میں جھگڑا نہ کرنا۔ اور یقیناً اگر آپ فرما کر گئے ہوتے تو فدک کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور بی بی یہ اقدام ہرگز نہ کرتی۔ اور اُمت کا شیرازہ نہ بکھرتا۔ اور اگر صاف صاف نہیں تو کم از کم اتنا تو کہہ جاتے کہ میں وراثت کے متعلق فلاں صاحب کو تفصیل بتا چکا ہوں لہٰذا ان کی بات پر باور کر لینا۔ پس حیرت در حیرت ہے کہ اس قدر ضروری مسئلہ کو اپنے متعلقین پر واضح نہ فرمایا اور ابوبکر کو بتلا گئے۔ اور بطور وصیت فرما گئے۔ بقول محمد عبدہٗ کے۔ حالانکہ تاریخ وفات رسالت مآب کا مطالعہ رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ آخری ایام میں اور بالخصوص آخری اوقات میں آل بیت کسی وقت بھی حضورؐ سے الگ نہیں ہوئے۔ البتہ صحابہ کے کسی نہ کسی وقت دُور رہنے کا امکان قرین قیاس ہے۔ اور واقع بھی۔ پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اپنے بعد کا ایک زبردست متنازعہ فیہ فیصلہ اپنی پوری اُمت میں سے ایک شخص کو بتا گئے جب کہ اہل وعترت بھی موجود تھی۔ اور دوسرے اکابر صحابہ بھی موجود تھے۔ اور کسی نے بھی حضورؐ کا یہ فرمان نوٹ نہ کیا۔ اور تاریخ میں یہ بھی کہیں نہیں ملتا کہ آپ نے آخری اوقات میں سے کسی وقت ان سے خلوت میں باتیں

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ

ڈرتے ہیں منافق کہ اترے ان پر کوئی سورہ جو بتا دے ان کو وہ چیز جو ان کے دلوں میں ہے

کی ہوں تاکہ یہ احتمال دیا جاسکے کہ ان میں سے ایک یہ بھی ہوگی ۔ بہرکیف یہ اور اس قسم کے مفروضہ افسانوں اور اعذار باردہ کی خدا کے سامنے کوئی وقعت نہیں ۔ اور مفتی محمد عبدہ کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ بی بی کی ایذاء رسول کی ایذا بنتی ہے ۔ اور آیت مجیدہ کی رُو سے وہ عذاب الیم کے حقدار ہیں ۔ اور اسی جلن کے پیش نظر تو انہوں نے ایذاء فاطمہ کا مسئلہ یہاں خواہ مخواہ چھیڑا ہے ورنہ اس مسئلہ کو یہاں چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی ۔ سچ ہے (چور کی ڈاڑھی میں تنکا) اس کے بعد اس نے شیعوں پر برسنے کی کوشش کی ۔ اور ان کو خوب کوسا ۔ اور ان کا کوئی جرم نہیں سوائے اس کے کہ ان کو آل رسولؐ سے محبت ہے اور وہ آل رسولؐ پر تشدد کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ۔ اُسے پتہ نہیں کہ محبت محمدؐ و آل محمدؐ میں وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ہیں کہ اس جیسے بلکہ اس سے بڑھ کر شیعوں کو نشانہ ظلم و تشدد بنانے والے اپنی انتھک کوششوں کے باوجود شیعوں کے اس جائز احتجاج کو نہیں دبا سکے ۔ ہاں ایک دن ضرور آئے گا کہ شیعہ قوم کا وارث آئے گا ۔ اور ان کے اس احتجاج کی قیمت پڑے گی ۔ اللّٰھمّ عجل فی فرج آل محمدؐ ۔

منافقوں کی چالیں

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ ۔ شان نزول ان آیات کا یہ ہے جیسا کہ تفاسیر علمائے شیعہ میں مذکور ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر چند منافقوں نے حضورؐ کے قتل کی تجویز بنائی تھی ۔ اور وادی عقبہ میں آکر وہ چھپ گئے تھے کہ اگر حضورؐ کو پتہ چل گیا تو ہم کہیں گے کہ ہم لہو و لعب اور گپ وشپ اڑا رہے تھے اور اگر ان کو پتہ نہ چلا تو اچانک حملہ کر کے ان کو قتل کر دیں گے ۔ عمار نے آپ کی سواری کی باگ پکڑی ہوئی تھی ۔ اور حذیفہ پیچھے سے ہانک رہا تھا کہ اُسے پاؤں کی آہٹ اور تلواروں کا جھنکار معلوم ہوا تو اس نے ان کو دھتکارا ۔ چنانچہ وہ دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے چونکہ تاریکی تھی اور انہوں نے بھی سر منہ لپیٹ رکھا تھا ۔ اس لئے جب حضورؐ نے پوچھا کہ تم نے پہچانا کون کون تھے ؟ تو اس نے عرض کی کہ نہیں حضورؐ البتہ آپ نے بارہ آدمیوں کے نام گن دیئے ۔ پس حذیفہ نے عرض کی کہ حضورؐ ! ان کو بلا کر قتل کر دیا جائے ۔ تو آپ نے فرمایا کہ وہ عرب جن کو حقیقت کا پتہ نہیں کہیں گے کہ محمدؐ نے اپنے اصحاب کو دھوکے سے قتل کر دیا ہے ۔ لہٰذا ان کو جانے دیجئے ۔ بہرکیف اس سے قبل کی آیتوں میں گذرا ہے کہ وہ مومنوں سے عذر خواہی کرتے ہیں تاکہ وہ ان سے راضی ہوں ۔ اور خدا فرماتا ہے کہ ان کے لئے مناسب تھا کہ سچا ایمان لا کر خدا کو راضی کرتے ۔ اور اس کے رسول کو راضی کرتے یعنی وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ۔ اور قرینہ کی وجہ سے واللہ کی خبر کو محذوف کر دیا گیا ۔ اور خدا و رسول کو رضامند نہ کرنے پر ان کو حدود خداوندی کے توڑنے والا ظاہر کر کے آخرت کی عظیم رسوائی سے ڈرایا بھی گیا ۔ اور یہ سارا قصہ تسلسل آیات کے لحاظ سے غزوہ تبوک سے تعلق رکھتا ہے ۔ پس اس جگہ فرماتا ہے کہ منافقوں کے دلوں میں یہ خدشہ بدستور تھا کہ ہمارے متعلق کوئی سورہ نازل ہوگا اور ہمارے قلبی حالات کا مسلمانوں کو پتہ چل جائے گا ۔ اور ہم رسوا ہوں گے ۔ لہٰذا اپنی ظاہری خیر خواہی جتلانے کے

قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا

کہدیجئے کہ مسخری کرلو تحقیق اللہ ظاہر کرے گا اس کو جس سے تم ڈرتے ہو اور اگر ان سے پوچھو تو کہتے ہیں کہ بجز اس کے نہیں ہم

كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

تو گپ شپ مار رہے تھے کہدیجئے کیا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول سے تم مسخری کرتے ہو

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۚ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ

عذر نہ کرو تحقیق تم کافر ہو چکے بعد ایمان لانے کے اگر ہم معاف کریں ایک گروہ کو تم سے

باوجود بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ اور روادی عقبہ میں جو انہوں نے کھیل کھیلا۔ یا وقتاً فوقتاً جو کرتوت کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بذریعہ وحی ان سب باتوں کی قلعی کھل جائے گی۔ اور ہم رسوا ہوں گے۔ اور عَلَيْهِمْ میں علیٰ ضرر کے لئے ہے جس طرح اس کے برعکس لام نفع کے لئے آیا کرتا ہے۔

قُلِ اسْتَهْزِءُوْا۔ یعنی ان منافقوں سے کہہ دو کہ بے شک تم مسخری کرلو۔ خدا تمہارے سارے حالات کو جانتا ہے اور جس سے تم کو ڈر رہے وہ ہو کے رہے گا کہ تمہارے نفاق کا پردہ چاک ہو گا اور تم رسوا ہو گے۔

لَا تَعْتَذِرُوْا۔ جب رسالتمآبؐ نے ان کو بلا کر پوچھا تو قسمیں کھا کھا کر کہنے لگے کہ ہم بے گناہ ہیں۔ اور ہمارا ارادہ بُرا نہیں تھا تو خدائے علام کی طرف سے ارشاد ہوا کہ ان سے کہدیجئے۔ اب عذر خواہی نہ کرو۔ تم ظاہری ایمان لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہو چکے ہو۔ اور عذاب خداوندی سے بچ نہیں سکتے۔ ہاں اگر کسی نے صدق دل سے توبہ کرلی تو اس کو ہم معاف کر دینگے لیکن توبہ نہ کرنے والوں کو ضرور عذاب ہوگا۔

تفسیر صافی میں بروایت قمی امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو لوگ مومن تھے۔ اور بعد میں شک و نفاق کی وجہ سے مُرتد ہو گئے تھے۔ وہ چار آدمی تھے۔ پس ان میں سے ایک نے واقعی طور پر توبہ کرلی۔ اور حضورؐ نے اس کا پہلا نام تبدیل کرکے عبداللہ رکھا۔ پس اس نے دُعا کی کہ اے پروردگار مجھے شہادت کی موت نصیب فرما کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ پس اس کی دُعا مستجاب ہوئی اور یمامہ کے دن شہید ہوا۔ اور کسی کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔

اور بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ اور سیاق آیات بھی اسی کا متقاضی ہے کہ منافق لوگ غزوۂ تبوک پر جاتے ہوئے آیات قرآنیہ اور اسلام و مسلمانوں پر پھبتیاں کستے ہوئے جا رہے تھے۔ اور ایسی باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے جو اسلام دشمنی کی آواز سمجھی جا سکتی تھی۔ پس حضورؐ نے عمار کو بھیجا کہ کیا کہہ رہے تھے تو انہوں نے کہا حضور ہم تو آپس میں گپ شپ مار رہے تھے تب یہ آیتیں اُتریں۔

بہر کیف یہ آیات صرف انہی لوگوں کے لئے نہیں بلکہ تاقیامت تمام لوگوں کے لئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے مہمیز عبرت ہیں کہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ کہیں ہم تو خدا اور رسول کے احکام اور آیات قرآنیہ سے مسخری کے مرتکب

نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ

تو عذاب دیں گے ایک گروہ کو اس لئے کہ مجرم ہیں منافق مرد و عورتیں

بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ

بعض ان کا دوسرے بعض میں سے ہے کہ امر کرتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے اور ہاتھ بند رکھتے

اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ

ہیں انہوں نے خدا کو بھلایا پس اس نے ان کو بھلا دیا تحقیق منافق ہی فاسق ہیں وعدہ کیا اللہ نے

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ

منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے وہی ان کو کافی ہے

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْا اَشَدَّ

اور اللہ نے اُن پر لعنت کی اور اُن کے لئے عذاب دائمی ہوگا (تمہاری حالت) مثل اُن کے ہے جو تم سے پہلے تھے کہ وہ تم

نہیں ہوتے۔ اگر نہیں تو خدا کا شکر بجا لائیں۔ لیکن اگر یہ مرض دل میں ہے تو اس کا توبہ سے علاج کریں اور عذاب نفاق سے بچنے کی کوشش کریں۔

رکوع نمبر ۱۵۔ منافقوں کی نشانیاں

اَلْمُنٰفِقُوْنَ۔ اس آیت میں منافقوں کی پانچ علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) یہ کہ وہ بعض بعض سے ہیں۔ یعنی ان کی سیرت و خصلت ایک دوسرے کے بالکل مشابہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ایک دوسرے سے یک جان دو قالب کی حیثیت سے ہیں۔

(۲) یہ کہ وہ برائی کا امر کرتے ہیں (۳) یہ کہ وہ نیکی سے روکتے ہیں (۴) اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ یعنی راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے (۵) اور یہ سب برائیوں اور خرابیوں کی جڑ ہے کہ وہ اللہ کو بھلا چکے ہیں۔ پس کسی بد اعمالی سے روکنے کا ان میں احساس ہی نہیں رہا۔ اسی لئے بعد میں تعمیم کر دی کہ منافق ہی ہیں فاسق۔ یعنی اللہ کو بھلا دینے کے بعد وہ اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کا فسق ان سے متوقع ہے۔

حدیث نبوی میں وارد ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں۔ بات کا جھوٹا۔ وعدے کا کچا اور امانت کا خائن۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس میں چار علامتیں ہوں وہ پکا منافق ہے۔ اور جس میں ان سے ایک پائی جائے تو اس میں نفاق کا حصہ ہوگا۔ بات کا جھوٹا۔ وعدہ کا کچا۔ عہد میں غدر کرنے والا اور جھگڑے کے وقت گالی دینے والا۔

وَعَدَ اللّٰهُ۔ یہاں منافق مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر فرمایا ہے کیونکہ وہ بھی مردوں کے دوش بدوش نفاق و کفر

مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ

سے زیادہ قوی اور زیادہ مالدار، صاحب اولاد تھے۔ پس انہوں نے فائدہ اٹھایا اپنے حصے کا پس تم نے بھی فائدہ اٹھایا

بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ

اپنے حصہ کا جس طرح فائدہ اٹھایا تم سے پہلے لوگوں نے اپنے حصہ (دنیاوی) کا اور تم بھی اسی میں گھس گئے جس میں وہ

خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

گھسے تھے اُن کے عمل برباد ہوئے دنیا و آخرت میں اور وہی ہیں خسارہ

الْخٰسِرُوْنَ ۝۶۹ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ

پانے والے کیا نہیں پہنچی اُن کو خبر اپنے سے پہلے لوگوں کی قوم نوح اور عاد اور ثمود

وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ

اور قوم ابراہیم اور اصحاب مدین اور وہ بستیاں جن کو الٹایا گیا جن کے پاس رسول واضح دلیلیں لے کر

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۷۰ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

آئے تھے پس اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے اور مومن مرد

میں حصہ لیا کرتی ہیں۔ جس طرح کہ ایمان میں ان کا حصہ ہوا کرتا ہے۔ اور منافقوں کے بعد کفار کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ عذاب خداوندی میں خالص کفار سے منافقوں کا حصہ زیادہ ہے۔ اور وہ اللہ کے نزدیک کافروں سے بدتر ہیں۔ اس لئے استحقاقِ عذاب میں بھی ان کو مقدم کیا۔ اور لعنت میں بھی ان کا مقام پہلے قرار دیا۔

اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۔ اس آیت مجیدہ میں صیغہ غائب، سے اعراض کر کے صیغہ مخاطب استعمال فرمایا کہ اے منافقو! تمہاری حالت ایذاءِ رسول میں ایسی ہے جس طرح تم سے پہلے کے کفار و منافقین کی تھی بلکہ وہ تم سے مال و اولاد و قوت میں زیادہ تھے۔ پس انہوں نے نعماتِ خداوندی کو لذاتِ دنیاویہ اور خواہشاتِ نفسانیہ میں ہی خرچ کیا۔ پس انہوں نے اپنا حصہ یہاں دنیا میں پورا کر لیا۔ اور تم بھی انہی کی طرح لذّاتِ دنیاویہ میں منہمک ہو کر اپنا حصہ وصول کر رہے ہو۔ جس طرح انہوں نے کیا تھا اور کفر میں ڈوب گئے ہو۔ جس طرح وہ ڈوبے تھے۔ پس اُن کے اچھے اعمال کا نہ کوئی دنیا میں صلہ ہے کہ وہ قابلِ مدح ہوں اور نہ اُن کا آخرت میں کوئی حصہ ہے کہ وہ کافر تھے۔ اور تمہاری بھی وہی حالت ہے۔ پس یہاں ظاہری لذات ہی ان کے اعمال کا بدلہ ہو گئیں۔

اَلَّذِيْ خَاضُوْا ۔ میں فرّا کے نزدیک الّذی مصدریہ ہے جیسے ما مصدریہ ہوا کرتا ہے یعنی خَاضُوْا كَخَوْضِهِمْ

وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

و عورتیں بعض بعض کے اولیاء ہیں نیکی کا امر کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور

الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ و رسول کا حکم مانتے ہیں

اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ

ان لوگوں پر اللہ عنقریب رحم کریگا تحقیق اللہ غالب و دانا ہے وعدہ کیا اللہ نے مومن مردوں

وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ

اور عورتوں سے باغات کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں کہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانات

طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

کا جو جنات عدن میں ہوں گے اور اللہ کی رضا بہت بڑی چیز ہے اور یہ ہی بڑی کامیابی ہے

اَلَمْ يَاْتِهِمْ [۹۴] پھر خطاب سے غائب کی طرف رجوع کرتے ہوئے منافقوں کو تنبیہ فرماتا ہے کہ کیا یہ لوگ گذشتہ اقوام کی تباہی سے بھی عبرت و نصیحت نہیں پکڑتے کہ ان کا کیا حشر ہوا تھا۔ اصحاب مدین حضرت شعیب کی قوم تھی۔ جن کا ذکر تفسیر کی چھٹی جلد میں گذر چکا ہے۔ اور موتفکات سے حضرت لوط کی امت کی تین بستیاں مراد ہیں۔ جن کو عذاب میں گرفتار کیا گیا۔ اور راتوں رات جبریل نے ان کو الٹا دیا تھا۔

علاماتِ مومن بَعْضُهُمْ آیت مجیدہ میں مومنین کی چھ علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ اور یہ اُن کے کمال خلوص کی نشانی ہے کہ ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں اور یہ بات منافقین میں نہیں پائی جاتی (۲) امر بالمعروف کرنا (۳) نہی عن المنکر (۴) نماز کا قائم کرنا (۵) زکوٰۃ ادا کرنا (۶) یہ خصلت تمام خصائل حمیدہ اور اوصاف فاضلہ کی جڑ ہے کہ وہ اللہ و رسول کی اطاعت کو فرض سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کی نیکی ہی ان سے متوقع ہو سکتی ہے۔ پس ان پر خدا رحم فرمائے گا۔ اور یہ منافقوں کی علامت کے مقابلہ میں ہے کہ وہ خدا کو بھلا چکے ہوتے ہیں۔ اور پھر خدا بھی ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ یا یہ کہ جہنم میں ڈال کر ان کی پرواہ نہ کرے گا۔ اور خدا کے ان کو بھلا دینے کا یہی مطلب ہے۔ اور بخلاف اس کے مومن خدا و رسول کی اطاعت سے گریز نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کو ہر وقت خدا یاد رہتا ہے۔ پس اس کے بدلہ میں خدا بھی ان کو یاد رکھتا ہے۔ یعنی ہر وقت ان پر نگاہِ رحم و کرم فرماتا رہتا ہے۔ جس طرح دوسری جگہ فرماتا ہے فاذکرونی اذکرکم تم مجھے یاد کرو۔ تو میں تمہیں یاد کروں گا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ

اے نبی جہاد کرو کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا دوزخ

وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ

ہے اور بری بازگشت ہے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ وہ کلمۂ کفر کہہ چکے ہیں اور بعد

كَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ

اسلام لانے کے اور انہوں نے ارادہ کیا وہ جو نہ پا سکے اور انہوں نے نہیں انتقام لیا مگر اس بات کا کہ ان کو خدا

وَعَدَ اللّٰہُ ۔ منافقوں کے لئے جہنم کا وعدہ تھا۔ ان کے مقابلہ میں مومنوں کے لئے جنّت کا وعدہ ہے اور آخر میں منافقوں پر لعنت بھیجی اور مومنوں کو اپنی جانب سے رضوان کی پیش کش فرمائی۔ اُن کے لئے عذاب مقیم تھا۔ اور ان کے لئے فوزِ عظیم ہے۔

عَدْنٍ ۔ اس کا لغوی معنی ہے ٹھہرنا قیام کرنا باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے۔ اور معدن کا لفظ اسی سے مشتق ہے معدن جوہر یعنی جوہر کے ٹھہرنے کی جگہ۔ پس یہاں بھی اسی مناسبت سے جنات کو عدن کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ یعنی ایسے باغات جن میں ہمیشہ ٹھہرنا ہوگا۔

رکوع ۱۶ ۔ کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم

یَا اَیُّہَا النَّبِیُّ ۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے کفار اور منافقین دونوں گروہوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا لیکن جناب رسالت مآبؐ نے اپنی زندگی میں صرف کفار سے ہی جہاد جاری رکھا۔ اور کبھی منافقین سے جہاد نہ کیا۔ گویا حکم کے ایک حصّہ پر عمل کیا اور دُوسرے حصہ پر عمل نہ کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔؟

اس سوال کے تین جواب ہیں۔

پہلا جواب ۔ جہاد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جہاد بالسیف اور دُوسرا جہاد باللسان۔ پس حضورؐ نے کفار سے جہاد فرمایا۔ پہلے زبان سے اور اس کے بعد تلوار سے۔ لیکن منافقوں سے ساری عمر زبان سے ہی جہاد فرماتے رہے۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ منافقوں سے کیوں نہ تلوار سے جہاد کیا۔ جب کہ زبانی جہاد کارگر ثابت نہ ہوا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ منافق لوگ ظاہری طور پر توحید و رسالت کا اقرار کر چکے تھے۔ اور صف اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اور کافروں کے ساتھ جہاد کرتے وقت خواہ دل سے یا بددلی سے مومنوں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں بھی حصہ لیتے تھے جس سے مومنوں کی جمعیت میں اضافہ کر کے کفار پر رُعب کا باعث بنتے تھے۔ پس اگر حضور ان سے بھی جہاد کرتے تو جہاں ایک طرف کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جمعیت پر اثر پڑتا۔ وہاں دوسری طرف کفار کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی کہ حضور صرف اقتدار

وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ

اوراس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔پس اگر توبہ کریں تو ان کے لئے خوب ہوگا اور اگر انکار کریں تو عذاب دے گا خدا

عَذَابًا اَلِيْمًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

ان کو دردناک عذاب دنیا و آخرت میں اور نہ ہوگا ان کا زمین میں کوئی ولی و مددگار

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ

اور ان میں سے بعضوں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے عطا کرے تو ضرور صدقہ دینگے اور نیک

الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

بندوں میں سے ہو جائیں گے پس جب اس نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا تو بخل کرنے لگے اور پھر گئے وعدے سے اعراض کرتے ہوئے

دنیاوی کے لئے لوگوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔اور جب ان کا اقتدار تسلیم کرلیا جاتا ہے تو اپنوں کو بھی تہ تیغ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔پس وہ لوگ اس قسم کی باتوں سے اسلام کو بدنام کرتے۔نیز حضورؐ کی تلوار سے بچ نکلنے والے منافق بھی اسی قسم کا پروپیگنڈا کرتے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی ترقی میں رخنہ کا موجب ہو جاتا۔پس اسی مصلحت کی بنا پر ان سے درگذر ہی مناسب سمجھا اور زبانی جہاد پر اکتفا فرمائی۔

دوسرا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ جاھد باب مفاعلہ سے ہے جو طرفین کے اقدام پر دلالت کرتا ہے۔چونکہ کافروں نے اقدام کیا لہذا حضورؐ نے جوابی کاروائی کی لیکن منافقوں نے نہ اقدام کیا اور نہ حضورؐ نے ان کی سرکوبی ضروری سمجھی۔اگر یہ بھی ایسا کرتے تو یقیناً ان سے بھی تلوار سے جہاد کیا جاتا جس طرح کہ حضورؐ کے قائم مقام حضرت علیؑ سے جو لوگ نہ الجھے ان سے جہاد نہ کیا اور جو الجھے ان کو دندان شکن جواب دیا گیا جیسا کہ جنگ جمل وصفین و نہروان کی تاریخیں گواہ ہیں۔

تیسرا جواب۔جو تفسیر صافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آیت کے دونوں حصوں پر اس طرح عمل ہوا کہ حضورؐ بنفس نفیس کفار سے لڑے۔اور آپ کے وصی منافقین سے لڑے۔اور علیؑ کا جہاد بھی چونکہ جہاد رسول تھا لہذا علی کے جہاد کو ساتھ ملا کر نبی کی جانب سے آیت مجیدہ کے دونوں حکموں پر عمل ہو گیا۔جلد ۱۴ سورہ تحریم کی تفسیر میں مزید بلاحظہ فرمائیں۔

يَحْلِفُوْنَ سطر ۹۵۔غزوہ تبوک سے واپسی پر یا اسی موقعہ پر بعض منافقین نے رسالت مآبؐ کے حق میں ناسزا الفاظ کہے جب حضورؐ نے اس کو بلا کر پوچھا تو وہ قسمیں کھانے لگا کہ میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا تھا۔آیت مجیدہ میں خدا اس کی مذمت فرما رہا ہے۔

لَمْ يَنَالُوْا۔ سطر ۹۶۔ غزوہ تبوک سے واپسی پر چند منافقوں نے حضورؐ کے قتل کی تجویز مرتب کی تھی۔اور ان کی تعداد

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا

پس نتیجہ میں دیا ان کو نفاق دلوں میں ملاقات کے دن تک بوجہ اس کے کہ خلاف کیا انہوں نے اللہ سے اپنے وعدہ کا اور بوجہ

كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَ

جھوٹ بولنے کے کیا وہ نہیں جانتے کہ تحقیق اللہ جانتا ہے ان کی پوشیدہ و ظاہر باتوں کو اور

بارہ یا پندرہ تھی۔ حضرت عمار اور حذیفہ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ خداوند کریم نے حضورؐ کو کافروں کی نیت بد سے مطلع کر دیا تھا چنانچہ وہ منافق ناکام ہوئے۔ اور حضورؐ بال بال بچ گئے۔ اور آپ نے حذیفہ کو وہ نام بھی بتا دیے۔ اس مقام پر ملّا محمد عبدہ نے تفسیر منار میں وادیٔ عقبہ میں منافقین کا درپے قتل رسول ہونا مختلف تاریخوں سے نقل کیا ہے۔ اور آخر میں بروایت طبرانی ان بارہ منافقوں کے نام بھی گنوا دیے۔ اور آخر میں عذر یہ پیش کیا ہے کہ میں نے یہ بارہ نام اس لئے ذکر کر دیے ہیں تاکہ شیعہ لوگوں کو دوسرے اچھے صحابہ پر طعن کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ وہی چور کی ڈاڑھی میں تنکا والی بات ہے۔ جب رسول کے نیک صحابہ کا کسی نے نام ہی نہیں لیا اور نہ کسی کی جرأت ہے کہ رسول کے صحابہ پر زبانِ طعن دراز کرے تو ایسے حالات میں خواہ مخواہ کسی کے متعلق ڈھنڈورا پیٹنا کہ دیکھو فلاں پر بدگمانی نہ کرنا کیونکہ وہ بڑا نیک ہے تو درحقیقت اس قسم کے اعلانات لوگوں کو اس شخص پر بدگمان ہونے کی دعوت ہوا کرتے ہیں۔ خدا ایسے عقلمند طبقے سے پناہ دے۔ اور تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السّلام سے مروی ہے کہ ان بارہ میں سے آٹھ قریشی تھے۔ اور چار دوسرے قبائل عرب میں سے تھے۔

وَمَا نَقَمُوْٓا ۹۷ - یعنی جو لوگ رسول کے قتل کے درپے ہوئے یا جنہوں نے حضورؐ کے حق میں نازیبا الفاظ کہے۔ انہوں نے اپنی ضمیر فروشی اور محسن کشی کا ثبوت فراہم کیا تھا کیونکہ یہ لوگ قبل از اسلام فاقوں مرتے تھے کبھی پیٹ بھر کر ان کو کھانا نصیب ہی نہ ہوا تھا۔ پس جب اسلام کا بول بالا ہوا تو اسلامی حروب میں حضور کے قدم جگہ بہ جگہ فتح و نصرت نے چوم لئے تو کفار سے اس قدر مالِ غنیمت ان لوگوں کو دست یاب ہوا کہ غنی ہو گئے اور فاقہ مستی کے بعد یکدم دولتمند اور غنی ہو جانا اللہ کا فضل و کرم اور اس کے رسول کا فیض تھا۔ پس ان کو چاہیئے تھا کہ خدا کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرتے۔ اور اس کے رسول کی غلامی کو اپنا سرمایہ زندگی تصوّر کرتے۔ لیکن انہوں نے اپنی نااہلیت کا ثبوت دیا۔ اور یکبار غنی ہونے میں وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اور اُلٹا اپنے محسن کے درپے ایذا و قتل ہو گئے۔ پس گویا انہوں نے اپنے اُوپر خدا اور رسول کے انعامات و احسانات کا شکر ادا کرنے کی بجائے انتقام لیا جو انتہائی خست اور کمینگی ہے۔

ثعلبہ کا واقعہ

وَمِنْهُمْ مَنْ ۹۸ - تفسیر مجمع البیان میں آیت مجیدہ کے شانِ نزول کے متعلق مذکور ہے کہ ایک شخص ثعلبہ نامی جو انصار سے تھا۔ اس نے خدمتِ نبوی میں درخواست کی کہ خدا مجھے اپنے فضل و کرم سے مالدار کرے آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضور نے جواب میں فرمایا۔ اے ثعلبہ تھوڑے مال پر شکر ادا کرنا اس زیادہ مال سے اچھا

اِنَّ اللّٰہَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ

تحقیق اللہ غیبوں کے جاننے والا ہے؟ وہ جو طعنہ زنی کرتے ہیں مومنین میں سے خیراتی صدقہ دینے والوں پر اور

فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ

ان پر جو نہیں پاتے مگر اپنی حیثیت مطابق پس یہ سخری کرتے ہیں ان سے تو خدا ان کو

ہے۔جس کا شکر ادا نہ کیا جائے تو میری اتباع کر۔ مجھے اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر چاہوں تو سونے چاندی کے پہاڑ میرے ہمرکاب ہو کر چلیں۔ پس وہ خاموش ہو کر چلا گیا۔ پھر ایک دن حاضر ہو کر کہنے لگا۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ خدا مجھے مالدار کر دے۔ اور مجھے اُس پروردگار کی قسم جس نے آپ کو نبوت عطا فرمائی ہے۔ میں حقوق مالیہ ضرور ادا کروں گا۔ پس آپ نے اس کے حق میں دعا فرمائی جو مستجاب ہوئی۔ پس اُس نے بکریاں خریدیں جو کیڑوں مکوڑوں کی طرح بڑھنے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا مال اس قدر بڑھ گیا کہ مدینہ میں نہ سما سکتا تھا۔ پس مجبوراً وادی میں چلا گیا۔ اور پھر اس قدر بڑھا کہ اُسے مدینہ سے دُور جانا پڑا حتیٰ کہ جمعہ و جماعت کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ پس جب حضور نے زکوٰۃ کی طلب کے لئے قاصد بھیجے تو اس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہنے لگا کہ یہ تو جزیہ ہے۔ پس حضور نے افسوس ظاہر فرمایا اور آیت مجیدہ میں اسی قصّہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور انجام کار اس کا یہ ہوا کہ وہ منافقوں کی فہرست میں درج ہو گیا۔ اور بخل و عہد شکنی نے نتیجۃً اس کو نفاق دے دیا اور بمقتضائے فرمانِ خداوندی وہ توبہ پر موفق نہ ہو سکا۔ اور یہ سب کچھ اس کی عہد شکنی کی ہی سزا تھی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ثعلبہ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر مالدار ہو جاؤں تو اس سے صدقہ کروں گا اور ہر صاحبِ حق کو حق دوں گا۔ چنانچہ اس کا ایک چچا زاد جو بڑا مالدار تھا۔ فوت ہو گیا۔ اور سوائے اس کے اس کا کوئی دوسرا وارث نہیں تھا۔ پس اس کا سب مال بطور وراثت کے اس کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور یہ مالدار بن گیا۔ لیکن اپنے کئے وعدوں سے منحرف ہو کر منافق بن گیا۔ اور ممکن ہے کہ دونو روایتیں صحیح ہوں۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ حضور کے پاس عبدالرحمٰن بن عوف صدقہ کے لئے ایک تھیلی روپوں کی بھر لایا۔ اور عتبہ بن زید حارثی ایک صاع کھجور لے آیا۔ اور عرض کی کہ حضورؐ! میں نے باغ میں مزدوری کی ہے۔ اور مجھے دو صاع ملے ہیں۔ پس ایک صاع بچوں کے لئے گھر میں رکھا ہے۔ اور دوسرا صاع حضورؐ کے پیش خدمت ہے۔ یہ سُن کر منافقوں نے کہنا شروع کر دیا کہ عبدالرحمٰن بن عوف نام و نمود چاہتا ہے۔ لہٰذا ریا کی خاطر اُس نے تھیلی پیش کی ہے۔ اور خدا کھجور کے ایک صاع سے بے نیاز ہے۔ پس زیادہ دینے والے کو ریا کا طعنہ دیا۔ اور تھوڑا دینے والے کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اور خدا اسی کا ذکر فرما رہا ہے کہ مومنین میں سے جو مخیر ہیں ان پر بھی طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اور جو اپنی محنت کے اندازے سے تھوڑا دینے پر قادر ہیں ان کو حقارت آمیز لہجہ سے خطاب کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا وہ جو اپنی کمائی میں سے بچا کر

اللّٰہُ مِنۡهُمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۹﴾ اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡؕ اِنۡ

اس کا بدلہ دے گا اور انکے لئے عذاب دردناک ہوگا ان کے لئے بخشش طلب کرو یا نہ کرو (برابر ہے) اگر ان

تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا

کے لئے بخشش ستر مرتبہ بھی طلب کرو تو ہرگز نہ بخشے گا خدا ان کو کیونکہ انہوں نے اللہ اور اسکے رسول کیساتھ

بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۸۰﴾

کفر کیا اللہ ایسے سرکش لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا

غربت و افلاس کے باوجود دیا جائے۔

وعظ و عبرت۔ صرف ان منافقوں کا ذکر پڑھ سُن کر خود عبرت حاصل نہ کرنا انتہائی نا عاقبت اندیشی ہے۔ کیا دورِ حاضر میں اربابِ خیر پر اس قسم کے الزامات نہیں عائد کئے جاتے۔ نیز غربا کے عطیوں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اگر ایسا ہے تو اپنی اس باطنی مرض کی طرف توجہ دینی ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی آیات تاقیام قیامت ہر آنے والے مسلمان کو صحیح راستہ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ پس نیک نصیب ہے وہ انسان جو ان تعلیمات کو دل میں جگہ دے اور عمل کی سعادت حاصل کرے۔

سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا ان کو سخری کی سزا دے گا۔ ورنہ خدا تو کسی سے سخری نہیں کرتا۔

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ۔ تفسیر منہج الصادقین میں ہے کہ عبداللہ بن ابی کا لڑکا جس کا نام عبداللہ تھا۔ مخلص مومنوں میں سے تھا۔ جب اُس کا باپ بیمار ہوا تو خدمت پیغمبر میں حاضر ہو کر عرض کی کہ حضورؐ! میرے باپ کے لئے دعا کیجئے تو یہ آیت اُتری کہ آپ اُن کے لئے دعا کریں یا نہ کریں دونو صورتیں برابر ہیں بلکہ اگر ستر بار بھی دعا کریں تو خدا ان کو نہیں بخشے گا۔ اور ستر مرتبہ کا لفظ کثرت ظاہر کرنے کی ایک تعبیر ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ میں نے ہزار مرتبہ یہ بات کہی یا بیسیوں بار یہ کہا تو اس قسم کی تعبیروں سے وہ عدد خاص طور پر مقصود نہیں ہوا کرتا۔ پس یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ آپ خواہ کتنی بار ان کے لئے دعا مغفرت کریں۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ کافر تھے۔ اور خدا ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔

نتیجہ۔ آیت مجیدہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ منافق ہوں ان کے لئے رسول کی منہ مانگی دعا بھی قابل قبول نہیں۔ لہٰذا ان کا رسول کے ساتھ رہن سہن اور اُٹھ بیٹھ ان کو کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ پس اگر مومن ہوگا تو رسول مخصوص نام لے کر اس کے لئے دُعا نہ فرمائیں۔ تب بھی وہ مومنوں کے ساتھ خدا کے کئے وعدہ میں شریک ہوگا۔ اور جنّت عدن میں بطابق مضمون سابقہ آیات کے اس کو ٹھکانا ملے گا۔ خواہ وہ مومن عربی ہو یا عجمی صحابی ہو یا غیر صحابی۔ اور اپنا قریبی ہو یا بیگانہ۔ نیز رسول کے پاس کبھی بیٹھا ہو یا اسے کبھی یہ اتفاق نہ ہوا ہو۔ لیکن بخلاف اس کے اگر منافق ہوگا تو خواہ عربی ہو صحابی ہو قریبی ہو۔ پاس بیٹھنے والا ہو حتیٰ کہ رسول منہ بول کر بھی اس کے لئے خدا سے رضا طلب کرے تو کارآمد نہ ہوگی۔ چہ جائیکہ دوسرے لوگ خدا کی رضامندی کا اس کے لئے پروانہ لئے پھریں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا

خوش ہوئے پیچھے چھوڑے ہوئے اپنے بیٹھ رہنے پر پیچھے رسول اللہ کے اور ناپسند کیا جہاد کرنا

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ

اپنے مالوں اور جانوں سے راہِ خدا میں اور کہنے لگے کہ نہ کوچ کرو گرمی میں کہہ دیجئے دوزخ کی آگ

اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ

بہت سخت گرم ہے کاش وہ سمجھتے ہوتے پس ہنس لیں تھوڑی مدت اور روئیں بہت مدت

رکوع نمبر ۱۷۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ۔ غزوہ تبوک پر جاتے ہوئے جن منافقوں نے چھٹی مانگ لی تھی اور حضورؐ نے ان کو پیچھے چھوڑا تھا۔ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہیں۔ یہاں خلاف کے دو معانی جائز ہیں۔ ایک تو خلاف خَلف سے یعنی جن کو پیچھے چھوڑا گیا تھا۔ اور دوسرے خلاف مخالفت کے معنی میں یعنی جن کو پیچھے چھوڑا گیا۔ وہ جناب رسالت مآبؐ کی مرضی کے خلاف گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہیں۔

وَقَالُوْا۔ یہ قول ان کا اپنا باہمی مکالمہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ گرمی میں نہ نکلو یا یہ کہ مومنوں کو جنگ سے باز رکھنے کے لئے کہتے تھے۔

فَلْيَضْحَكُوْا۔ تعبیر صیغۂ امر سے کی گئی ہے۔ اور اس کا معنی خبر کا ہے۔ یعنی ان کو ہنسا تھوڑا نصیب ہوگا۔ اور رونا ان کا طویل و پائدار ہوگا۔ اور اس کی تین وجوہ ہیں۔

۱۔ یعنی اگر یہ لوگ حقیقت کو سمجھیں کہ جہاد کو ترک کرنے میں ان کو ملا کیا ہے۔ اور ان سے فوت کیا کچھ ہوا ہے کہ دنیا میں ذلت و خواری ملی۔ اور آخرت میں عذاب دائمی حاصل ہوا۔ اور جنت کی نعمات کھو بیٹھے۔ پس یہ سمجھنے کے بعد ان کا ہنسنا تھوڑا رہ جائے گا۔ اور رونا طویل ہوگا۔

۲۔ یا یہ کہ بذریعہ وحی ان کی منافقت کا پردہ چاک ہونے کے بعد مسلمانوں کے دلوں سے ان کا وقار ختم ہو گیا۔ لہٰذا ان کی دنیاوی زندگی بھی مکدر اور گندلی ہو گئی کہ تکالیف زیادہ بڑھ گئیں۔ اور خوشی کے مواقع بہت کم رہ گئے۔

۳۔ یہ کہ اس موقع سے قبل مسلمانوں کے ساتھ مل کر جو ان کو خوشی کے مواقع دستیاب تھے۔ اب رسوائی کے بعد بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ اور نعمات اُخرویہ سے محرومی کا رونا تو بہر کیف دائمی ہے ہی۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ۔ ارشاد ہے کہ اگر آپ غزوہ تبوک سے با خیر و عافیت واپس جائیں اور ان منافقوں سے پھر ملنا جلنا ہو تو اب ان سے سابقہ برتاؤ ترک کر دیں۔ اور اگر دوبارہ جہاد کیلئے دشمنوں کے مقابلہ میں خروج کی نوبت آئے اور یہ منافق اپنی نصرت کی پیش کش بھی کریں تو قبول نہ فرمائیں۔ اور ان کو واشگاف الفاظ میں دو ٹوک کہہ دیں کہ تم ہمارے ساتھ

جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۲﴾ فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ

بدلہ اس کا ہے جو وہ کماتے ہیں پس اگر تمہیں خدا پلٹائے طرف ان کی جماعت کے پس

فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا مَعِيَ

وہ آپ سے کوچ کی اجازت چاہیں تو کہدیجئے کہ ہرگز نہ نکلو میرے ہمراہ بالکل اور ہرگز نہ لڑو میرے ساتھ

عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ﴿۸۳﴾

دشمنوں سے کیونکہ تم خوش ہوئے بیٹھ رہنے پر پہلی مرتبہ پس بیٹھے رہو ساتھ پیچھے رہنے والوں کے

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا

اور نہ نماز جنازہ پڑھیے ان پہ جو مر جائے بالکل اور نہ ٹھہرئیے اس کی قبر پر تحقیق وہ کافر ہیں

بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَ

اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اور مرتے ہیں درحالیکہ فاسق ہیں اور نہ تم کو تعجب میں ڈالیں ان کے مال اور

أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ

اولادیں سوائے اس کے نہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کو عذاب دے انہی کی بدولت دنیا میں اور نکلیں ان کی روحیں

ہرگز نہ نکلو کیونکہ ہمیں تمہارے ساتھ لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم گھر بیٹھے ہی بھلے ہو۔

مومن اور منافق کا جنازہ

وَلَا تُصَلِّ ۔ اس سے قبل دستور تھا کہ منافقوں پر مسلمانوں کے احکام جاری کئے جاتے تھے، اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھی جاتی تھی۔ لیکن غزوہ تبوک کے بعد یہ حکم امتناعی نازل ہوا کہ ان میں سے مرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کے لئے دعا کرو۔

صافی میں بروایت کافی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ بعض لوگوں کا جنازہ پانچ تکبیریں پڑھتے تھے۔ اور بعض لوگوں کا جنازہ چار تکبیریں پڑھتے تھے۔ پس جب کسی پر چار تکبیریں پڑھتے تھے تو پتہ چلتا تھا کہ یہ منافق تھا۔

دوسری روایت میں آپ سے ہی منقول ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نماز جنازہ پڑھتے تھے تو پہلی تکبیر کے بعد شہادتین۔ دوسری تکبیر کے بعد صلوات انبیاء پر۔ تیسری تکبیر کے بعد مومنوں کے لئے دعا۔ چوتھی تکبیر کے بعد میت کے لئے دعا۔ اور پانچویں تکبیر پڑھ کر ختم کر دیتے تھے لیکن جب منافقوں پر جنازہ پڑھنے سے ممانعت ہوئی تو پہلی تکبیر کے بعد

وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ

درحالیکہ وہ کافر ہوں اور جب اُترے کوئی سورہ کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو ساتھ رسول

رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٨٦﴾

کے تو چھٹی مانگتے ہیں جو ان میں سے مالدار ہیں اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ دیجئے تاکہ پیچھے بیٹھنے والوں میں ہو جائیں

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾

وہ راضی ہیں کہ ہوں ساتھ پیچھے بیٹھنے والیوں کے اور مہر لگائی گئی ان کے دلوں پر پس وہ نہیں سوچتے

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ

لیکن رسول اور وہ جو اس کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور جانوں سے اور انہی

لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨٨﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

کے لئے ہی خوبیاں ہیں اور وہی نجات پانے والے ہیں ان کے لئے تیار کئے ہیں اللہ نے باغات

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٨٩﴾ ع

جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں کہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے

شہادتین دوسری کے بعد صلوات انبیاء پر اور تیسری کے بعد دعا مومنین کے لئے اور چوتھی تکبیر پر ختم کر دیتے تھے اور میت کے لئے دعا نہیں مانگتے تھے۔ یعنی مومن کا جنازہ پانچ تکبیریں اور منافق کا چار تکبیروں سے پڑھا کرتے تھے۔ اور اسی مضمون کی روائتیں اہل سنت کی کتب صحاح ستہ میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ صحیح ترمذی میں صاف طور پر ہے کہ حضور مومن کا جنازہ پانچ تکبیروں سے پڑھا کرتے تھے۔ پس جنہوں نے حضور کو پانچ تکبیریں پڑھاتے دیکھا وہ پانچ پڑھتے ہیں۔ اور جنہوں نے حضور کو چار تکبیریں پڑھاتے دیکھا وہ اب بھی چار پڑھا لیتے ہیں۔

وَاِذَآ ۔ یعنی منافقوں کا وتیرہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی ان کو دعوت جہاد دی جاتی تو ان میں سے مالدار عذر خواہی کرتے تھے کہ ہمیں گھر میں رہنا دیا جائے گویا ان کا خدا اور رسول کی فرمائشات پر ایمان ہی نہیں تھا۔

اَلْخَوَالِفِ ۔ خالفہ کی جمع ہے یعنی وہ عورتیں جو گھر میں رہیں اور مردوں کے لئے بھی یہ استعمال ہوا ہے جیسے خَالِفٌ وَخَالِفَةٌ اور مذکر کے لئے فاعل کا صیغہ صرف دو مقام پر فواعل کے وزن پر آیا ہے۔ ایک فارس کی جمع فوارس اور دوسرے هالک کی جمع هوالک۔ بہرکیف اس جگہ خوالف سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام نے معذور قرار دے کر گھر میں بیٹھے رہنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ مثلاً بچے۔ بوڑھے۔ عورتیں اور بیمار لوگ۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ

اور آگئے عذر کرنے والے بدؤں میں سے کہ ان کو بیٹھنے کی اجازت ملے اور (بلا عذر) بیٹھ گئے وہ جنہوں نے جھٹلایا اللہ

وَرَسُوْلَهٗ ۚ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ

اور اس کے رسول کو تو پہنچے گا ان کو جو کافر ہیں۔ ان میں سے عذاب دردناک نہیں

عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ

نہیں اوپر کمزوروں کے اور اوپر بیماروں کے اور نہ اوپر ان کے جو نہیں رکھتے خرچہ

حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۚ وَاللّٰهُ

کوئی حرج جب کہ وہ خیر خواہی کریں اللہ اور اس کے رسول کی نہیں ہے اوپر احسان کرنے والوں کے گرفت اور خدا

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور نہ (حرج) ہے اوپر ان کے جو تیرے پاس آکر سواری طلب کرتے ہیں اور تو فرماتا ہے کہ

مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا

نہیں میرے پاس کہ تمہیں سوار کروں اور وہ واپس جاتے ہیں درحالیکہ ان کی آنکھیں روتی ہیں آنسو غم کے کہ وہ نہیں رکھتے

مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ

خرچہ بس گرفت ان لوگوں پر ہے جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ دولت مند ہیں

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

وہ خوش ہیں کہ پیچھے رہنے والیوں میں رہ جائیں اور مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر بس وہ نہیں جانتے

اَلْخَيْرٰتُ ۱۰۳ ۔ ان منافع کو کہا جاتا ہے۔ جو انسان کے لئے سکون کا فائدہ دیں۔ مثلاً حسین وجمیل عورتیں۔ اور دیگر نعماتِ خداوندی۔ پس دنیا میں بھی خدا کی طرف سے مومنوں پر احسانات و کرامات کا نزول ہوتا ہے۔ اور آخرت میں نعماتِ جنت بھی انہی لوگوں کے لئے ہیں۔ پس دنیا و آخرت کی دونوں زندگیوں میں ان کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

رکوع نمبر ۱۸۔ وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ ۔ گویا تخلف کرنے والوں کے دو گروہ تھے جن کی اس آیت میں نشاندہی ہے۔ ایک گروہ وہ تھا جنہوں نے جنگ میں نہ جانے کے لئے معذرت کرتے ہوئے اجازت مانگ لی تھی۔ اور دوسرا

گروہ جو بغیر اجازت کے جنگ میں شرکت کرنے سے پیچھے رہا تھا۔

لَیْسَ ۔ مروی ہے کہ عبداللہ بن ام مکتوم خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی میں نابینا ہوں ۔ اور میرے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے لے جائے تو آپ خاموش ہوئے ۔ اور یہ آیت اُتری۔

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ ۔ مروی ہے کہ سات آدمی حاضر ہوئے اور عرض کی حضور! ہم مجبور ہیں ۔ جی چاہتا ہے لیکن خرچ نہیں اور سواری نہیں کہ جاسکیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ سواری تو میرے پاس بھی نہیں کہ تمہیں دے سکوں ۔ پس وہ مایوس ہو کر روتے ہوئے واپس گئے اور یہ آیت اُن کے حق میں اُتری۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ غزوہ تبوک میں آپ کے ہمرکاب تیس ہزار مجاہد گئے تھے جن میں سے صرف دس ہزار سوار تھے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ

عذر پیش کرتے ہیں تمہارے سامنے جب تم پلٹے ان کی طرف کہدیجئے عذر پیش نہ کرو ہم نہ مانیں گے تمہاری کوئی بات ہمیں بتا دی

نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ

ہیں خدا نے تمہاری باتیں اور عنقریب دیکھے گا خدا تمہارا عمل اور اس کا رسول پھر پلٹائے جاؤ گے طرف

اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ

غیب وشہادت کے جاننے والے کے پھر تمہیں بتائے گا جو تم عمل کرتے ہو وہ خدا کی

بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ

قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے جب پلٹو گے ان کی طرف تاکہ درگذر کرو ان سے پس ان سے منہ پھیر لو تحقیق وہ

رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا

نجس ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کسب کرتے رہیں قسمیں کھاتے ہیں تمہارے سامنے تاکہ

عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

راضی ہو جاؤ ان سے پس اگر تم راضی بھی ہو جاؤ ان سے تو اللہ تو راضی نہ ہو گا فاسق لوگوں سے

رکوع نمبر ۱۱ ۔ يَعْتَذِرُوْنَ ۔ منقول ہے کہ وہ اسی شخص تھے جو باوجود مالدار ہونے کے عذر کرکے بیٹھ گئے ۔ اور خدا انہی کے متعلق فرماتا ہے کہ جب تم واپس جاؤ گے تو وہ عذر داریاں پیش کریں گے لیکن ان کو کورا جواب دے دینا کہ ہم تمہارا عذر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ خدا نے ہمیں تمہاری حقیقت حال سے خبر دے دی ہے ۔

فَسَيَرَى اللّٰهُ ۔ یعنی اگر تم صحیح معنوں میں معذرت پیش کر رہے ہو تو عنقریب اس کی قلعی بھی کھل جائے گی کہ آیا تم سچ مچ تائب ہو اور اپنی سابقہ چالوں سے باز آچکے ہو یا صرف زبانی ہی زبانی باتیں بناتے ہو ۔ یعنی تمہارے آئندہ کے اعمال وکردار تمہاری عذرداریوں کی حقیقت کو واضح کر دیں گے ۔

سَيَحْلِفُوْنَ ۔ یعنی وہ قسمیں کھا کر تمہیں کہیں گے کہ ہم سے درگذر کرو یعنی ہمیں رسوا نہ کرو ۔ تو اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ ان کی باتوں میں سے ایک نہ سنو ۔ اور ان کو اپنے سے دور رکھو ۔ اور کسی قسم کی رعایت ان کے ساتھ نہ کرو ۔ اور ان سے بچو ۔ جس طرح نجس چیز سے بچا جاتا ہے ۔

لِتَرْضَوْا ۔ یعنی وہ تم کو قسم دیں گے کہ راضی ہو جاؤ لیکن میرا یہ فیصلہ ہے کہ تم راضی ہو یا نہ ہو میں تو ان لوگوں پر ہرگز راضی

نہ ہوں گا۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی راضی نہ ہونا۔ چنانچہ حدیث نبوی میں وارد ہے کہ جو شخص لوگوں کی ناراضگی صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے برداشت کرے تو خدا خود بھی اس سے راضی ہوگا اور لوگوں کو بھی اس سے راضی رکھے گا لیکن جو شخص اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس پر اللہ بھی ناراض ہوگا۔ اور لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی ناراضگی ڈال دیگا۔

مختصر قصۂ تبوک تفسیر جامع جلد ۳ میں اس طرح مذکور ہے کہ جب جنگ حنین کے بعد ملک عرب بت پرستی کی آلائش سے پاک ہوگیا تو حضورؐ کی خواہش ہوئی کہ ملک شام کو یونان و روم کو حکومت سے آزاد کرا کے ان کو اسلامی تعلیمات سے نوازا جائے۔ اور اسی اثناء میں ایک گشتی خبر مدینہ میں عام ہوگئی کہ رومی لوگ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے ایک لشکر جرار لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی فوجیں حمص میں داخل ہوچکی ہیں۔ پس حضور اکرمؐ نے اپنے صحابہ کو جہاد کی ترغیب دی۔ اور لوگوں کو جانی و مالی قربانی کا حکم دیا۔ اور اسی مضمون پر مشتمل ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا۔ چنانچہ حمد و ثنا پروردگار کے بعد ارشاد فرمایا۔ اے لوگو! سب سے اچھا اور سچا کلام قرآن ہے۔ انسان کا بلند ترین کردار تقویٰ ہے۔ سب سے بہترین ملت۔ ملت ابراہیم ہے۔ اور عمدہ ترین سنّت میری سنّت ہے۔ ثابت قدمی اور پائداری اچھا عمل ہے۔ اور تزلزل و سُستی بدترین کردار ہے۔ پیغمبر کی راہنمائی بہترین ہدایت ہے۔ اور دین خدا کے لئے شہادت بہترین موت ہے۔ نابینا وہ ہے جو ہدایت کے بعد گمراہی کو اختیار کرے۔ اچھا عمل وہ ہے جو سودمند ہو۔ اچھا راستہ وہ ہے جو پیروی کے قابل ہو۔ بدترین اندھا وہ ہے جس کے دل کی آنکھیں بند ہوں۔ کریم و سخی ہاتھ لئیم و بخیل ہاتھ سے بلند تر ہے۔ وہ تھوڑا مال جو کفایت کر سکے۔ اس زیادہ مال سے بہتر ہے جو سرکش بنا دے۔ بدترین عذر وہ ہے جو موت کے وقت یاد آئے۔ سخت ترین پریشانی قیامت کی پریشانی ہے۔ یقین جانیے کہ جھوٹ بڑا گناہ ہے۔ اور اچھی بے نیازی وہ ہے جو نفس کو قوت بخشے۔ عمدہ ترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ بلند ترین حکمت و دانائی خوفِ خدا ہے۔ دل کا بہترین نظریہ یقین پروردگار ہے اور زمانِ جاہلیت کے افعالِ زشت اور کردار بد سے توبہ کرنا ہے۔ شعر کہنا اور خیالات کو مرتب کرنا وسوسۂ شیطانی ہے۔ نشہ آور اشیاء کا استعمال گناہوں کی اصل ہے۔ عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ جوانی جنون و دیوانگی کا ایک شعبہ ہے۔ بدترین کسب سود خوری اور کثیف ترین غذا مالِ یتیم کا کھانا ہے۔ سعادت مند وہ ہے جو نصیحت کو قبول کرے۔ بدبخت وہ ہے جو شکمِ مادر سے بدبختی لے کر آئے۔ اے لوگو! تم میں سے کسی کو بھی چار ذراع زمین سے زیادہ نصیب نہ ہوگی۔ انجام تمہارا قیامت ہے۔ عمل کا دار و مدار انجام پر ہے۔ جو چیز یقیناً آنے والی ہے۔ اُسے نزدیک تر سمجھو۔ مومن کو گالی دینا فسق ہے۔ مومن کو قتل کرنا کفر ہے مومن کا گوشت کھانا (گلہ کرنا) گناہ ہے۔ مومن کے مال کی حرمت اُس کے خون کی حرمت کی مثل ہے۔ جو خدا پر توکل کرتا ہے خدا اس کی کفایت کرتا ہے۔ جو صبر کرتا ہے وہ کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ جو شخص درگذر کرے وہ لوگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرتا ہے جو شخص اپنے غصّہ کو پی لے وہ خدا کے نزدیک اجر کا مستحق ہے۔ چپ رہنے والے کو خدا دس گنا اجر دیتا ہے اور نافرمان کو عذاب کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے لئے اور حاضرین کے لئے دُعا بخشش فرمائی ۔

لوگوں نے جب یہ خطبہ سُنا تو آمادہ جہاد ہوئے۔ چنانچہ عرب کے اکثر قبائل جنگ تبوک کے لئے اعلان سنتے ہی پہنچنا شروع

ہو گئے۔ حر بن قیس کو آپ نے دعوت دی تو اس نے معذرت طلب کی اور اسی کے متعلق آیتؔ اتری جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے الخ" پھر اس نے کہنا شروع کر دیا کہ رومیوں کے ساتھ لڑنا آسان نہیں یہ لوگ جائیں گے تو انہیں پتہ چلے گا۔ اور منافقوں نے آپس میں مشورہ کر لیا کہ جب حضورؐ مدینہ سے باہر جائیں گے تو ہم اعلانیہ بغاوت کریں گے اور ان کی اہل وعیال کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ چنانچہ بذریعہ وحی حضورؐ کو اطّلاع ہو گئی اور جبریل نے یہ پیغام پہنچایا کہ اس سفر کا انجام جنگ نہیں ہوگا لہٰذا علی کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنا کر جائیے تاکہ منافقین اپنے مقصد پر کامیاب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا قائم مقام بنا کر سفر اختیار فرمایا۔

جب منافقوں نے دیکھا کہ ہماری تجویز ناکام ثابت ہوئی ہے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضورؐ کے لئے علیؑ کا ہمرکاب ہونا بارِ خاطر تھا لہٰذا اس کو ساتھ لے جانا گوارا نہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت علیؑ کے کانوں میں جب یہ خبر پہنچی تو آپ بھی روانہ ہو گئے اور لشکر اسلام کو پیچھے جا کر ملے۔ حضورؐ نے فرمایا یا علیؑ میں نے تمہیں اپنا قائم مقام بنا کر مدینہ میں چھوڑا تھا پھر کیوں آگئے۔ تو عرض کی حضورؐ منافقین کی طعنہ زنی سے تنگ آکر آمادہ سفر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا تو راضی نہیں کہ تیری منزلت مجھ سے وہ ہو جو ہارون کی موسیٰ سے تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد نبی اور کوئی نہیں ہوگا۔ اگر ہوتا تو وہ تو ہی ہوتا۔ تو ہی میرا خلیفہ وزیر اور دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔ پس حضرت علیؑ نے واپس مراجعت فرمائی۔

منافقین کو جب حضرت علیؑ کی واپسی کی اطّلاع ہوئی تو انہوں نے آپ کے قتل کی تجویز کی اور راستہ میں کنواں کھود کر اوپر خس وخاشاک ڈال دیئے تاکہ جب آپ اس میں گر جائیں گے تو اوپر سے سنگ باری کر کے ان کو قتل کر دیا جائے گاؔ آپ کا گھوڑا جب اس مقام پر پہنچا تو فوراً واپس ہو گیا اور کنوئیں کی اطّلاع اپنی زبان بے زبانی سے دے دی۔ آپ نے گھوڑے کو دعا دی اور حکم فرمایا کہ بے فکر ہو کر چلے جاؤ خدا ہمارا محافظ ہے۔ چنانچہ خدا نے اس جگہ کو مضبوط کر دیا۔ اور حضرت علی کا گھوڑا اوپر سے گذر گیا اور آپ کے ساتھی بھی گذر گئے۔ لیکن ان خس وخاشاک میں ذرّہ بھر لچک پیدا نہ ہوئی۔

اس کے بعد آپ نے کنوئیں کے منہ سے خس وخاشاک ہٹانے کا حکم دیا تاکہ منافقین کا مکر ظاہر ہو جائے۔ صحابہ دیکھ کر حیران تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جس طرح منافقوں نے میرے قتل کی تجویز کی تھی اسی طرح حضورؐ کے ہمراہ جانے والے بعض منافقین واپسی پر حضورؐ کے قتل کی بھی تجویز کریں گے لیکن خدا ان کو منافقوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ صحابہ نے عرض کی کہ بذریعہ خط حضورؐ کو منافقوں کے ارادہ فاسدہ کی اطّلاع دے دی جائے تو اچھا ہوگا۔ آپ نے فرمایا خداوند کریم کی جانب سے آپ کو پہلے اطّلاع ہو جائے گی۔ چنانچہ ادھر جبریل نے اطّلاع دے دی اور یہ آیت اتری ؔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ الآیۃ۔ پس حضورؐ نے اپنے صحابہ کو منافقوں کے اس کرتوت سے اطّلاع دی اور آیت پڑھ کر سنائی۔ اسی طرح منافقین کا لبسا اوقات رسولؐ خدا اور مومنین

؎۱ یہ آیت صفحہ ۸۰ پر گذر چکی ہے۔ ؎۲ وادی عقبہ کا قصہ صفحہ ۹۵/۹۸ پر گذر چکا ہے ؎۳ صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ ہو۔

کے بارے میں قسم قسم کی لغو و بے ہودہ باتیں کرنا اور اُن کے جواب میں خدا کی جانب سے سرزنش کے مضمون پر مشتمل اکثر و بیشتر آیات کا ذکر ہو چکا ہے صحابہ کرام میں سے بعض نیک دل اور خالص مومن افراد بھی ایسے تھے جو ابتداءً بعض وجوہ کی بنا پر حضورؐ کے ہم رکاب نہ ہو سکے تھے اور بعد میں پیچھے سے جا ملے تھے۔

ایک ابوخثیمہ جو نہایت بہادر قوی ہیکل اور وجیہ نوجوان تھا اس کے پاس عالی شان محل اور دو نوجوان خوبصورت عورتیں تھیں جن سے لطف اندوز ہونے اور دادِ عیش دینے کے خیالِ خام نے اُسے سعادتِ سفر سے محروم کر رکھا تھا۔ ایک دن اُسی پُرشکوہ محل میں اپنی ہر دو حسیناؤں کے ساتھ محوِ لذت و سرور تھا کہ یکایک طبیعت میں انقلاب آیا۔ محبوبِ پروردگار کا تپتی دھوپ میں اپنے جسم نازنین کو مصائب و آلام اور صعوبت سے ہمکنار کرنا خیال نشین ہوا۔ فوراً دل میں سوچا کہ واہ تو نعمت و عیش کوشی میں منہمک اور خدا کا حبیب اپنے خالق کی رضا کی خاطر باوجود شدت گرما کے مصروف جہاد: یہ بات ہرگز مناسب نہیں ہے۔ پس اِس خیال نے لذت و عیش کے تمام صنم بیک جنبش توڑ کر رکھ دیئے۔ ایمان نے یاوری کی۔ اور محبتِ رسولؐ نے بڑھ کر استقبال کیا پس اٹھا۔ آلاتِ حرب و ضرب سے لیس ہوا۔ اپنی دونو محبوب نوجوان بیویوں سے وداع کیا اور مختصر سا زادِ راہ لے کر محل کا دروازہ کھولا۔ اور برق رفتار شتر پر سوار ہو کر انجام سے بے نیاز ہو کر اور دُنیاوی لذت و عیش بلکہ ہر محبت سے الگ تھلگ محبت خدا و رسولؐ کے جذبہ میں سرشار ہو کر عازمِ سفر ہوا۔ اِدھر گردِ راہ دیکھ کر صحابہ عرض گذار ہوئے کہ حضورؐ کوئی آتا دکھائی دے رہا ہے آپ نے فرمایا یہ ابوخثیمہ ہے بڑھ کر اس کا استقبال کرو۔ چنانچہ وہ جونہی بارگاہِ نبویؐ میں مشرف ہوا تو حضورؐ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ

دوسرے حضرت ابوذر غفاری تھے جو تین دن کی تاخیر سے کاروانِ رسالت سے جا ملے۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کی سواری کا اُونٹ بیمار تھا۔ اور طے مسافت سے قاصر تھا۔ پس انہوں نے اونٹ کو آزاد کر دیا۔ اور رختِ سفر کندھے پر اٹھا کر گردِ راہِ فوج اسلام کے تابع ہو لیا۔ تیسرے دن مسلمانوں نے ظہر کے وقت اِدھر سے آتے ہوئے ایک پیادہ کی خبر حضرت رسالت مآبؐ کے گوش گذار کی تو آپؐ نے فرمایا وہ ابوذر ہو گا۔ پس اُس کی پیش قدمی میں جلدی کیجئے کہ وہ پیاسا بھی ہے۔ چنانچہ جب ابوذر حاضر ہوا تو اُس کے پاس پُر از آب مشک دیکھ کر فرمایا۔ اے ابوذر! پانی کے باوجود پیاسا کیوں چلا آیا؟ عرض کی حضور! اثنائے راہ میں ایک چشمہ کے قریب سے گذرا جس کا پانی نہایت صاف و شفاف و شیریں تھا۔ پس دل میں خیال کیا کہ پہلے حبیبِ کبریا اس پانی کو پیئیں گے پھر میں پیوں گا۔ چنانچہ مشک کو اسی پانی سے بھر کر آپ کی خاطر لایا ہوں۔ آپ نے ابوذر کے حق میں دُعائے خیر کی۔ اور فرمایا۔ تیرے اُوپر خدا کی رحمت ہو۔ اے ابوذر! تیری زندگی تنہائی کی ہو گی۔ اور تیری موت بھی تنہائی کی ہو گی۔ اور تو اسی حالت میں مبعوث ہو گا اور داخلِ بہشت ہو گا جب تو حالتِ غربت و تنہائی میں مرے گا تو عراق سے کچھ لوگ آئیں گے اور تیری تجہیز و تکفین و دفن کا انتظام کریں گے۔

حضرت ابوذر جناب رسالت مآبؐ کے ان صحابہ میں سے تھے جو زہد و تقویٰ اور ایمان کی منازلِ رفیعہ پر فائز تھے۔

قبل از اسلام بھی لوٹ گھسوٹ اور مار دھاڑ کی وارداتوں سے الگ تھلگ اپنی ذہبیوں سے گذر اوقات کرتے تھے اور جناب رسالتمآب کی وفات کے بعد ان پر ظاہری اقتدار کی جانب سے مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹے۔ لیکن اس حق گو مرد مجاہد کا مضبوط قدم جادۂ حق سے سر مو نہ ہٹایا جا سکا۔ ان کو شام بھیجا گیا تو خوشامدیوں کے زمرہ میں شریک ہونے کی بجائے صاف گوئی کو اُنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا پھر واپس مدینہ میں آئے تو کلمۂ حق کہنے میں کبھی کرسیٔ اقتدار سے مرعوب نہ ہوئے۔ بالآخر انہیں ربذہ کی طرف جلا وطن کیا گیا۔ آخری عمر میں ان کے پاس صرف اپنی ایک لڑکی تھی جو صحرائے ربذہ میں نہایت پریشانی سے رہ کر اپنے باپ کی خدمت بجالاتی تھی توکل کا یہ عالم تھا کہ جب آخری وقت بیمار ہوئے تو ربذہ میں رہنے والے چند آدمی حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور عرض کی کہ آپ کو کسی شے کی شکایت تو نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا مجھے اپنے گناہوں سے شکایت ہے۔ اُنہوں نے پوچھا اب کسی شے کی خواہش ہے؟ تو فرمایا۔ ہاں۔ رحمتِ پروردگار کی۔ اُنہوں نے پوچھا طبیب کی ضرورت ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ طبیب نے ہی تو مجھے بیمار کر رکھا ہے۔

بہرکیف لڑکی نے جب باپ کو بستر بیماری پر دیکھا تو اپنا سر اور منہ پیٹ لیا۔ اور عرض کی اے پدر بزرگوار! اگر اس حالتِ غربت میں آپ پر موت آجائے تو میں کیا کروں گی۔ ابوذر نے لڑکی کی یہ پریشانی دیکھ کر نہایت اطمینان و سکون سے اس کی دلداری کی۔ اور فرمایا کہ مجھے اپنے آقا حضرت رسالت مآبؐ نے عالمِ غربت میں مرنے کی خبر دی تھی اور فرمایا تھا کہ عراق کا ایک قافلہ مجھے دفن کرے گا۔ پس جب میرا وقتِ موت قریب ہو تو مجھے قبلہ رُخ لٹا کر میرے اُوپر عبا ڈال دینا اور راستہ پر بیٹھ جانا جب قافلہ گذرے تو کہنا کہ اس لق و دق صحرا میں میرا باپ حضرت ابوذرؓ مر گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابوذر کی روح قفسِ عنصری سے نکل کر جنت آشیاں ہوئی تو اس کی لڑکی باپ کی وصیت کے مطابق میت پر عبا پھیلا کر راستہ پر قافلہ کی انتظار میں جا بیٹھی۔ جب قافلہ کا گذر ہوا تو لڑکی آگے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس قافلہ میں مالک اشتر موجود تھے۔ جونہی اس لڑکی پر ان کی نظر پڑی تو پوچھا تو کس کی لڑکی ہے اور یہاں کیوں کھڑی ہے؟ اُس نے جواب دیا میں حضرت ابوذر غفاری کی لڑکی ہوں۔ میرے باپ کا اس عالمِ غربت میں انتقال ہو چکا ہے اس کی تجہیز و جنازہ کے لئے انتظار کر رہی ہوں۔ پس مالک اشتر سواری سے پیدل ہوئے اور اُس کے ساتھ دیگر صحابہ رسولؐ بھی اُترے اور غسل و کفن کا انتظام کیا پھر جنازہ پڑھ کر نہایت عزت و احترام سے ان کو دفن کیا

بہرکیف جنگِ تبوک کے لئے غلاموں کے علاوہ پچیس ہزار مجاہدین کی جمعیت ہو گئی تھی۔ جب مسلمانوں کا یہ لشکر حدودِ شام میں داخل ہوا تو ادھر شام کے تمام اُمراء و سلاطین جن میں مملکت منقسم تھی جمع ہو کر مسلمانوں کے پاس پہنچے۔ اور حضورؐ کے قدموں میں گر گئے۔ بعض مسلمان ہو گئے اور بعض نے جزیہ قبول کر لیا۔ پس اسلام کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا اور سلاطین دہر کے دلوں پر رُعب قائم ہو گیا۔ جب بادشاہِ روم ہرقل کو اطلاع پہنچی کہ ملکِ شام کے جملہ حکام پیغمبر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال کر اسلام یا جزیہ قبول کر چکے ہیں تو اُس نے اپنی جانب سے نمائندے بھیجے جو پیغمبر اسلام کے کردار و سیرت اور دستورِ تعلیم کے متعلق معلومات فراہم کر کے اطلاع دیں۔ چنانچہ وہ مقام تبوک میں پہنچ کر مشرف بہ زیارت ہوئے۔ اور آپ کا صدقہ کو رد کرنا اور ہدیہ کا قبول کرنا

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ

بدوی لوگ زیادہ سخت ہیں کفر و نفاق میں اور لائق ہیں کہ نہ جانیں وہ حدود جو نازل کیں

اور دیگر آپ کے خصالِ حمیدہ کی اطلاع بادشاہ کو بھیجی۔ بادشاہ نے سن کر دل سے اسلام کو قبول کر لیا اور اعیان مملکت وارکانِ سلطنت کے علاوہ ملک کے عوام و خواص کو دعوتِ نبوی سے خبردار کیا۔ اور اسلام کے حلقہ بگوش ہونے کی پیش کش کی، لیکن اُنہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو زوالِ سلطنت کے خطرہ سے چار و ناچار بادشاہ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

حضور اکرمؐ نے تبوک میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد مراجعت فرمائی اور واپسی پر راستہ میں منافقین کی ناپاک کوششوں کا انکشاف ہوا جس کا مختصراً تذکرہ ہو چکا ہے۔ وادی عقبہ میں حضور کے قتل کی ناپاک سازش کا تذکرہ صلا۹ پر ملاحظہ ہو۔

مومنین مخلصین کی ایک جماعت جو بعض مجبوریوں کی وجہ سے غزوہ تبوک میں حضورؐ کے ہمرکاب نہ جا سکی تھی اور تیاری کرتے ہوئے آج اور کل کے تردّد میں اُنہوں نے وقت گذار دیا تھا چنانچہ ان میں سے کعب بن مالک شاعر۔ مرارہ بن ربیع اور ہلال مرافقی بھی تھے اور یہ کہتے تھے کہ حضورؐ کی روانگی کے بعد ہم کہتے تھے۔ آج جائیں گے، کل جائیں گے اور اسی آج اور کل میں وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اور دُوسرے بھی کئی لوگوں نے اسی قسم کی سستائی سے وقت ضائع کیا۔

جب حضور اکرمؐ واپس پہنچے تو ہم خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کی نیز تہنیت پیش کی کہ آپ بحمداللہ بخیر و عافیت واپس پہنچے ہیں تو آپ نے منہ پھیر لیا اور جواب سلام تک نہ دیا اور تمام مسلمانوں نے ہم سے یہی سلوک کیا حتیٰ کہ مسجد میں ہم پہنچے تو ہم سے کسی نے بات تک کرنا بھی گوارا نہ کیا جب ان کی عورتوں نے یہ خبر سُنی تو وہ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ اگر ہمارے شوہر عذابِ خداوندی کے مستحق قرار پائے ہیں تو کیا ہمیں بھی ان سے قطع تعلقی کر لینی چاہیے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں ان سے دُور ہو جاؤ اور قطع تعلقی کر لو حتیٰ کہ بچوں نے بھی ان سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔

کعب کہتا ہے کہ میں نے ہلال اور مرارہ سے کہا کہ آؤ شہر سے نکل جائیں اور کہیں دامن کوہ میں پناہ لے کر دن کو روزے رکھیں اور راتوں کو عبادتِ پروردگار میں بسر کر کے نہایت زاری و انکساری سے توبہ کریں۔ ممکن ہے ہماری توبہ کو خدا منظور کر لے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور تین دن متواتر شب و روز گڑگڑا کر تضرع و زاری سے توبہ کی اور اللہ سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگی۔ اور اس عرصہ میں یہ تینوں ایک دوسرے سے الگ الگ عالم تنہائی میں گریہ و زاری کرتے رہے۔ چنانچہ بالآخر ان کی توبہ بارگاہِ پروردگار میں قبول ہوئی۔ اور ایک رات حضور اکرمؐ ام سلمہ کے گھر میں تشریف فرما تھے کہ جبرئیل ان کی قبولیتِ توبہ کا مژدہ لائے۔ اور اسی سُورہ مجیدہ کی آیت ع۱۱۸ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ صلا۱۳۳ انہی تین تائبین کے حق میں اُتری ہے۔

اور تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ پہاڑ کے دامن میں گریہ زاری میں مشغول رہے اور پچاس دن متواتر اسی حال میں لگاتار روتے رہے۔ پس خداوند کریم نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور یہ آیت ان کے حق میں بھیجی۔

اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا

اللہ نے اپنے رسول پر اور اللہ جاننے والا دانا ہے اور بدوؤں میں سے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں

یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّیَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَیْہِمْ دَآئِرَۃُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰہُ

اپنے خرچ کو تاوان اور انتظار کرتے ہیں تمہارے لئے مصائب کی ان پر بدترین مصیبت آئے گی اور اللہ

سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

سننے جاننے والا ہے اور بدوؤں میں سے ایسے بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور قیامت پر اور

وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّہَا قُرْبَۃٌ

سمجھتے ہیں وہ جو خرچ کرتے ہیں باعثِ قربت اللہ کے نزدیک اور باعثِ خوشنودی رسول آگاہ ہو تحقیق یہ چیز باعث

لَّہُمْ ؕ سَیُدْخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیْ رَحْمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾ ع

قرب ہے ان کے لئے داخل کریگا اللہ ان کو اپنی رحمت میں تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اَلْاَعْرَابُ ۔ خداوندکریم ایک دستورِ عمومی کی طرف اشارہ فرما رہا ہے کہ شہری اور دیہاتی زندگیوں میں بہ معتدبہ فرق ہوا کرتا ہے کہ دیہاتی لوگ تہذیب و تمدن کے مخصوص پہلوؤں سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اور اسبابِ علم سے دُور رہنے کی وجہ سے اپنے نظریہ پر زیادہ مضبوط ہوا کرتے ہیں۔ وہ جلدی سے کسی دوسرے کی بات کو قبول نہیں کرتے اور ان کو ان کے قدیم نظریہ کے خلاف کسی جدید نظریہ کا قائل کرنا نہایت مشکل ہوا کرتا ہے۔ اسی بنا پر اگر وہ کافر ہوں گے تو کفر کو چھوڑنا ان کے لئے مشکل ہوگا اور اگر وہ مومن ہوں گے تو ایمان کے تقاضوں سے حتی الامکان عہدہ برا ہونے کی کوشش کرینگے بخلاف شہری طبقہ کے کہ ان کے مزاج میں پختگی اور دوام ایک حد تک سلب ہو جاتا ہے۔ اور نئے تہذیب و تمدن اور ہر جدید طرزِ عمل کو بہت جلد اپنا لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات سمجھنے میں نہایت آسان ہے۔ اور دورِ حاضر کی شہری اور دیہاتی زندگیوں میں اسلامی اصول کی پذیرائی میں نمایاں فرق اس امر کا شاہد ہے۔ پس اس جگہ خدا بھی اسی نظریہ کو دُہرا رہا ہے کہ بدوی لوگ کفر و نفاق میں سخت تر ہیں۔ اور حدودِ خداوندی کو نہ جاننے میں وہ پیش پیش ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدینہ کے آس پاس کے بدوؤں میں خصوصی ہٹ دھرمی موجود ہو۔

بہرکیف اسلام کو جن بدوؤں نے صرف ڈر اور خوف سے یا دیکھا دیکھی سے قبول کیا تھا وہ ظاہراً مسلمان تھے لیکن اندر اندر سے پکے کافر تھے۔ وہ راہِ خدا میں خرچ کرنا تاوان سمجھتے تھے۔ اور مسلمانوں پر دورِ حوادث اور

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

اور پہلے سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ لوگ جو ان کے پیچھے چلے خوبی سے

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ

راضی ہوا خدا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کیں ان کے لئے بہشتیں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں

مصائب کے منتظر رہتے تھے۔ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ خود ہی مصائب و حوادث کا شکار ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ایسے بدوی لوگ بھی موجود ہیں جو اسلام کو دل و جان سے قبول کر چکے ہیں وہ خوشنودی خدا اور پیغمبرؐ کی دعا کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔

رکوع ۲

وَالسّٰبِقُوْنَ خداوند کریم آیت کریمہ میں ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کی مدح فرما رہا ہے۔ اور یہ بات مخفی نہیں کہ جس طرح کسی برائی کی طرف پہلا قدم اٹھانے والا اپنے جرم کے علاوہ تمام ان لوگوں کے گناہوں کا بھی ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جو اس کے پیچھے چل کر اس برائی کا ارتکاب کریں۔ چنانچہ حدیث میں یہ مضمون بکثرت وارد ہے کہ مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ لَهٗ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا کہ جو کسی برائی کی رسم قائم کرے تو اس کی گردن پر تمام ان لوگوں کے گناہوں کے برابر بوجھ ہوگا جو اس بری رسم پر عامل ہوں گے۔ اسی طرح کسی نیکی کی طرف پہل کرنے والا اپنے ذاتی عمل کے ثواب کے علاوہ ان لوگوں کے کار خیر میں بھی حصہ دار ہوگا جنہوں نے اس کے نقش قدم پر چل کر وہ نیکی کی۔ چنانچہ حدیث میں یہ مضمون بھی بکثرت موجود ہے کہ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا۔ یعنی جو شخص کسی نیکی کی سنت قائم کرے تو اس کے لئے ان تمام لوگوں کے برابر ثواب ہوگا جنہوں نے اس پر عمل کیا ہوگا۔ آیت مجیدہ میں اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں اور ان کے نقش قدم پر چل کر اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں کا ذکر خیر ہے۔ اور یہ آیت ان کے لئے رضائے پروردگار کا پروانہ بھی ہے۔ اور وعدۂ جنت اور اس میں ہمیشہ بسنے کی رسید بھی۔

لیکن فکر و تدبر کے بعد اس مقام پر جو سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ان کا تجزیہ اور تحقیق کسی حد تک ضروری ہے تاکہ مقصد صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکے۔

۱۔ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کے مصداق کون لوگ ہیں؟ ۲۔ تمام مسلمانوں میں سے سابق الایمان کون شخص ہے؟ ۳۔ آیا کسی کا صرف سابق الایمان ہونا رضائے پروردگار کے لئے کافی ہے یا اس پر ثابت قدم رہنا بھی ضروری ہے؟ ۴۔ اسی طرح نیک نیتی سے ایمان لانا کافی ہے یا اس پر تا زیست برقرار رہنا بھی ضروری ہے؟ ۵۔ رضائے پروردگار کے حاصل کرنے کے لئے تو ایمان ضروری ہے لیکن آیا ایمان کے تقاضوں کو بھلا دینے کے بعد رضائے پروردگار کا وعدہ ختم ہو جائے گا یا باقی رہے گا؟ ۶۔ اسی طرح جنت کی پیش کش اور اس میں ہمیشگی کا عہد ایمان کی بقا کے ساتھ وابستہ ہے۔ یا ایمان کے رخصت ہونے کے بعد بھی وہ عہد باقی رہے گا؟

سابقون سے کون لوگ مُراد ہیں

آیت مجیدہ میں ظاہراً سابقون کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ۱۔ مہاجرین ۔ ۲۔ انصار ۳۔ تابعین ۔ اور یہ ترتیب بھی بظاہر مراتب کے اعتبار سے ہے ۔ گویا سابقون میں سب سے افضل وہ ہیں جو مہاجرین بھی ہوں ۔ اور دُوسرا درجہ انصار سابقین کا ہے ۔ اور تیسرا درجہ تابعین کا ہے اور تابعین سے مُراد یہاں وہ لوگ ہیں جو سابق مہاجرین و انصار کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش زمانِ حیاتِ پیغمبرؐ میں ہو گئے ۔ گویا یہ تین قسمیں صحابہ میں سے ہی ہیں ۔ پس صحابہ کے دَور کے بعد والے دَور کو تابعین سے تعبیر کرنا اصطلاحِ جدید ہے ۔

یہ قابلِ ذکر امر ہے کہ ہجرت اور نصرت سابقون کے مفہوم میں داخل نہیں ہے ۔ جیسا کہ من بیانیہ کے معنی سے صاف ظاہر ہے ۔ پس یہ معنی درست نہ ہو گا کہ کہا جائے وہ لوگ جو ہجرت میں سابق ہیں یا وہ لوگ جو نصرت میں سابق ہیں اور اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں ۔

۱۔ اگر ہجرت یا نصرت میں سبقت مُراد ہو تو مہاجرین سابقین کی انصار سابقین پر کوئی فوقیت ثابت نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ ہجرت بغیر نصرت کے بے معنی ہے ۔ اور چونکہ ظاہری ترتیب سے ترتیب مراتب و مدارج کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے اس امر کا اعتراف کیا ہے لہذا ماننا پڑتا ہے کہ سبقت کا معیار کوئی دوسری چیز ہے اور وہ ہے ایمان ۔ اور یہ مومنین کے مدارج کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین جو سابقون و اوّلون ہیں ان میں سے مہاجر انصار سے افضل ہیں اور انصار بعد والوں سے افضل ہیں

۲۔ مقصد یہ ہے کہ ایمان ہی ان کی ہجرت کا داعی ہوا ہے ۔ اور ایمان ہی کی بدولت انہوں نے نصرت پیغمبرؐ کی طرف اقدام کیا ہے ان صفتوں میں بنیادی اور مرکزی حیثیت ایمان کو حاصل ہے پس اس کے بعد ہجرت کرنا یعنی اپنی جائداد املاک گھر وطن بلکہ بعض اوقات اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو چھوڑنا نہایت کٹھن مرحلہ ہے لہذا جن لوگوں نے ایمان کی خاطر ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے ہجرت قبول کی ان کا درجہ صرف نصرت کرنے والوں سے بلند تر ہے کیونکہ مہاجرین کی ہجرت خود اپنے مقام پہ ایک نصرت ہے ۔ اور علاوہ ازیں انصار کے دوش بدوش بھی نصرت میں ان کا حصہ ہے ۔ پس ان کی نصرت انصار کی نصرت سے دوگنی ہے ۔ اور ترکِ وطن اور عزیزوں اور قریبیوں کا فراق نیز جائدادوں اور املاک سے دستبرداری ان کی ایسی قربانی ہے کہ اس میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے ۔

۳۔ اگر ہجرت و نصرت میں سبقت مُراد لی جائے تو وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ کا معنی درست نہیں بن سکتا ۔ کیونکہ اس سے قبل صحابہ کے دو گروہوں کا بیان ہے ۔ ایک سابق فی الہجرت اور دُوسرے سابق فی النصرت ۔ اب تیسرا گروہ وہ ہو گا جو پہلے دونوں گروہوں کے نقشِ قدم پر چلے ۔ یعنی مہاجر بھی ہو اور ناصر پیغمبرؐ بھی ۔ لہذا مدینہ میں پہنچ جانے کے بعد جن مدنی لوگوں نے اسلام کو قبول کیا وہ صرف انصارِ اولین کے تابع ہوئے مہاجرینِ اوّلین کے تابع نہ ہوئے ۔ اسی طرح فتح مکہ کے بعد جن مکی لوگوں نے اسلام قبول کیا ۔ اور ہجرت نہ کی وہ بھی انصار سابقین کے تابع ہوئے ۔ مہاجرین سابقین کے تابع نہ ہو سکے ۔ پس تیسرے گروہ کا وجود مشکل ہو جائے گا ۔ لیکن اگر سابقون میں سبقت سے مراد سبقتِ ایمانی ہو تو بلا تردّد تیسرے گروہ کا معنی سمجھ آسکتا ہے کہ

پہلا صفتِ ایمان میں سابق مہاجر گروہ۔ دوسرا صفتِ ایمان میں سابق انصار کا گروہ اور تیسرا وہ گروہ جو مہاجرین سابقین اور انصار سابقین کے بعد اسلام وایمان کی صفت سے متصف ہو۔

۴۔ مہاجرین میں سے جو مومنین سابق الایمان ہیں وہ ان سے افضل ہیں جو انصار میں سے سابق الایمان ہیں۔ اور چونکہ ان کی افضلیت ان کی قربانیوں کی عظمت کے پیشِ نظر ہے۔ لہٰذا صلح حدیبیہ سے قبل ہجرت کرنے والے مومنین ہی مُراد لیے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ مفسرین کا نظریہ ہے کیونکہ صُلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کرنا اس قدر مشکل امر نہیں تھا جتنا پہلے تھا اور جو قربانی قبل از صُلح حدیبیہ ہجرت کرنے والوں نے کی تھی۔ بعد از صلح اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ پس ہجرت میں سبقت کا مفہوم اس لحاظ سے پایا جاتا ہے لیکن سابقون کی لفظ کی دلالت سے نہیں بلکہ خارجی امور اور اہم خالاہم کے اعتبار سے ہے۔ اور اسی طرح انصار میں سے بھی جو سابق فی النصرہ ہوں گے وہ افضل ہوں گے۔ پیچھے ملحق ہونے والوں سے کیونکہ سابق نصرت جبکہ اسلام نہایت کمزور تھا۔ اسلام کے اطراف عالم میں پھیل جانے کے بعد کی نصرت سے کہیں زیادہ وزنی اور اہم ہے۔

۵۔ وہ شخص جو کسی نیکی کے میدان میں پہلا قدم رکھے وہ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً الخبر کے مصداق ہونے کے لحاظ سے تمام ان لوگوں سے افضل ہوگا جو بعد میں اس نیکی کی طرف اقدام کریں پس جو شخص سابق الایمان ہونے کے ساتھ سابق الہجرۃ بھی ہو وہ باقی تمام سابق افراد سے افضل ہوگا۔ خواہ وہ صرف سابق الایمان ہوں اور سابق الہجرت نہ ہوں یا سابق الہجرۃ ہوں لیکن سابق الایمان نہ ہوں۔ کیونکہ سابق الایمان اور سابق الہجرۃ کی دونوں وصفوں میں باہمی تلازم نہیں ہے۔ پس پہلا ہجرت کرنے والا گروہ بعد میں ہجرت کرنے والوں سے افضل ہوگا۔ اسی طرح پہلا نصرت کرنے والا بعد میں نصرت کرنے والوں سے افضل ہوگا۔

مزید وضاحت

یہ واضح رہے کہ جمع کا صیغہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سابقین سے مہاجرین کی ایک جماعت مُراد ہے۔ چنانچہ مہاجرین سابقین سے بعض مفسرین نے وہ صحابہ مُراد لئے ہیں۔ جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نمازیں ادا کیں اور بعض نے صُلح حدیبیہ سے پہلے کے مہاجرین بتائے ہیں۔ اور انصار سابقین سے مُراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بعثتِ نبوی کے گیارہویں سال منیٰ میں جاکر آپؐ کی بیعت کی تھی۔ اور ان کی تعداد سات تھی۔ اور پھر دوسری مرتبہ مقام عقبہ پر بیعت کی جن کی تعداد ستّر مرد اور دو عورتیں تھیں۔

مہاجرین انصار سے اس لئے افضل ہیں کہ ان میں دو وصفیں ہیں۔ ایک ہجرت اور دوسری نصرت۔ کیونکہ جہاں ان کا ہجرت کرنا بھی اسلام کا موجب تھا۔ وہاں اس نصرت کے علاوہ ظاہری جنگوں میں بھی دوسرے انصار کے دوش بدوش تھے۔ پھر مہاجرین کے دو حصے ہوگئے۔ ایک سابق اور دوسرے تابع اور ان میں سے سابق افضل ہیں کیونکہ یہ لوگ بعد والوں کے لئے تحریک کے باعث ہوئے ہیں۔ اور پھر مہاجرین سابقین میں سے وہ افضل ہیں جو سابق الایمان ہیں کیونکہ تمام فضائل میں سے بنیادی حیثیت ایمان ہی کو حاصل ہے اور اس کے بغیر کوئی دوسری صفت فضیلت نہیں بن سکتی۔ لہٰذا جو ایمان میں سابق

ہوگا وہ تمام مومنین سے افضل ہوگا خواہ مہاجر ہوں خواہ انصار ہوں۔ اور اگر سابق الایمان شخص ہجرت اور نصرت میں بھی سابق ہو تو اس کی فضیلت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

فخر الدین رازی کی منطق

تفسیر کبیر ج ۴ صفحہ ۲ پر کہتا ہے کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ سابقون سے مُراد وہ لوگ ہیں جو ہجرت اور نصرت میں سابق ہوں اور اس کی دو وجہیں ہیں (۱) چونکہ خدا نے سابقون فرمایا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ کس میں سابق ہوں تو لفظ مجمل ہوگئے۔ لیکن بعد میں جب مہاجرین و انصار سے ان کا ہونا ذکر کیا تو یہ دونوں لفظیں اس سابق اجمال کے دُور کرنے کا قرینہ بن گئیں۔ لہذا ضروری ہوا کہ سابقون سے مُراد وہ لوگ ہوں جو ہجرت یا نصرت میں سابق ہوں تاکہ اجمال دُور ہو جائے (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ہجرت ایک زبردست قربانی ہے جو رسول کے دل کی تقویت کا باعث ہے۔ اور اسی طرح نصرت بھی ایک بڑا اہم کام ہے۔ لہذا سابقون کے مفہوم میں ہجرت اور نصرت کو ہی دخل ہونا چاہیئے

اَقُوْلُ۔ ہم متعدد دلیلوں سے اس مطلب کو باطل کر چکے ہیں۔ اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ سابقون سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان میں سبقت رکھتے ہوں۔ فخر الدین نے اپنی منطقی استعداد سے جو سابقون کا اجمال دُور کیا وہ صرف اس لئے کہ وہ اس کھوکھلی بنیاد پر اپنے زعم میں ایک نہایت عالی شان محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جب ثابت ہو گیا کہ سابقون سے مُراد وہ لوگ ہیں جو ہجرت میں سابق ہوں تو ماننا پڑے گا کہ حضرت ابوبکر ہجرت کرنے میں تمام سے سابق تھے۔ کیونکہ وہ حضورؐ کے ہمرکاب اور ساتھی تھے اور حضرت علیؑ اگرچہ مہاجرین اوّلین میں سے تھے لیکن ان کی ہجرت حضورؐ کی ہجرت کے بعد ہے اور اس میں شک نہیں کہ حضرت علی بھی حضرت رسالت مآبؐ کے اہم اُمور کی انجام دہی کی خاطر مکہ میں رہ گئے تھے تاہم ہجرت میں حضرت ابوبکر کو ہی سبقت حاصل ہوئی۔ پس اس فضیلت میں حضرت ابوبکر کا حصہ سب سے زیادہ ہوا۔"

اور ملا محمد عبدہ صاحب تفسیر منار نے اگرچہ اس بات پر تقریباً اتفاق ظاہر کیا ہے کہ سبقت سے مراد سبقت ایمانی ہے لیکن انہوں نے ایک نیا راستہ اپنی مطلب براری کے لئے نکال لیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں وَلَا كُلُّ سَابِقٍ اَفْضَلُ مِنْ كُلِّ مَسْبُوْقٍ یعنی ضروری نہیں کہ ہر سابق مسبوق سے افضل ہو وَمِنَ السَّابِقِيْنَ بِالْاِيْمَانِ مَنْ سَبَقَهٗ غَيْرُهٗ بِالْهِجْرَةِ کیونکہ سابق الایمان لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ ہجرت میں دُوسرے لوگ اس سے سبقت لے گئے اور یہ سب کچھ حضرت علی کے سابق الایمان ہونے کی فضیلت کو چھپانے کی سعی بے سُود ہے۔ بہر کیف ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ایمان کے بغیر کسی صفت کو کوئی درجۂ فضیلت حاصل نہیں ہے اور صفت ایمان ہی مدار و محور ہے۔ تمام باقی صفات کے لئے۔ پس سبقت الایمان ہی علی الاطلاق افضل ہونے کا معیار بن سکتی ہے۔ اور حضرت علی علیہ السلام کا سابق الایمان ہونا چونکہ فریقین میں مسلم ہے لہذا تمام اُمت سے ان کا افضل ہونا آیت مجیدہ کی رُو سے ثابت ہو گیا۔

ہجرت کا حُسن

یہ جاننا ضروری ہے کہ ہجرت کا حسن ذاتی نہیں یعنی ضروری نہیں کہ جب بھی ہجرت پائی جائے وہ اچھی بھی ہو بلکہ ہجرت کا حسن یا قبح غرض و غایت یا نتیجہ کی اچھائی یا برائی کے تابع ہوگا اگر اچھائی کے لئے

ہجرت ہوگی تو ہجرت اچھی ہوگی ورنہ نہیں۔ آیت مجیدہ میں مہاجرین کو جو مدحیہ رنگ میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ صرف ہجرت کے حسن کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے کہ یہ ہجرتِ رسول کے مشن (یعنی اسلام کی بقاء وارتقاء) کے لئے ازحد ضروری ہے۔ اس میں رسالتمآبؐ کی حفاظت اور تقویت کا راز مضمر تھا گویا یہ ہجرتِ رسول اور اسلام کی بہت بڑی نصرت تھی۔ اور اس نصرت کا درجہ دوسری ظاہری نصرت سے کہیں زیادہ تھا۔ پس مہاجرین کو انصار پر فوقیت اسی بنا پر دی گئی تو معلوم ہوا کہ معیارِ فضیلت ہے۔ نصرتِ رسولؐ اور تقویت اسلام۔ ہجرت سے قبل یہ ذمہ داری حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہ نے اپنے ذمہ لی ہوئی تھی کہ اگر حضرت ابوطالب کی نصرت وتائید شامل حال نہ ہوتی تو مکہ میں اسلام کی توسیع واشاعت کا سلسلہ ہی قائم نہ ہوتا پس حضور کو کھل کر سرمیدان حقانیتِ اسلام پر تقریر کرنے کی جرأت حضرت ابوطالب کی سرپرستی سے حاصل تھی۔ اور لوگوں کو ذہنی طور پر اسلام کی تعلیمات سے متاثر کرنا شرک وبت پرستی کے عیوب کی وضاحت اور اسلام کے نظام کی ہر دلعزیزی اور لوگوں کے جملہ شکوک وشبہات کا ازالہ وغیرہ حضور اکرمؐ کے بیانات۔ کلا مرہونِ منت تھا جس کو آپ نے خوب نبھایا۔ اور تھوڑے عرصہ میں لوگوں کے دلوں کو جیت لیا پھر اسلام کے حلقہ بگوش ہونے میں جو مالی نقصانات کا اندیشہ تھا اور قریش سے قطع تعلقی کے بعد اقتصادیات کی کمزوری کا جو خطرہ تھا۔ اس کو حضرت خدیجہ کی مالی قربانی وایثار نے بہت حد تک رفع کر دیا۔ پس حضور نے نہایت اطمینان وسکون سے تبلیغ اسلام کا سلسلہ بلادریغ شروع کر دیا کیونکہ مزاحمت کرنے والوں کے آگے حضرتِ ابوطالب کا رعب واقتدار حائل تھا اور مالی کمزوری کا شکوہ کرنے والوں کے لئے خدیجہ کا دسترخوان بچھا تھا اور وہی لوگ جو ایمان واسلام کے حلقہ بگوش ہونے میں حضرت ابوطالب وجناب خدیجہ کے ممنون احسان تھے۔ ان ہر دو محسنِ اسلام شخصیتوں کی وفات کے بعد ہجرت مکہ پر مجبور کر دیے گئے اور تمام تاریخیں شاہد ہیں کہ ابوطالب کی وفات کے بعد خداوند کریم کی جانب سے ہجرت کا حکم ہوا کیونکہ اب مکہ میں ان کا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا۔ پس حضرت رسالت مآبؐ حضرت ابوطالب کی نصرت اور حضرت خدیجہ کی تائید کے ختم ہو جانے کے بعد نصرت وتائید کے طالب تھے۔ اور ہجرت کے بعد کی تاریخ اسلام شاہد ہے کہ حضرت علی نے جس طرح حضور کی نصرت وتائید کی کوئی دوسرا اس کے عشر عشیر تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اور یہ بات ذہن نشین رہے کہ صحابہ کی ہجرت ونصرت حضرت ابوطالب اور خدیجہ کی نصرت کے قائم مقام ہے۔ لہذا جن مہاجرین کے تفاوتِ درجات کا آیتِ مجیدہ میں ذکر ہے وہ وہی ہیں جو ان دونوں کے علاوہ ناصرینِ پیغمبرؐ کے زمرہ میں داخل ہوئے

جب ہجرت کا حکم ہوا تو قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس وقت جب کہ کفار قتل رسولؐ کے درپے تھے تو سب سے اہم معاملہ رسول کی حفاظت کا تھا۔ اب ایک طرف ہے۔ رسول کے بستر پر آرام کرنا تاکہ کفار یہ سمجھتے رہیں کہ حضور محوِ خواب ہیں لہٰذا تعاقب نہ کر سکیں اور دوسری طرف ہے رسول کی معیت میں سفر کرنا تاکہ آپ تنہا نہ رہیں۔ ہر صاحب عقل ودانش جان سکتا ہے کہ موقع ومحل کی نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی حفاظت کی خاطر ان کے بستر کو خالی نہ چھوڑا جائے تاکہ حضور مقامِ محفوظ تک پہنچ جائیں اور ان کی جان پر کوئی آنچ نہ آئے ورنہ اگر بستر خالی ہوتا تو کفار فوراً تعاقب کر کے غار ثور تک پہنچنے سے قبل ہی آپ کا کام تمام کر دیتے۔ اور اسلام کا جگمگاتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو جاتا اور وہاں ایک یا دو ساتھی کفار کے حملہ کو ہرگز نہ روک سکتے۔ پس حفاظت کے لئے

سب سے بڑی قربانی بسترِ رسول پر سونا تھا جس میں جان جانے کا خطرہ بھی تھا۔ بخلاف اس کے ساتھ جانے میں ایک طرف اگر ہجرتِ ظاہری سے تقویتِ رسول مقصود ہو بھی تاہم اس میں ایک غرض ذاتی بھی ہے اور وہ ہے حفاظتِ جانِ خود۔ پس حضرت علیؑ نے اپنی جان کی قربانی دے کر جانِ رسول کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ اور حضرت ابوبکر نے اپنی جان کو بچا کر رسول کا ساتھ اختیار کیا تو چونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ہجرت میں ذاتی حسن نہیں ہے بلکہ ہجرت کا حسن غرض و غایت اور مقصد کے حسن کے تابع ہے اور فعل کی بلندی اور اہمیت مقصد کی بلندی اور اہمیت کے تابع ہوتی ہے تو اب صاحبانِ عقلِ سلیم کے لئے فیصلہ نہایت آسان ہے کہ ابوبکر کی ہجرت کا مقصد رسول کی صحبت ہو سکتا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی جان کی حفاظت بھی اس کا لازمہ تھی۔ اور حضرت علیؑ کے بسترِ رسول پر سونے کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا یعنی حفاظت پیغمبر خواہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی جان بھی چلی جائے چنانچہ نتیجہ یہی ہوا کہ کفار حضرت علی کو سوتا دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ حضورؐ بنفسِ نفیس سوئے ہوئے ہیں لہذا تعاقب نہ کر سکے اور اتنے میں حضور مقامِ محفوظ تک پہنچ گئے تو معلوم ہوا کہ نصرتِ پیغمبرؐ میں اہم کردار وہی تھا جو علیؑ نے ادا کیا۔ پس ان کی بسترِ رسولؐ پر شب خوابی ابوبکر کی معیت رسولؐ میں شب بیداری اور ہجرت سے افضل تھی۔ لہذا رازی کا یہ کہنا کہ ہجرت میں سبقت صرف حضرت ابوبکر کو ہی حاصل ہے۔ درست ہے لیکن اس میں فضیلت کا کوئی خام سے خام پہلو بھی نظر نہیں آتا جس پر فخر کیا جا سکے۔ اور یہ کہنا کہ ان کی ہجرت تقویّت رسول کی موجب تھی۔ صرف کوتاہ نظری اور خوش فہمی ہی خوش فہمی ہے۔ ورنہ اگر یہ صحبت رسول کی تقویت یا تسکین کی موجب ہوتی تو جناب رسالت مآبؐ لَا تَحْزَنْ نہ فرماتے جو شخص خود غم و حزن کا اس قدر شکار ہو کر خدا اور رسول کو بار بار چپ کرانے کی ضرورت محسوس ہو۔ وہ کسی دوسرے کے لئے اطمینان و سکون کیسے اور کہاں سے میسر کریگا اور اس کی تفصیل اسی جلد میں گذر چکی ہے۔ اور ثانیاً رازی کا اپنا اعتراف ہے کہ حضرت علیؑ جناب رسالت مآبؐ کی جانب سے بعض امور کی انجام دہی کے لئے ٹھہرے تھے۔ اور اگر یہ بات ہے تو پھر بھی حضرت علیؑ کا ان امورِ خاصہ کی انجام دہی میں رسول کا معتمد خصوصی ہونے کو ثابت کرتا ہے بلکہ رسول کے قائم مقام ہونے کی صلاحیّت کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ سفر میں ساتھ تو ایک غلام کو بھی لے جایا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے مقام پر کسی کو اپنی مخصوص ذمّہ داریوں سے عہدا برا ہونے کے لئے ٹھہرانا ایسی بڑی عظمت کو ظاہر کرتا ہے جو ساتھ جانے والے میں اس کی ادنیٰ مقدار بھی مبالغہ آمیز متصور ہوتی ہے۔ پس یہ کہنا کہ علی الاطلاق ہجرت کرنے میں سبقت کرنے والے دوسروں سے افضل ہیں۔ ایک دعویٰ بلا دلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ البتہ عمومی طور پر یہ کہنا درست ہے کہ مہاجرین کا درجہ انصار سے بلند ہے اور اولین کا درجہ متاخرین سے بڑا ہے۔

علیؑ سابق الایمان ہے

اور ہمارے سابق بیان سے واضح ہو گیا ہے کہ حضرت علیؑ تمام اُمّت سے افضل ہیں۔ کیونکہ تمام مؤرخین کا مسلّمہ امر ہے کہ حضرت علی سابق الایمان ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اہمیّت کو کم کرنے کے لئے کہا جائے کہ بچوں میں سابق الایمان حضرت علیؑ تھے ورنہ اگر تعصب سے بالاتر ہو کر عین انصاف سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ علیؑ سابق الایمان ہیں اور اس اعتبار سے وہ تمام ایمان والوں کے پیش رو ہیں۔ چنانچہ مسند احمد اور دیگر

کتب عامہ وخاصہ میں منقول ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وارد ہے۔حضرت علیؑ اس کے امیر و شریف ہیں (مسند احمد، تفسیر مجمع البیان میں تفسیر ثعلبی سے مروی ہے۔عفیف کندی کہتا ہے۔میں سفرِ تجارت میں ایکدفعہ ایام حج میں مکہ پہنچا اور چونکہ حضرت عباس بن عبدالمطلب سے دوستانہ تھا لہٰذا اس کے ہاں ٹھہرا۔اور یہ شخص یمن سے عطر خرید کر ایام حج میں مکہ میں بیچا کرتا تھا وہ کہتا ہے میں اور عباس منیٰ میں بیٹھے تو دیکھا ایک جوان آیا۔اور قبلہ رو کھڑا ہو گیا۔پھر ایک لڑکا آیا اور اس کے پہلو میں کھڑا ہو گیا پھر ایک پردہ دار آئی اور پیچھے کھڑی ہو گئی پس انہوں نے نماز پڑھی۔رکوع وسجود کیا۔میں نے عباس سے کہا یہ تو امر عظیم ہے۔اُس نے بھی کہا کہ ہاں امر عظیم ہے تو میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ تو اُس نے جواب دیا کہ یہ میرا بھتیجا محمد بن عبداللہ ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ خدا نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اور کہتا ہے کہ کسریٰ اور قیصر کو میں فتح دوں گا۔اور یہ لڑکا علی بن ابیطالب ہے۔اور عورت جناب خدیجہ بنت خویلد اس کی زوجہ ہے۔یہ دونوں اس دین پر اس کے تابع ہیں (حضرت علیؑ کی عمر اس وقت کم وبیش دس برس تھی) خدا کی قسم رُوئے زمین میں اُس دین پر سوائے ان تینوں کے اور کوئی نہیں تھا (عفیف کندی اسلام لانے کے بعد کہا کرتا تھا۔کاش اس وقت میں بھی مسلمان ہو جاتا تا کہ چوتھا شمار ہوتا)

نیز مروی ہے کہ حضرت ابوطالب نے ایک دفعہ حضرت علیؑ سے پوچھا اے بیٹے یہ کون سا دین ہے جس کو تو نے اختیار کیا ہے تو آپ نے فرمایا اے ابا جان! میں اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاچکا ہوں اور وہ جو کچھ فرمائیں میں اُس کو مانتا ہوں اور اللہ کی خوشنودی کے لئے ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتا ہوں تو ابوطالب نے کہا کہ بے شک حضرت محمدؐ نیکی کی دعوت دیتے ہیں۔لہٰذا ان کے طریقہ کو ہرگز نہ چھوڑو۔ایک اور روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے۔آپ نے فرمایا انا عبداللہ واخو رسوله وانا الصدیق الاکبر لا یقولها بعدی الاکذاب مفتر صلیت قبل الناس بسبع سنین

ترجمہ۔میں عبد خدا اور اس کے رسول کا بھائی ہوں۔اور میں ہی صدیق اکبر ہوں۔میرے علاوہ یہ دعویٰ کوئی کذاب ہی کرے گا میں نے تمام لوگوں سے پیشتر سات برس نماز پڑھی ہے (یعنی لوگ سات سال مجھ سے بعد ایمان لائے ہیں)

مسند سید ابوطالب ہروی سے بروایت منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرے اور علیؑ کے اوپر فرشتوں نے سات سال درود بھیجا کیونکہ اس عرصہ میں میرے اور علی کے علاوہ اور کوئی نمازی نہیں تھا (مجمع البیان)

تفسیر منہج الصادقین جلد ۲ ص۲۵۶ پر ابو نخلہ سے مروی ہے کہ میں نے موسم حج میں حضرت ابوذر سے دریافت کیا کہ لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔اب ہمیں کس کی پیروی کرنی چاہیئے۔تو ابوذر نے جواب دیا۔کتاب خدا اور علیؑ ان دونوں کو لازم پکڑو۔اور میں گواہی دیتا ہوں کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا تھا۔علی پہلا شخص ہے جس نے میری تصدیق کی۔اور یہ پہلا شخص ہے جو بروز قیامت میرے ساتھ مصافحہ کرے گا اور یہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہے کہ حق وباطل کے درمیان فرق کرے گا۔اور یہی دین اور مومنین کا یعسوب ہے جس طرح کہ مال ظالموں کا یعسوب ہے۔

رازی اپنے مقام پر سمجھتا ہے کہ علیؑ سابق الایمان ہے۔اسی بنا پر تو اس نے اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ سے مراد ہجرت

میں سبقت کرنے والے لئے ہیں تاکہ دستارِ فضیلت حضرت ابوبکر کے سر پر باندھی جائے۔ ورنہ اگر السّابقون سے مراد ایمان میں سبقت کرنے والے لئے جائیں تو حضرت علیؑ آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جو رازی کی قوتِ برداشت سے باہر ہے اور دعوتِ عشیرہ کے موقعہ پر تمام مؤرخین کے اتفاق سے حضرت علیؑ ہی ہیں جنہوں نے آوازِ پیغمبر پر صدائے لبیک بلند کی تھی اور دعوت میں آپؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ جو میری تصدیق کرے گا وہ میرا خلیفہ ہوگا۔ اور جنت میں میرا ساتھی ہوگا (مسند احمد بن حنبل) لیکن اس کی اہمیت کو کم کرنے کی خاطر رازی نے دبے لفظوں میں اقرار کر لیا۔ لیکن فوراً اس کی تاویل کے پیچھے پڑ گیا چنانچہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ لوگوں میں حضرت ابوبکر اور حضرت علیؑ کے سابق الایمان ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن اس قدر اتفاق ہے کہ مردوں میں سے ابوبکر عورتوں میں سے خدیجہ بچوں میں سے علی، اور غلاموں میں سے زید سابق الایمان ہیں۔ صرف ابوبکر کو اس صف میں کھڑا کرنے کے لئے چار گروہ بنا دیئے ورنہ اگر علی الاطلاق بتانا پڑتا کہ سب میں سے سابق الایمان کون ہے۔ تو سوائے علیؑ و خدیجہ کے اور کس کا نام لیتا؟ پس چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنے حسد و بغض کی پیاس بجھالی اور عوام کالانعام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا کھیل بھی کھیل لیا۔ اور اس پر بھی اکتفا نہیں کی۔ آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے ایمان لانے کے بعد تبلیغی فریضہ انجام دیا اور بہت سوں کو اسلام سے مشرف کرنے کی سعادت حاصل کی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں علیؑ چونکہ بچہ تھا لہٰذا وہ اس سعادت سے محروم تھا۔ پس ابوبکر کا سابق الایمان ہونا اسلام کے لئے مفید تھا۔ اور علی کا سابق الایمان ہونا صرف رسمی تھا۔ لہٰذا سابقون کا راس و رئیس صرف ابوبکر ہی ہے۔ خدا خود ہی حق پوشی کا ایسے حاسدین سے انتقام لے گا۔ اگر حضرت علیؑ کا ایمان بچپنے کی وجہ سے رسمی تھا۔ اور قابلِ قدر نہ تھا تو دعوتِ عشیرہ میں علیؑ کے لبیک کہنے پر حضرت رسولِ کریم نے ان کو تمغۂ اخوت و وصایت کیوں دیا۔ اور عہدِ خلافت کیوں کیا؟ تاریخ طبری ج ۲ ص۲۱۶ کامل ابن اثیر ج۲ ص۲۸ اور کنز العمال ج ۲ ص۳۹۲ دلائل الصدق) بلکہ اگر بنظرِ انصاف و امعان غور کیا جائے تو بچپنے کا ایمان بڑھاپے کے ایمان سے بدرجہا افضل و بہتر ہے کیونکہ علی کا بچپنے کا ایمان یہ ثابت کرتا ہے کہ صحابہ میں سے صرف علیؑ ہی وہ شخصیت تھے جنہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی شرک اور بت پرستی کی آلائش سے اپنی ذات کو آلودہ نہ کیا۔ لہٰذا صحابہ میں سے صرف یہی ذات ہے جو زیورِ عصمت سے آراستہ ہے اور مردوں میں سے حضرت ابوبکر کا ایمان گو باقی لوگوں سے پہلے ہو لیکن یہ تو کم از کم ثابت کرتا ہے کہ اکثر زندگی ان کی شرک اور بت پرستی میں گذری تھی لہٰذا وہ صرف مسلمان ہی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے جس نے اوّل عمر سے آخر تک کبھی بت پرستی نہ کی ہو وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جو ایک مدت تک کفر و شرک کی آلائشوں میں ملوث رہا ہو۔ اور اگر اس کے ساتھ سورہ ھود کی آیت نمبر ۱۱۳ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ الخ۔ یعنی ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جو کسی زمانہ میں ظلم کا ارتکاب کر چکے ہوں ورنہ جہنم میں جاؤ گے۔ اور ساتھ یہ بھی لحاظ رکھا جائے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو شخص شرک کے جرم کا ارتکاب کر چکا ہو وہ اس قابل نہیں کہ اس کی طرف جھکا جائے۔ لہٰذا مفہوم کے لحاظ سے یہ آیت ببانگ دہل پکار رہی ہے کہ ان کی طرف جھکو جنہوں نے اپنی پوری عمر کے کسی لمحہ میں بھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ پس اس سے

توحضرت علی کی خلافت بلافصل بطریق اولیٰ ثابت ہو جائے گی۔ اور حضرت علیؑ کا بچپنے کا ایمان کہ جس بنا پر ان کی سبقتِ ایمانی کو گھٹا رہے تھے وہ اُلٹا ان کے بنے بنائے سابق الایمان کے لئے مصیبت کا باعث بن گئی اور ان کی خلافت کے لئے بھی ایک چیلنج ہو گئی جس کا تا قیامت ان کے پاس جواب نہیں ہو سکتا۔ بہرکیف علیؑ کا سابق الایمان ہونا ان کی خلافت بلافصل کی دلیل ہے۔ خواہ اس کو بچپنے کا ایمان کہتے پھریں یا کوئی اور تاویل کرتے رہیں۔ علی کی اس فضیلت پر پردہ ڈالنا سورج پر گرد پھینکنے کے مترادف ہے۔

ایمان لانے والوں کے تین گروہ

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ آیت مجیدہ میں تین گروہوں کی خداوندکریم نے مدح فرمائی۔ ۱۔ سابقین اولین مہاجرین (۲) سابقین اولین انصار (۳) وہ جو ان سابقین کے پیچھے خیر وخوبی سے چلے۔

خداوندکریم نے سابقین کے پیچھے چلنے والوں کے تین گروہ بیان کئے۔

۱۔ وہ جو سابقین کے پیچھے نیکی وخوبی سے چلے۔ یعنی ایمان لانے کے بعد نیک عمل کئے (محسنین) ۲۔ وہ گروہ جو ایمان لائے صرف زبان سے اور دل میں مومنین کی مخالفت پر ڈٹے رہے (منافقین) ۳۔ وہ گروہ جو دل سے ایمان لائے۔ لیکن عمل میں نیکی اور بدی کو مخلوط کر بیٹھے۔ یعنی نیکی بھی کرتے رہے اور برائی سے بھی باز نہ آئے۔ ان کو مذبذبین کہا گیا۔ منافقین اور مذبذبین کا ذکر اگلی آیتوں میں آجائے گا۔ اس مقام پر محسنین کا ذکر ہے۔ اور خداوندکریم نے مہاجرین انصار اور محسنین ان ہر سہ گروہوں کو ذکرِ خیر سے یاد فرمایا ہے اور انہی کے لئے اپنی رضامندی کی پیش کش فرمائی۔ اور انہی کے ساتھ جنّت کا وعدہ فرمایا۔ تفسیر منار میں مفتی محمد عبدہ نے بڑے طمطراق سے لکھا ہے کہ صحابہ رسول کے ہر سہ طبقات کے لئے خدا کی جانب سے رضامندی اور وعدۂ جنّت روافض کی تردید کے لئے کافی ہے۔ آگے چل کر ایک روایت نقل کی ہے کہ حمید بن زیاد کہتا ہے۔ میں نے محمد بن کعب قرظی سے صحابۂ رسول کے متعلق پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ رسول کے تمام صحابہ خواہ نیک ہوں یا بد جنّت میں جائیں گے۔ میں نے پوچھا یہ کیسے؟ تو اُس نے یہی السَّابِقُوْنَ والی آیت پڑھی۔ اور کہا خدا نے تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک مہاجرین دوسرے انصار اور تیسرے تابعین اور پہلی دونو قسموں کے ساتھ نیکی یا بدی کی کوئی قید نہیں لگائی۔ لیکن تابعین کے ساتھ یہ قید لگا دی ہے کہ جو ان میں سے نیکی اور احسان کا راستہ اختیار کرے گا۔ پس مہاجرین وانصار کے ساتھ یہ قید نہ لگانا۔ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خواہ نیک ہوں یا بد۔ خدا ان سے راضی ہے اور وہ جنّت میں ضرور جائیں گے۔ لیکن تابعین یعنی بعد میں ایمان لانے والے صرف وہی جنّت میں جاسکیں گے جو نیک ہوں گے اور اس روایت کو رازی نے تفسیر کبیر ج ۲ ص۱۹۲ پر نقل کیا ہے۔

آلِ رسولؐ پر ظلم

دیکھیے یہ سب کچھ اہل بیت عصمت پر ظلم کرنے والوں اور ان کو تشدد کا تختۂ مشق بنانے والوں کے اعمالِ بد پر پردہ ڈالنے اور آلِ رسولؐ کی عظمت کو گھٹانے کے لئے ہی کیا جا رہا ہے۔ ورنہ کوئی صاحبِ عقلِ سلیم اس قسم کی خرافات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ دورِ اول کے لوگ بلاتمیز نیک و بد داخل جنّت ہوں۔ اور بعد والوں کے لئے

جنّت میں داخلہ کے لئے نیک ہونے کی پابندی عائد کردی جائے۔ اس کا مطلب تو صاف یہ ہوگا کہ جنّت کا انعام ایک کھیل ہے اور دوزخ کا عذاب سکھّوں والی پھانسی ہے کہ جس کے گلے میں فٹ آجائے۔ اسی کو لٹکا دیا جائے اگر اس اسلام کو اس حلیے سمیت اقوام عالم کے سامنے پیش کیا جائے تو اسلام اور اس کی تعلیمات محل تمسخر بن کر رہ جائیں۔ خداوند کریم اور اس کا پاک رسول اس قسم کے خیالات فاسدہ اور عقائد کاسدہ سے بیزار ہیں۔ اور اسلام میں اس قسم کے خرافات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خداوند کریم کا دین عقل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اور اس کے قوانین بلافرق امیر و غریب اور بلاتمیز خورد و کلاں تمام اہل عالم پر یکساں نافذ ہیں۔ اور جنّت صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جو خدا اور رسول پر ایمان لانے کے بعد اسلامی قوانین پر کاربند ہوں۔ اور مرتے دم تک کاربند رہیں۔ خواہ عرب ہوں یا عجم۔ خواہ اپنے ہوں یا بیگانے۔ نیز خواہ صحابہ ہوں یا غیر۔ لیکن اگر زبان سے دعویٰ ایمان کرتے رہیں اور اسلامی قوانین کی مخالفت کرتے ہوں۔ اور نیکی و بدی میں فرق نہ سمجھتے ہوں تو ایسے لوگ یقیناً خدا کی رضا کے مستوجب نہیں ہو سکتے۔ اور نہ خدا ان سے راضی ہوتا ہے ورنہ اگر خدا بُرے لوگوں سے راضی ہو۔ اور اچھے لوگوں سے بھی راضی ہو تو اچھائی و برائی کا کوئی فرق نہ رہے گا۔ العیاذ باللہ" اور پھر یہ کہ صحابہ کے لئے اچھائی و برائی کا فرق نہ ہو۔ اور باقیوں کے لئے ہو تو معاذ اللہ، خدا ظالم ٹھہرے گا۔ حالانکہ وہ خود عادل ہے اور عدل کی دعوت دیتا ہے۔ نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ کسی کے ظلم پر رضامند ہوتا ہے۔ نیز رضائے پروردگار اور وعدۂ جنّت کے لئے یہ ضروری ہے کہ جن کے ساتھ وعدہ ہے وہ تا زلیست صفتِ ایمان اور عمل صالح پر رہیں۔ ورنہ اگر ابتداء میں مومن ہوں اور بعد میں مرتد ہو جائیں تو قطعاً رضائے خدا کے وہ حقدار نہ ہوں گے۔ اور نہ اُن کے لئے وعدۂ جنّت ہوگا۔ لہٰذا جن لوگوں نے حضور رسالت مآبؐ کے بعد آلِ رسوؐل کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا اور حضرت علیؑ کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ اُن کا انجام اچھا نہ رہا۔ اور جب خاتمہ درست نہ ہوا تو خواہ مہاجر ہوں یا انصار۔ آیت مجیدہ کے اس وعدہ سے وہ باہر ہوں گے۔

نیز پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ تیسرے گروہ سے رسالت مآبؐ کے بعد والے تابعین مُراد لینا بعد والوں کی اصطلاح جدید ہے۔ ورنہ اس آیت مجیدہ میں ان سے وہ لوگ مُراد ہیں جو سابقین کے بعد صفتِ ایمان سے متصف ہوئے اور احسان کی صفت تینوں گروہوں میں سے ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ اور آخری گروہ کے ساتھ ذکر کرکے پہلے دونوں سے حذف کردی گئی ہے جس طرح وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ کو دو دفعہ ذکر کرنے کی بجائے صرف ایک دفعہ ذکر کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے حذف پر قرینہ قائم کیا ہے ورنہ چاہیئے تھا وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اور اس قسم کا حذف کلام عرب میں عام شائع ہے جیسے اَنْتَ بِمَا عِنْدَكَ وَنَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا رَاضُوْنَ۔ پس اس آیت میں بھی ایک دفعہ لفظ احسان کو ذکر کر دینے کے قرینہ سے مہاجرین و انصار میں احسان کی قید خود بخود سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں اس کو بڑھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ پس معلوم ہوا کہ مصداق آیت کے لحاظ سے وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ سے مُراد مہاجرین و انصار سابقین کے بعد ایمان لانے والے صحابی ہیں۔ لیکن "اول و باطن کے لحاظ سے تاقیامت بعد میں آنے والے کُل مومنین کو آیت شامل ہے۔ ورنہ آیت کا

مضمون ایک عرصہ محدود تک کے لئے محصور ہوجائے گا حالانکہ اس کی جملہ ہدایات تاقیامت جاری ہیں۔

رازی نے روایت متقدم الذکر میں ایک جملہ کا آخر میں اضافہ کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اِتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ مہاجرین وانصار تمام کے لئے خواہ نیک ہوں یا بد چونکہ رضوان خدا اور جنّت کا وعدہ ہے۔ لہٰذا خدا کے اس وعدہ میں بعد میں آنے والے وہی مومن داخل ہوں گے جو صحابہ مہاجرین وانصار کے نقش قدم پر چل کر ایمان قبول کریں گے۔ لیکن ان کی غلط کاریوں اور برائیوں پر نکتہ چینی نہ کریں گے۔ اور پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ بعد میں آنے والے اور اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والے مومنین بھی اس آیت کی رُو سے رضوان خدا اور وعدہ جنّت میں داخل ہیں لیکن ان کے لئے یہ شرط ہے کہ احسان اور نیکی سے ان کے پیچھے چلیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مہاجرین وانصار کے بارے میں اچھائی بیان کریں ورنہ اگر نکتہ چینی کریں گے تو اس انعام سے محروم رہیں گے۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ آیت مجیدہ کی آڑ صرف صحابہ کی اس روش پر پردہ ڈالنے کے لئے ہے جو آلِ رسولؐ کے ساتھ انہوں نے اختیار کی۔ اور شیعہ حضرات کو کوسنے کی خاطر ہی یہ منطق لڑائی جاتی ہے۔ لیکن بخاری شریف اور دیگر کتب معتبرہ کی ان احادیث کو کہاں چھپائیں گے جن میں صاف طور پر ہے اَلْفَاطِمَۃُ بُضْعَۃٌ مِّنِّیْ مَنْ اٰذَاھَا فَقَدْ اٰذَانِیْ۔ یعنی فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ اور غَضِبَتْ فَاطِمَۃُ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ کے بخاری کے غیر مبہم الفاظ کی کیا تاویل ہوگی۔ اور اس کے بعد اسی سورہ میں فرمانِ خداوندی کا کیا جواب ہوگا کہ جو خدا و رسول کو ایذا دے گا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اگر بقول بخاری فاطمہؑ کی ایذاء رسول کی ایذاء ہے۔ اور حضرت ابوبکر نے فاطمہ کو ایذاء بھی دی تو قرآن کی رُو سے ایذاء رسول دوزخ میں داخلہ کی ناقابلِ تردید سند ہے۔ اور صرف باتوں باتوں سے یا تاویلات سے یہ معاملہ ٹل نہیں سکتا۔ رضوان خدا اور جنّت صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو مومن رہے اور آخر دم تک صفت ایمان کے ساتھ ساتھ آلِ رسولؐ کے اطاعت گذار بھی رہے۔

اور رازی کے دل میں کھٹک ضرور ہے اور ان تمام باتوں کو سمجھتا ہے۔ لیکن باپ دادا اور گذشتگان کی اندھی تقلید نے اس کے دل و دماغ کو معطل کر رکھا ہے۔ چنانچہ آخر میں کہتا ہے کہ مہاجرین وانصار کے حق میں بہ لہجہ طعن لب کشائی کرنے والا رضائے خدا اور جنّت کی پیش کش سے اس لئے محروم ہے کہ وہ ان کے نقش قدم پر احسان و نیکی سے نہیں چلا کیونکہ دیندار مومنین اصحاب رسول کی تعظیم میں مبالغہ کے قائل ہیں۔ اور وہ ان کی غیبت و شکوہ میں زبان نہیں کھولتے اور نہ ان کو ایسے انداز سے ذکر کرتے ہیں جو ان کے خلافِ شان ہو۔

یہ سب کچھ عقل و دانش کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت بلکہ اعلانِ جنگ ہے۔ بس عقل کا صریح فیصلہ ہے کہ خواہ کتنا بڑا ہو۔ اگر خدا اور رسول کا مخالف ہو تو وہ جنّت کی بُو نہ سونگھے گا۔ کیونکہ جب حضرت نوح کا سگا بیٹا عذاب خداوندی سے نہ بچ سکا تو کوئی اور کیوں کر کسی ناجائز رعایت کا مستحق قرار دیا جا سکے گا۔ اور خداوند کریم کسی کی ناجائز رعایت کر سکتا ہی نہیں اور اگر کسی کی آلِ رسول کے حق میں گستاخی قابلِ عفو ہو سکتی ہے تو صحابہ کے حق میں گستاخی بھی قابلِ عفو ہو سکتی ہے۔ پھر ہر شخص کے لئے آزادی ہے جو چاہے کہتا پھرے۔

رازی نے ایک اور منطقی استدلال کا اضافہ یوں کیا ہے کہ چونکہ مہاجرین والانصار کے متعلق خدا نے فرمایا ہے رضی اللہ عنہم۔ یعنی خدا ان سے راضی ہو گیا۔ اور یہ رضامندی زمانۂ ماضی اور حال اور استقبال تینوں زمانوں کو شامل ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ آلِ رسول سے جھگڑا کرنے کے بعد وہ خدا کے غضب کے مستحق ہو گئے تو خدا کا رَضِیَ کا وعدہ واقع کے مطابق نہ رہے گا کیونکہ خدا نے اپنی رضا کے وعدہ میں یہ نہیں فرمایا کہ خلافت سے پہلے تک راضی ہوں۔ اور اُن کے خلافت کے دعوٰی کرنے کے بعد راضی نہ ہوں گا۔ پس خدا کا رضا کے ساتھ زمانہ کی قید نہ لگانا اس اَمر کی دلیل ہے کہ وہ ان مہاجرین والانصار سے ہر زمانہ میں راضی ہے۔

صاحبانِ عقل و فکر کے سامنے رازی کا یہ بیان بھی تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیّت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس عقل کے اندھے کو یہ خیال نہیں رہا کہ رَضِیَ فعل ماضی کا صیغہ ہے جس کی دلالت صرف زمانِ ماضی تک محدود ہے۔ اور یہ فعل استمرار کے لئے استعمال نہیں ہوتا تو گویا صاف معنی یہ ہے کہ جن لوگوں نے ہجرت اور رسول کی نصرت میں سبقت کی۔ خدا ان سے راضی ہو گیا۔ یعنی ہجرت اور نصرت خدا کے نزدیک اس قدر مستحسن فعل ہیں کہ ان کی وجہ سے خدا نے ان کی سابقہ تمام لغزشیں معاف کر دیں اور ان کے لئے جنّت کا وعدہ کر دیا کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اب اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے بعد اگر ایمان و اسلام کے تقاضوں کو چھوڑ کر مریں تب بھی وہ اس پیش کش کے سزاوار رہیں گے۔ کیا بخاری شریف کی ارتداد والی حدیثیں اور حدیث حوض یاد نہیں رہی کہ حضور فرماتے ہیں میں حوض پر ہوں گا۔ اور میرے سامنے چند لوگ بلائے جائیں گے اور ان کو جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا تو میں کہوں گا۔ اُصَیحَابِیْ اُصَیحَابِیْ۔ یعنی یہ تو میرے صحابی ہیں ان کو چھوڑ دیا جائے تو جواب ملے گا۔ آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے بعد میں کیا کیا کرتوت کئے۔ تو میں کہوں گا۔ دُور کرو۔ ان کو دُور کرو۔ اور یہ حدیثیں من وعن حوالہ جات سے مقدمہ تفسیر میں درج کی جا چکی ہیں (صـ۱۵۳ و صـ۱۵۴)۔

رازی نے توجیہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ رضائے خدا اور وعدۂ جنّت ایک موصوف پر مترتب ہیں تو جب تک اس موصوف میں وہ صفت باقی رہے گی۔ وعدۂ رضا و جنّت کا باقی رہنا بھی ضروری ہے۔ اور وہ صفت ہے ہجرت میں سابق ہونا اور نصرتِ رسول میں سبقت کرنا تو چونکہ یہ صفتیں مہاجرین والانصار کے لئے دائمی ہیں۔ لہٰذا جنّت و رضا کا ثبوت بھی دائمی ہو گا۔ اس کے بعد ان سے جس قسم کی لغزشیں سرزد ہوں وہ رضائے خدا اور وعدۂ جنّت کے آگے حائل نہیں ہو سکتیں۔

اس کا جواب ہمارے گذشتہ بیان میں واضح ہو چکا ہے کہ سبقت سے مُراد سبقتِ ایمانی ہے اور ایمان ہی محور و مدار ہے تمام باقی صفات کا اور اسی صفت ایمان کو ہی اُصولی اور بنیادی مقام حاصل ہے۔ ورنہ اس صفت کے بغیر ہجرت و نصرت قطعاً قابل مدح ہو سکتی ہی نہیں۔ پس سابقون سے مراد ہیں۔ ایمان میں سبقت کرنے والے اور سب میں سے سابق اول حضرت علیؑ ہیں۔ اور باقی مہاجرین والانصار جو بعد میں اس صفت سے متصف ہوئے۔ بالفرض اگر ان

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٠٠﴾ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ

ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ بڑی کامیابی ہے اور تمہارے گردونواح میں سے جو بدوی

مُنٰفِقُوْنَ ړ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ مَرَدُوْا عَلَي النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ

منافق ہیں اور اہلِ مدینہ میں سے جو قائم ہیں نفاق پر تمہیں پتہ نہیں اور ہمیں پتہ ہے

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا

ہم ان کو عذاب دیں گے دو دفعہ پھر پلٹائے جائیں گے طرف بڑے عذاب کے اور دوسرے جنہوں نے اقرار

بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ

کیا اپنے گناہوں کا ملا بیٹھے عمل نیک کو اور عمل بد کو اُمید ہے کہ خدا ان کی توبہ قبول کرے گا

کو سابقین کی صفت سے ملقب کیا گیا تو رضا و جنّت کے وعدہ کا مدار ہے۔ صفت ایمان اگر خاتمہ ایمان پر رہا تو وعدہ برقرار رہا۔ لیکن اگر خاتمہ ایمان پر نہ ہوا تو سابق ہجرت اور نصرت کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے تہ خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور رسالت مآبؐ کی متواتر احادیث سے یہ مضمون ثابت ہے۔ علاّمہ حلّی نے اس آیت مجیدہ کو حضرت علیؑ کے خلیفہ بلافصل ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ اور فضل بن روزبہان جیسے متعصب نے بھی علیؑ کا سابق الایمان ہونا تسلیم کیا ہے۔ اللّٰھمّ اجعلنا من انصار محمّد وآل محمّد واتباعھم۔

منافقین و مذنبین

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ۔ مہاجرین اور انصار سابقین کے بعد اظہار ایمان کرنے والوں کے تین گروہ تھے۔ جن کا پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ ایک وہ جو مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر خیر و خوبی سے چلے۔ ان کو محسنین کا درجہ دیا گیا۔ جن کا پہلی آیت میں بیان گذر چکا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو زبان سے مومن اور دل سے کافر تھے۔ ان کو منافقین کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس آیت مجیدہ میں انہی لوگوں کا تذکرہ ہے۔ اس قسم کے لوگ دیہاتوں میں بھی تھے۔ اور خود شہر مدینہ میں بھی تھے۔ جیسے کہ آیت میں ہے۔ ان کو دو دفعہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ ایک دنیا میں رسوائی و ذلت کا اور دوسرا قبر میں اور پھر تیسرا عذاب دائمی ہوگا جو بڑا عذاب ہوگا۔

وَاٰخَرُوْنَ۔ یہ تیسرے گروہ کا بیان ہے جو ایمان دل سے لائے۔ لیکن عمل میں نیک و بد کو ملا بیٹھے یعنی نیکیاں بھی کرتے رہے اور برائیاں بھی ان سے سرزد ہوئیں اور ان کو مذنبین کہا گیا ہے۔ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ ان کی توبہ قبول ہوگی۔

وجوب زکوٰۃ کا حکم

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ[۱۲۶]۔ تفسیر مجمع البیان میں ابوحمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ انصار میں تین آدمی جو

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ

تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے لے لو ان کے مال سے صدقہ کہ تو ان کو پاک و پاکیزہ کر دے اس کے ذریعہ سے

بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٣﴾

اور دعا کر ان کو کہ تحقیق تیری دعا ان کے لئے باعثِ تسکین ہے اور اللہ سننے جاننے والا ہے

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَ

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے صدقات کو اور

غزوۂ تبوک میں ہمرکاب رسالت مآبؐ نہ ہوئے تھے۔ جب اُن کو پتہ چلا کہ ان کے حق میں سخت ترین آیتیں اُتری ہیں تو انہوں نے سزا کے طور پر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا۔ جب حضور اکرمؐ واپس آئے اور ان کے متعلق دریافت کیا تو جواب ملا کہ ان لوگوں نے بطور سزا کے اپنے آپ کو باندھ رکھا ہے۔ اور سوائے حضورؐ کے ان کو کوئی نہیں کھول سکتا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ میں ان کو کھولنے کی جرأت نہیں کرتا جب تک کہ حکم خدا نہ ہو۔ پس جب آیت ۱۰۲ اُتری جس میں مذنبین کی توبہ کے قبول کرنے کا ذکر ہے تو آپ نے ان کو کھول دیا۔ پس وہ اپنے مال اٹھا لائے اور کہنے لگے کہ انہی مالوں نے ہمیں آپ کے پیچھے رہنے پر مجبور کیا تھا۔ لہٰذا ان کو صدقہ کر دیجئے۔ پس آپ وحی کے منتظر ہوئے اور آیت اُتری کہ سارا مال نہ لیجئے بلکہ ان کے اموال میں سے کچھ لے لیجئے۔ اور من یہاں تبعیض کے لئے ہے اور یہ صدقہ اُن کے لئے کفارۂ گناہ کے طور پر تھا۔ اور ممکن ہے کہ یہ آیت عام وجوب زکوٰۃ کے حکم کے لئے ہو کہ مومنوں سے زکوٰۃ وصول کرو جو اُن کی روحانی طہارت کے لئے ہے کہ صفت بخل سے ان کے قلوب پاک ہوں گے۔ اور اُن کے مالوں کے تذکیہ کے لئے ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی برکت سے اُن کا مال بڑھے گا۔ اور رزق میں وسعت ہوگی۔ اور آیت مجیدہ میں ابہام تھا۔ جس کو حضورؐ نے اپنے فعل سے رفع فرما دیا کہ زکوٰۃ فلاں فلاں جنس و نقدی میں واجب ہے۔ اور اس کا نصاب اس قدر ہے۔ اور وجوب و ادا کا وقت فلاں ہے۔ اور یہ تمام مسائل تفصیل کے ساتھ حسبِ ضرورت اسی جلد میں مذکور ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

إِنَّ صَلَاتَكَ۔ مقصد یہ ہے زکوٰۃ و صدقہ وصول کرنے کے بعد ان کے حق میں دُعا کیا کرو۔ اور اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کے حق میں وصول کرنے والے کو دعا کرنی چاہیئے۔

يَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ۔ یعنی خدا خود لیتا ہے صدقات کو۔ جیسا کہ روایت میں وارد ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔ کہ صدقہ مستحق کے ہاتھ میں پہنچنے سے قبل خدا کے یدِ قدرت پر جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ مستحق تک پہنچنے سے قبل وہ سندِ قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور صدقہ کی فضیلت کے متعلق قبل ازیں احادیث حسبِ ضرورت نقل کی جا چکی ہیں۔ حتیٰ۔

فَسَيَرَى اللَّهُ۔ اعمال کو خدا کا دیکھنا تو واضح ہے۔ اور صافی میں بروایت کافی

آئمہ ہمارے اعمال سے مطلع ہوتے ہیں

اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ

اللہ ہی قبول کرنے والا مہربان ہے　اور کہدو کہ تم عمل کرو۔ عنقریب دیکھے گا اللہ تمہارا عمل　اور

رَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ

اس کا رسول اور ایمان والے　اور عنقریب تم پلٹائے جاؤ گے طرف جاننے والے غیب و شہادت کے　پس تمہیں خبر دے گا

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ

جو تم عمل کرتے ہو　اور دوسرے منتظر ہیں امر خدا کے　یا　ان کو عذاب دے گا

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا تم لوگ کیوں حضرت رسالت مآبؐ کو ناراض کرتے ہو؟ تو پوچھا گیا کہ حضور وہ کیسے؛ تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے اعمال ان کے پیش کئے جاتے ہیں۔ پس وہ تمہاری بُرائیاں دیکھتے ہیں تو ناراض ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم ان کو ناراض نہ کیا کرو بلکہ خوش کیا کرو۔ اور امام رضا علیہ السلام سے ایک شخص نے عرض کی کہ مولا! میرے لئے اور میرے گھر والوں کے لئے دُعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا پہلے میں نہیں کرتا ہوں؟ خدا کی قسم تمہارے اعمال ہر شب و روز میرے پیش کئے جاتے ہیں راوی کہتا ہے کہ میں نے تعجب کیا تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اور فرمایا کہ یہاں مومنوں سے مُراد حضرت علی بن ابی طالبؑ ہیں اور مقصد یہ ہے کہ مومنوں سے مُراد آئمہ معصومینؑ ہیں۔ چنانچہ دوسری روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کی صراحت موجود ہے۔ اور عیاشی سے بروایت امام محمد باقر علیہ السلام منقول ہے کہ کوئی مومن یا کافر جہاں بھی مرے تو اُس کے قبر میں داخل کرنے سے قبل اُس کے جملہ اعمال حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت امیر المومنینؑ اور ان کے بعد دیگر تمام آئمہ طاہرینؑ کے پیش کئے جاتے ہیں بہر کیف اس مضمون کی روایات کتب شیعہ میں بکثرت وارد ہیں کہ جملہ اعمال آئمہ طاہرینؑ کے پیش ہوتے ہیں اور ہمارے نیک اعمال کو دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور بداعمالیاں دیکھ کر وہ ناراض ہوتے ہیں۔ اس لئے جملہ محبان محمدؐ و آل محمدؐ کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کا ہر وقت جائزہ لیں کہ کہیں ان سے ایسے افعال سرزد نہ ہوں جن سے وہ ناراض ہوں۔ اور ایسے اعمال بجالانے کی کوشش کریں جن سے وہ خُوش ہوں۔

اور ظاہر کے لحاظ سے آیت مجیدہ کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اپنے اعمال کو خواہ کتنا ہی پوشیدہ کرنے کی کوشش کرے آخر اس کی ہوا باہر نکل ہی آیا کرتی ہے۔ چنانچہ تفسیر منار میں حضرت رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ایک پتھر کے سوراخ میں گھس کر کوئی کام کرے جس کا نہ کوئی دروازہ ہو نہ کھڑکی تب بھی خدا اُس کے عمل کو ظاہر کر دے گا۔ خواہ وہ جس نوعیت کا ہی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ تمہاری بداعمالیاں خدا و رسول و مومنین سے مخفی نہیں رہتیں۔ لہٰذا تم ایسے کام سے گریز کرو جس کا ظاہر ہونا ایک دن تمہارے لئے باعث ندامت ہو۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ ۔ غزوہ تبوک سے تخلف کرنے والوں کی قسمیں متعدد بار گذر چکی ہیں۔ بعض وہ تھے جو اجازت لیکر

وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰۶﴾ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا

اور یا توبہ قبول کرے گا ان کی اور خدا جاننے والا حکمت والا ہے اور جنہوں نے بنائی مسجد ضرر اور

وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

کفر اور مومنین میں پھوٹ ڈالنے کے لئے اور رصدگاہ اُس شخص کے لئے جس نے جنگ کی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ

بیٹھ گئے تھے اور بعض بلا اجازت بیٹھ گئے تھے۔ بعض پشیمان ہوئے اور انہوں نے صدقہ بھی دیا اور بعض اپنے کفر وعناد پر ڈٹے رہے۔ بعض کی توبہ فوراً قبول ہوئی۔ اور بعض مومنوں سے مسخری کرنے کے درپے ہوگئے۔ بہرکیف یہ بھی انہی لوگوں میں سے ایک قسم ہے جو خداوند کریم کے فیصلہ کے منتظر ہیں۔ نہ ان کا کفر ظاہر ہے کہ حتمی عذاب ہو۔ اور نہ انہوں نے توبہ کی کہ حتمی معافی ہو۔

اور تفسیر صافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس سے مراد حضرت حمزہ وجعفر طیار کے قاتل ہیں جنہوں نے قبل از اسلام ان کو شہید کیا اور بعد میں خود مسلمان ہوگئے۔ اور شرک وکفر کو چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور یہ تردید اس اعتبار سے ہے کہ مومنوں کو ان کے انجام کا پتہ نہیں ہے ورنہ خالق کو تو معلوم ہے کہ ان کو عذاب دے گا یا معاف کرے گا۔ پس جو اُس کی مشیت کا تقاضا ہوگا وہی ہوگا۔

مسجد قبا اور مسجد ضرار

ضِرَارًا وَكُفْرًا۔ اس کے شانِ نزول کے متعلق مجمع البیان میں مروی ہے کہ بنی عمرو بن عوف نے مسجد قبا تعمیر کی۔ اور حضورؐ کو دعوت دی۔ پس آپ نے جا کر وہاں ان کو نماز پڑھائی۔ پس یہ دیکھ کر منافقین کی ایک جماعت جو بنی غنم بن عوف تھے۔ اُن کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور اُنہوں نے کہا کہ ہم ایک الگ مسجد بنائیں گے جس میں نماز الگ پڑھیں گے اور یہ ۱۲ یا ۱۵ آدمی تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسجد قبا کے پہلو میں ایک مسجد بنا ڈالی اور حضور کو اطلاع دی جب کہ آپ تبوک کی طرف تیاری کر رہے تھے۔ اور اُنہوں نے کہا کہ ہم نے بیماروں اور محتاجوں کے لئے نیز بارش اور سخت سردی کے ایام کے لئے اپنے ہاں ایک مسجد بنائی ہے۔ آپ بنفسِ نفیس وہاں نماز پڑھیں اور ہمارے حق میں دُعا بھی فرمائیں تو آپ نے فرمایا ابھی میں سفر کو جا رہا ہوں۔ جب واپس آئیں گے تو انشاء اللہ تمہاری مسجد کو دیکھیں گے۔ پس آپ تبوک سے واپس آئے تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ ضِرَارًا۔ اور اس کے بعد منصوبات مفعول لہ ہیں۔ یعنی انہوں نے مسجد بنائی خالص مومنوں کو ضرر دینے کے لئے اور کفر بکنے کے لئے کہ وہاں بیٹھ کر وہ مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کا گلہ وشکوہ کریں۔ اور مومنین میں اختلاف ڈالنے کے لئے اور دشمنِ خدا اور رسول کے لئے کہ وہ اپنا اڈہ وہاں جما لے۔

لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ۔ ایک شخص ابوعامر نامی جو زمانِ جاہلیت میں راہب بنا ہوا تھا۔ مدینہ میں حضورؐ کی تشریف آوری سے کبیدہ خاطر ہوا۔ اور اُس نے حضور کو ناکام بنانے کی کئی سازشیں کیں۔ لیکن خود ناکام ہوا۔ اور فتح مکہ کے بعد یہ شخص طائف چلا گیا۔ اور جب وہ لوگ مسلمان ہوئے تو وہ نصرانیت کو قبول کر کے شام گیا۔ اور وہاں سے روم چلا گیا۔ اس نے منافقوں کو پیغام

مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

پہلے سے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے نہیں ارادہ کیا مگر نیک اور اللہ گواہ ہے کہ تحقیق وہ جھوٹے ہیں

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ

اس میں نہ نماز پڑھو بالکل البتہ وہ مسجد جو بنائی گئی تقویٰ پر پہلے دن سے وہ اس لائق ہے کہ اس میں

فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ

نماز پڑھو اس میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں پاک ہونا اور اللہ بھی چاہتا ہے پاکبازوں کو کیا وہ

اُسِّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اُسِّسَ بُنْيَانَهٗ

جس نے بنایا مکان اوپر تقویٰ خدا کے اور رضامندی اس کے بہتر ہے یا وہ جس نے بنایا مکان اوپر

عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى

کنارے وادی کے جو گرنے والا ہو پس اس کو لے گرے آگ دوزخ میں اور اللہ نہیں ہدایت کرتا

بھیجا تھا کہ میں قیصر روم کے پاس جا رہا ہوں اور وہاں سے فوجیں ساتھ لاؤں گا۔ اور اہل اسلام کو مدینہ سے نکال دوں گا۔ لہٰذا تم میرے لئے ایک مسجد بنا لو۔ پس ان لوگوں نے وہ مسجد اس کے لئے ایک اڈہ قائم کرنے کی خاطر بنائی تھی اور حضور اس کو ابو عامر فاسق کے نام سے پکارتے تھے اور یہی عامر اس حنظلہ کا باپ تھا جو حضرت رسالت مآبؐ کی معیت میں جنگ احد میں درجۂ شہادت پر فائز ہوا تھا اور ملائکہ نے اس کو غسل دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ غسیل الملائکہ کے لقب سے ملقب ہوا تھا۔

جب حضورؐ تبوک سے واپس آئے تو وہ منافقین قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے یہ مسجد محض خلوصِ نیّت سے بنائی تھی۔ لیکن خداوند کریم نے اُن کی بد باطنی کی اطلاع دے دی تھی اور فرمایا کہ یہ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی بنائی ہوئی نام نہاد مسجد میں بالکل نماز نہ پڑھیے۔ پس حضورؐ نے اپنی جانب سے دو آدمی بھیجے کہ اس مسجد کو گرا کر اس کے سامان کو نذرِ آتش کر دیں۔ اور اُسے مزبلہ بنا دیں۔

شَفَا جُرُفٍ۔ شفا کا معنی کنارہ ہوا کرتا ہے اور اس کا تثنیہ شفوان ہوتا ہے۔ لغوی طور پر پیمائش کا آخری سرا شفا کہلاتا ہے اور جُرُف وادی یا نہر یا دریا کا کنارہ جس کو نیچے سے پانی نے کھود ڈالا ہو۔ ھار یہ ھار یہار کے باب سے ہے اور اجرف وادی سے ہے اس کا فاعل ھائر ہونا چاہیئے تھا۔ پس ھار مقلوب ھائرٌ کا ہے جس طرح شاکی مقلوب ہوا کرتا ہے۔ شائک کا یعنی سلاح پوش۔ اور انھار ینھار باب انفعال اسی مادہ سے ہے۔ اور اس کا معنی گرنا ہوا کرتا ہے۔ تو اس

۵۔ تفسیر کی جلد ۳ صفحہ ۲۰ پر حنظلہ کا واقعہ گذر چکا ہے

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ

ظالم لوگوں کو ہمیشہ رہے گا وہ مکان جو انہوں نے بنایا باعث ارمان ان کے دلوں میں مگر یہ کہ

اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١١٠﴾ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ

اُن کے دل پھٹ جائیں (وہ مرجائیں) اور اللہ علیم وحکیم ہے تحقیق اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں

الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

سے اُن کے نفس اور مال اس بدلہ میں کہ ان کو جنت دے گا جو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں

اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

پس مارتے ہیں۔ اور مارے جاتے ہیں یہ اُس کا پکا وعدہ ہے توارت اور انجیل

وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ

اور قرآن میں اور کون اللہ سے زیادہ وعدہ کی وفا کرنے والا ہے پس تمہیں مبارک ہو یہ سودا جو تم نے اس سے

بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾

کیا ہے اور یہ ہی بڑی کامیابی ہے

آیت مجیدہ میں خداوندکریم نے اس بنائے مسجد کو تشبیہ دی۔ ایسے مکان کی بنا سے جس کی بنیاد کسی نہر کے گرتے ہوئے کھوکھلے کنارہ پر رکھی جائے جو فوراً پانی میں گر جانے والا ہو۔ پس گویا ان کی یہ مسجد جہنم کے کنارہ پر بنائی گئی ہے جو اپنے اہل سمیت جہنم میں جاگرے گی۔

لَا يَزَالُ ۔ اب چونکہ حضورؐ نے ان کی سازشوں کی قلعی کھول دی اور اُن کے کفر والحاد کے اڈہ کو مسمار کر دیا۔ تو فرماتا ہے کہ یہ حسرت تادمِ مرگ ان کے دلوں میں رہے گی۔ اور جب مریں گے تو انجام کا انہیں پتہ چلے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ کا معنی یہ ہو کہ وہ توبہ کرلیں۔ یعنی توبہ سے اُن کے دل پھٹیں اور افسوس کریں کہ ہائے ہم نے کیا کیا۔

رکوع نمبر ۳ مومن کے لئے جنّت کی پیش کش

اِنَّ اللّٰهَ چونکہ عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جانی اور دوسری مالی۔ پس جو شخص ایمان لائے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں جانی و مالی ہر دو اعتبار سے احکامِ خداوندی کی رعایت رکھے تو اس کے لئے جنّت ضروری ہے۔ پس اس مقام پر خرید و فروخت کے عنوان سے ذکر کرنا اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ جانی و مالی ہر دونوں طریقوں سے خدا کے اطاعت گذار

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ

توبہ کرنے والے عبادت گذار حمد کرنے والے روزہ دار رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ

نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے اور حفاظت کرنے والے اللہ کی حدود کی

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا

اور مومنوں کو خوشخبری ومبارک دو نہیں روا نبی اور مومنوں کے لئے کہ دعائے بخشش کریں

لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ

مشرکوں کے لئے اگرچہ وہ ان کے رشتہ دار قریبی ہوں بعد اس کے کہ ان کو پتہ ہو

ہوں اُن پر جنّت واجب ہوتی ہے۔ جس طرح خرید و فروخت میں سودا کرنے کے بعد چیزوں کا تبادلہ ضروری ہوا کرتا ہے۔

التَّآئِبُوْنَ۔ مومنوں کے اوصاف بیان فرمائے۔ غلطی کے بعد پشیمان ہونا اور توبہ کرنا۔ عبادت کرنا۔ حمد پروردگار بجا لانا۔ خوشنودیٔ خدا کی خاطر روزہ رکھنا یا بعضوں نے سائحون کا معنی طلبِ علم کے لئے سفر کرنا مراد لیا ہے اور یہ بھی درست ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد رکوع سجدہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ سب مومنوں کی نشانیاں ہیں جن سے خدا نے جنّت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور یہ پچھلی کلام سے الگ کر کے جملہ مستانفہ بنایا گیا ہے۔ گویا اگر سوال کرے کہ وہ مومن کس قسم کے ہیں جن سے مال و جان کے عوض میں خدا نے جنّت کا سودا کیا ہے؟ تو یہ اس سوال کا جواب ہوگا۔ اور آخر میں اَلْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ سے ایک کلیہ بیان فرما دیا کہ وہ وہ ہیں جو حدودِ خداوندی کی حفاظت کریں۔ اس کے واجبات کو ترک نہ کریں اور محرمات کے قریب نہ جائیں۔ اور انسان کے جملہ شؤن زندگی میں ذاتی اور تمدنی لحاظ سے اوامر و نواہی کے جو قواعد شریعت نے پیش کئے ہیں وہی اللہ کی حدود ہیں۔ اور ان کو توڑنا ایمان کے منافی ہے۔ اور اس میں تمام ابواب فقہ اجمالاً آ جاتے ہیں۔ پس اس مختصر لفظ میں پورے اسلامیات کو اپنانے کی باندازِ بلیغ دعوت دی ہے جو اسی کلام کا طرۂ امتیاز ہی ہو سکتا ہے۔ خداوند کریم تمام مومنین کو حدودِ خداوندی کے قائم کرنے کی توفیق دے۔

تفسیر مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے اور نہج البلاغہ میں حضرت امیر علیہ السّلام کا بھی فرمان ہے کہ تمہارے نفوس کی قیمت جنّت ہے۔ لہٰذا ان کو کسی اور چیز کے بدلہ میں فروخت مت کرو۔ ایک مرتبہ زہری امام زین العابدین علیہ السّلام سے راہِ حج میں ملا تو کہنے لگا کہ آپ نے جہاد کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ مشکل ہے۔ اور حج پر آسان سمجھ کر روانہ ہو گئے۔ تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ اگر ان صفات کے مومنین ہمیں مل جائیں تو ہم جہاد کو حج سے ترجیح دیں گے۔

أَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ

کہ وہ دوزخی ہیں اور نہیں تھا طلب بخشش کرنا ابراہیم کا اپنے چچا آذر کے لئے مگر ایک وعدہ کی

مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ

وجہ سے جو انہوں نے کیا تھا تو جب پتہ چلا کہ وہ دشمن خدا ہے تو اس سے بیزار ہو گئے تحقیق

اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ

ابراہیم بہت رونیوالے اور صابر تھے اور خدا کی شان نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو ہدایت کے بعد

حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ

یہاں تک کہ واضح کرتا ہے ان کے لئے وہ احکام جو موجب تقویٰ ہیں تحقیق اللہ ہر شئے کو جانتا ہے تحقیق اللہ کے لئے

مشرک کے لئے دُعا کرنا

مَا كَانَ ۔ آیت مجیدہ میں نبی اور مومنین کو مشرکوں کے حق میں دُعائے بخشش سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ حتمی طور پر جہنم میں داخل ہوں گے ۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق یہ یقین ہو کہ اس کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا ۔ اور وہ یقیناً دوزخی ہوگا ۔ تو اس آیت مجیدہ کے باطن کی رو سے اس کے حق میں بخشش کی دُعا کرنا ممنوع ہوگا ۔ خواہ وہ اپنا کس قدر عزیز اور قریبی ہی کیوں نہ ہو ۔ پس مومن اولاد کا غیر مومن والدین کے لئے دُعا کرنا بھی اس آیت کے مضمون کے خلاف ہو جائے گا ۔ البتہ اگر والدین اعلانیہ دشمن اہل بیت نہ ہوں بلکہ محبت آل محمد بھی رکھتے ہوں ۔ اور دوسروں کی ہاں میں بھی ہاں ملا دیتے ہوں ۔ جس طرح کمزور عقیدہ والے لوگوں کا دستور ہوا کرتا ہے تو اولاد کے لئے ایسے والدین کے حق میں دُعائے بخشش کی ممانعت نہیں ہوگی ۔ واللہ اعلم ۔

عَنْ مَّوْعِدَةٍ ۔ بروایت صافی عیاشی سے منقول ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ سے ان کے چچا آذر نے) وعدہ کیا تھا کہ میں اسلام لاؤں گا ۔ تب حضرت ابراہیم نے اُس کے حق میں دُعا کی ۔ اور جب پتہ چلا کہ یہ دشمن خدا ہے تو اس سے بیزاری اختیار کر لی ۔ اور چچا کو مجازاً اَبٌ کہا جاتا ہے ۔ اسی بنا پر آیت مجیدہ میں چچا پر اَبٌ کا اطلاق ہوا ہے ۔

مَا يَتَّقُوْنَ ۔ یعنی خدا ان کو اپنے اوامر و نواہی سے مطلع فرما دیتا ہے تاکہ اس کی مخالفت سے بچ سکیں ۔ پس حجت کا تمام کرنا اس پر ضروری ہے

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ ؕ ۔ یہ اُن لوگوں کے متعلق ہے جو غزوۂ تبوک میں جانے سے پیچھے رہ گئے تھے اور بعد میں جا کر ملحق ہوئے ۔ جیسے ابوخیثمہ وغیرہ جن کا ذکر صفحہ ۹ پر گذر چکا ہے ۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ

ہی ہے ملک آسمانوں اور زمین کا جلاتا ہے اور مارتا ہے اور نہیں تمہارا اس کے سوا کوئی

وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَي النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ

ولی و مددگار تحقیق توبہ قبول کی اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار

الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ

لوگوں کی جنہوں نے اسکی پیروی کی تنگی کے زمانہ میں بعد اس کے کہ قریب تھا کہ کج ہو جائیں دل کچھ لوگوں کے

مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَي الثَّلٰثَةِ

ان میں سے پھر ان پر رجوع رحمت فرمایا تحقیق وہ رؤف و رحیم ہے اور ان تین آدمیوں پر جو

الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ

پیچھے رہ گئے یہاں تک کہ جب ان پر زمین تنگ ہوگئی باوجود کشادگی کے اور ان کے دل

عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ

تنگ ہوگئے اور گمان کیا کہ کوئی نہیں جائے پناہ اللہ سے مگر اسی کی ہی طرف پھر اللہ نے ان کی توبہ

لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا

قبول کی تاکہ نیکی کی طرف پلٹیں تحقیق اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا ہے اے ایمان والو

عَلَی الثَّلٰثَةِ ۔ یہ ان لوگوں کا قصہ ہے جو سفر تبوک میں آج کل کرتے ہوئے وقت گذار بیٹھے تھے اور قصہ تبوک میں ان کی توبہ کا واقعہ گذر چکا ہے ۔ ص ۱۱۱

تنبیہ ۔ جہاں یہ فرمایا کہ خدا نے نبی اور مہاجرین و انصار کی توبہ قبول کی وہاں نبی کا ذکر صرف تحسین کلام کے لئے ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ حضرت نبی علیہ السّلام کی برکت اور اُن کے وسیلہ سے خدا نے مہاجرین و انصار کی توبہ کو قبول فرمالیا چنانچہ امام علی رضا علیہ السّلام سے جو قرأت منقول ہے وہ بِالنَّبِیِّ عَلَی الْمُهَاجِرِیْنَ ہے یعنی حضورؐ کے وسیلہ سے ان کی توبہ قبول ہوئی ۔

رکوع نمبر ۴ ۔ صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ آیت مجیدہ میں ایمان والوں سے خطاب ہے یعنی بعد والے دونو حکم صرف ایمان والوں کے لئے

اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ (۱۱۹)

ڈرو اللہ سے اور ہو جاؤ ساتھ سچوں کے

ہی ہیں۔ پس اگر ایمان صحیح نہیں ہوگا تو تقوٰے اختیار کرنا بے معنی ہوگا۔ آیت نمبر ۱۱۵ میں خدا نے بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے لطف و کرم سے بندوں پر ان تمام احکام کو بیان فرماتا ہے جن کی مخالفت ناجائز اور منافیٔ ایمان ہو۔ اور جن کی موافقت تقویٰ ہو۔ اب اس آیت میں فرماتا ہے کہ ایمان والو تقوٰے اختیار کرو۔ تو چونکہ تقویٰ کا اختیار کرنا تقوٰے کے معنی کو سمجھنے پر موقوف ہے۔ اور ہر شخص میں صلاحیت نہیں کہ تقویٰ کا معنی سمجھے اور خود اپنے لئے تقوٰے کا راستہ معین کر کے اس پر گامزن ہو جائے۔ پس خدا نے تقویٰ کا مقصد اور اُس کے قوانین کی تفہیم کا بیڑا خود اٹھایا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی جانب سے ایسے افراد قدسیہ کو منتخب کر کے بھیجا جو ہمیں زبان سے بھی سمجھائیں۔ اور اپنے عمل سے کر کے بھی دکھائیں۔ اور ان کو صادقین کے لقب سے ملقب فرمایا۔ لہٰذا اس آیت مجیدہ میں تمام اہل ایمان کو تقوٰے کی دعوت دینے کے بعد صادقین کے ساتھ ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اور یہاں ساتھ ہونے سے مراد اطاعت و پیروی ہے۔ پس ان کی پیروی کر کے ہی ہم تقویٰ اختیار کر سکتے ہیں۔ اور تقوٰے کے ساتھ اپنے دعوٰی ایمان میں صداقت پیدا کر سکتے ہیں۔

علامہ حلّی نے آیت مجیدہ کو حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کی دلیل قرار دیا ہے اور کتب عامہ سے ثابت کیا ہے کہ اس جگہ صادقین کے مصداق حضرت علیؑ ہیں۔ اور جب آپ ثابت ہو گئے۔ تو ان کے بعد ان کی پشت سے آئمہ اثنا عشر یکے بعد دیگرے صادقین کا مصداق بنتے جائیں گے۔ اور چونکہ آیت تاقیامت زندہ ہے۔ اور اس کا حکم تاقیامت تمام مسلمانوں کے لئے باقی ہے۔ لہٰذا دورِ رسالتمآبؐ میں حضورؐ خود ہی اس کے مصداق تھے۔ اور لوگوں کے لئے معانی تقوی کے قولاً و فعلاً سمجھانے والے تھے۔ اور اُن کے بعد حضرت علیؑ اور اس کی اولاد امجاد معصومینؑ ہر دور میں یہ فریضہ ادا کرتے رہے پس اس کا مصداق محمدؐ و آل محمدؐ ہی ہیں۔

فخر الدین رازی نے اس آیت مجیدہ کے حکم سے اتنا ضرور سمجھا ہے کہ صادقین سے مراد معصوم ہوں گے۔ کیونکہ جن کی پیروی کا خدا حکم دیتا ہے اگر وہ معصوم نہ ہوں تو ممکن ہے کہ کہیں غلطی کا حکم دے دیں تو ایسی صورت میں خدا کی طرف سے ان کی اطاعت کا حکم نازیبا بلکہ خلافِ شانِ الوہیت ہوگا۔ رازی کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے تاکہ مطلب سمجھنا آسان ہو۔

انه تعالیٰ امر المومنین بالکون مع الصّادقین ومتی وجب الکون مع الصّادقین فلا بد من وجود الصّادقین فی کل وقت۔	خدا نے مومنین کو صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم دیا ہے تو جب صادقین کے ساتھ ہونا واجب ہے تو ہر زمانہ میں صادقین کا پایا جانا ضروری ہے۔

پھر آگے چل کر اس مطلب کو یوں واضح کرتا ہے

هذا الامر انما یتناول من یصح منه ان	یہ حکم یعنی تقویٰ کا اختیار کرنا ان لوگوں کو شامل ہے۔ جو خود

لا یکون منقیا وانما یکون کذلک لوکان جائز الخطاء فکانت الایۃ دالۃ علی ان من کان جائز الخطاء وجب کونہ مقتدیا بمن کان واجب العصمۃ وھم الذین حکم اللہ تعالیٰ بکونھم صدقین فھذا یدل علی انہ واجب علی جائز الخطاء کونہ مع المعصوم عن الخطاء حتی یکون المعصوم عن الخطاء مانعا لجائز الخطاء وھذا المعنی قائم فی جمیع الازمان فوجب حصولہ فی کل الازمان۔

متقی نہ ہوں۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ جائز الخطا ہوں تو پس آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جو جائز الخطا ہو اس پر واجب ہے ایسے شخص کی اقتدا کرنا جو واجب العصمۃ ہو اور وہ وہی لوگ ہیں جن کو خدا نے صادقین کہا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جائز الخطا پر معصوم عن الخطاء کی پیروی واجب ہے۔ تاکہ معصوم عن الخطاء جائز الخطاء کو غلطیوں سے روکے۔ اور یہ بات چونکہ ہر زمانہ میں ضروری ہے۔ لہٰذا معصوم کا ہونا ہر زمانہ میں واجب ہے۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ جن لوگوں کو اکثریت نے مذہبی پیشوا بنا رکھا ہے۔ وہ زیورِ عصمت سے بیگانہ ہیں۔ اور جو لوگ زیورِ عصمت سے آراستہ ہیں ان کو گوشہ تنہائی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تو اپنی مفلوج ذہنیت کا یوں مظاہرہ کیا۔

قولہ لم لا یجوز ان یکون المراد ھو کون المومن مع المعصوم الموجود فی کل زمان قلنا نعترف بانہ لا بد من معصوم فی کل زمان الا انا نقول ذلک المعصوم ھو مجموع الامۃ وانتم تقولون ذلک المعصوم واحد منھم فنقول ھذا الثانی باطل لانہ تعالیٰ اوجب علی کل واحد من المومنین ان یکون مع الصادقین وانما یمکنہ ذلک لوکان عالما بان ذلک الصادق من ھو لا الجاھل بانہ من ھو فلو کان مامورا بالکون معہ کان ذلک تکلیف ما لا یطاق وانہ لا یجوز لکنا لا نعلم انسانا معینا موصوفا بوصف العصمۃ۔ الخ

اگر کوئی پوچھے کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ ہر زمانہ میں مومن کو معصوم کے ساتھ ہونے کا حکم ہو۔ تو ہم کہیں گے یہ تو ہم مانتے ہیں کہ ہر زمانہ میں معصوم کا ہونا ضروری ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ معصوم مجموعِ اُمّت ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ معصوم ایک شخص ہے۔ اور یہ غلط ہے کیونکہ خدا نے تمام مومنین پر واجب قرار دیا ہے کہ صادقین کے ساتھ ہوں۔ اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ وہ جانتے ہوں کہ وہ صادق کون ہے؟ نہ کہ وہ اس سے جاہل ہوں۔ ورنہ اس کے ساتھ ہونے کا حکم ناقابل عمل ہو جائے گا۔ اور یہ ناجائز ہے۔ اور ہم کسی انسان کو معین طور پر وصفِ عصمت سے متصف نہیں جانتے۔

چونکہ صادقین کے مفہوم سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں معصوم ہونا چاہیئے کیونکہ صدق سے مراد عام ہے۔خواہ قول میں خواہ فعل میں اور خواہ اعتقاد میں ہو تو علی الاطلاق صادق وہی ہوگا جو معصوم ہوگا۔اور استدلال سے بھی رازی نے صادق کی اطاعت کے حکم سے اس کی عصمت کو ثابت کیا ہے اب اہل بیت عصمت سے منہ پھیرنے اور اکثریت کی ہاں میں ہاں ملانے کی خاطر ہی یہ بہانہ تلاش کرنا پڑا کہ ہم ان کو پہچانتے نہیں ہیں۔لہٰذا ان کی اطاعت کا حکم نہیں ہو سکتا۔لہٰذا صادقین سے مراد اجماع ہے۔رازی کا یہ مزعومہ چند وجوہ سے باطل و عاطل ہے۔صاحبانِ عقل غور فرمائیں۔

(۱) دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔شروع میں کہتا ہے کہ جن کو صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم ہے اور تقویٰ کا امر ہے وہ وہی ہیں جو جائز الخطا ہوں تو اس منطقی سے کوئی پوچھے کہ فرداً فرداً اُمت کے تمام افراد جن کو تقویٰ کا حکم ہے جائز الخطا ہیں۔تو ان تمام خطاکاروں کا مجموعہ معصوم کیسے بن جائے گا۔اور تمام دنیا کے گنہگاروں کے مجموعہ کا بے گناہ بن جانا ایک ناقابلِ فہم بات ہے۔اور دنیا کا کوئی جاہل انسان بھی اس فلسفہ کا قائل نہیں ہو سکتا۔

(۲) اجماع جب انہی لوگوں کا مجموعی فیصلہ ہے۔تو معلوم ہوا صادقین مجموع الاُمّت ہے اور جن کو پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔وہ بھی تو مجموع الاُمت ہے۔گویا تمام اُمت کو خود اپنے ساتھ ہونے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ قطعاً باطل ہے۔

(۳) اگر رازی کو یہ اعتراض ہے کہ معصوم کو ہم نے نہیں پہچانا اس لئے ان کی اطاعت کا حکم نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اُمّت کے اجماعی فیصلہ کو پہچان سکتا ہے؟ مثال کے لئے کوئی ایک زمانہ ایسا ثابت کرے جس میں اُمت کے تمام افراد نے متفقہ طور پر ایک بات کا فیصلہ کیا ہو۔چار پانچ یا دس بیس آدمیوں کی بات کو اجماع کہنا آسان ہے لیکن تمام اُمّت کا اتفاق حاصل کرنا ناممکن ہے لہٰذا اس کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔

(۴) مجموع الاُمّت بقول رازی کے ہے۔صادق کا مصداق تو چونکہ ہر دَور میں صادق اور معصوم ضروری ہے۔تو گویا ہر دَور میں مجموع الاُمّت کا اتفاق و اجماع ہی صادق کا مصداق ہوگا اور چونکہ آیت مجیدہ میں صرف ایک صادق نہیں بلکہ صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ہو جاؤ مجموع الامت کے مجموعوں کے ساتھ اور یہ ترجمہ ہر صاحبِ عقل سلیم کے نزدیک بالکل لغو اور بے معنی ہے۔رازی بیچارہ جہاں بھی اہل عصمت کے حق میں کوئی آیت پاتا ہے تو خود بخود سیخ پا ہو کر ادھر اُدھر جان چھڑانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔چنانچہ آیت اولو الامر میں بھی اس نے یہی کھیل کھیلا تھا۔اگر تعصّب کی پٹی آنکھوں پر نہ ہوتی اور اندھی تقلید نے عقل و دماغ پر پردے نہ ڈالے ہوتے تو خود جستجو کرتا اور جوئندہ یابندہ کے مقولہ کے مطابق اس کو معصوم بھی مل جاتے اور صادقین کے مصداق کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو جاتا۔آیت مباہلہ میں خود رازی معترف ہے کہ نصاریٰ کے مقابلہ میں جانے والے محمدؐ علیؑ۔فاطمہؑ۔حسنؑ۔حسینؑ تھے اور آیت مجیدہ کا ذیل فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ببانگ دہل پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ پانچ نصاریٰ کے مقابلہ میں جانے والے کاذب نہیں اور ان کے مقابلہ میں آنے والے کاذب ہیں۔اور نصاریٰ نے جزیہ قبول کر کے ان کی صداقت کو تسلیم کرنے میں ذرا بھر پس و پیش نہیں

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ

نہیں جائز مدینہ والوں کے لئے اور نہ اطراف کے بدوؤں کے لئے کہ پیچھے رہیں

رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ

رسول اللہ سے اور نہ یہ کہ پیارا کریں اپنے نفسوں کو اُن کے نفس سے یہ اس لئے کہ نہیں پہنچتی ان کو پیاس

ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ

نہ تکلیف اور نہ بھوک راہ خدا میں اور نہیں طے کرتے

کیا رہیں جب خدا کی کتاب ان کو صادق کہہ چکی۔ اور تمام مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تو یہ عذر فضول ہے کہ تعیین نہیں ہوسکی کہ صادق کون ہے جس کی پیروی کی جائے۔ نیز آیت تطہیر کے نزول کے متعلق تمام مفسّرین کو اعتراف ہے کہ حضورؐ نے علیؑ وفاطمہؑ وحسنؑ وحسینؑ کو چادر میں داخل کرکے دُعا کی اور آیت مجیدہ نازل ہوئی۔ احادیث میں علی مع القرآن اور علی مع الحق والحق معہ کا مضمون متواتر ہے۔ حدیث ثقلین کتب فریقین میں تواتر کا درجہ رکھتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر رازی کو صادق کی اور معصوم کی تعیین نہ ہوسکے تو اس کا علاج ہی کیا ہے؟

ہاں اصل بات یہ ہے کہ جن کو اکثریت کی اندھی تقلید میں پھنس کر وہ صدیق اکبر کہہ بیٹھے ان کی عصمت کو تلاش کرنے سے جب مایوس ہوئے تو صرف صادقین کی عصمت پر کیسے ایمان رکھیں کیونکہ اس سمہ کا اس کے پاس کوئی حل نہیں ہے کہ خدا نے جن کو اطاعت کا حکم دیا ہے وہ ہیں کون گا۔ لہذا صادقین وہی ہوں گے جو معصوم ہوں۔ لیکن ادھر کرسیٔ اقتدار کا جائزہ لیا جائے تو صادق بجائے خود جس کو صدیق اور صدیق اکبر مانا گیا ہے عصمت تو بجائے خود عصمت کی بُو بھی وہاں نہیں ملتی۔ تو اہل بیت کو معصوم ماننے کے بعد چونکہ صدیق اکبر کی صداقت سے دست برداری کرنا پڑتی ہے لہذا سرے سے معصوم کی تشخیص کا انکار کر دیا تاکہ دین رہے یا نہ رہے کرسیٔ اقتدار پر ضرب نہ پڑے۔

مَا كَانَ - تبوک کا قصہ ختم ہونے اور پیغمبر کی مراجعت کے بعد جب عذرخواہی بھی ہو چکی اور توبہ کرنے والوں کی توبہ بھی قبول ہوگئی تو اب بطور سرزنش کے آئندہ کے لئے محتاط رکھنے کے لئے ان کو تنبیہ فرماتا ہے کہ مدینہ والوں یا گردونواح کے دیہاتی مومنین کے لئے قطعاً ناجائز ہے کہ رسول کی جان سے اپنی جانوں کو پیارا سمجھیں کہ وہ جنگ کی طرف سفروں کی صعوبتیں برداشت کریں اور یہ آرام سے گھر میں بیٹھے رہیں۔ وہ تو ان کے محسن ہیں جنہوں نے کفر کی تاریکی سے نکال کر انہیں اسلام کی اوج رفعت تک پہنچایا ہے۔ لہذا ان کی احسان شناسی اس طرح ہونی چاہیئے کہ اپنا سب کچھ ان کی خاطر قربان کر دیں اور پھر بھی ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی بلکہ ان کی معمولی سے معمولی تکلیف کا بھی جو راہِ خدا میں ان کو پہنچے گی۔ ان کو بہت اچھا بدلہ دیا جائے گا۔

لَا يَطَئُوْنَ - یعنی دشمن کی زمین میں جہاں بھی قدم رکھیں گے تو کفار کو غصہ آئے گا پس اس صورت میں جو بھی ان کو تکلیف

مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

ایسے مقام کو جس سے کفار کو غصہ آتا ہو اور نہیں دکھ سہتے دشمن سے مگر لکھی جاتی ہے ان کے لئے اس کے

بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ

بدلہ میں نیکی تحقیق اللہ نہیں ضائع کرتا بدلہ نیکی کرنے والوں کا اور نہیں خرچ کرتے

نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ

کوئی خرچ چھوٹا اور بڑا اور نہ طے کرتے ہیں کسی وادی کو مگر لکھا جاتا ہے "تاکہ ان کو بدلہ

اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا

دے خدا بہترین اس کا جو وہ عمل کرتے ہیں اور نہیں مناسب مومنوں کے لئے کہ کوچ کریں سب

كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ

کے سب پس ایسا کیوں نہیں کہ کوچ کرے ہر قوم سے ایک ایک گروہ کہ تعلیم حاصل کریں دین کی

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

تاکہ ڈرائیں اپنی اپنی قوم کو جب واپس آئیں ان کی طرف تاکہ وہ لوگ ڈریں

پہنچے گی خدا اسکا انکو بدلہ دے گا۔

لا ینالون - نیل سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے پانا۔ اور مراد یہاں جانی یا مالی یا زبانی یا کسی قسم کی تکلیف کا پہنچنا ہے

آیت نفر - آیت مجیدہ کے شانِ نزول کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ لیکن آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے سب سے موزوں ترین یہ ہے کہ یہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو سب کے سب گھروں کو تنہا چھوڑ کر مسائل دین سیکھنے کے لئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے تھے اور تکالیف شاقہ اپنے اُوپر برداشت کرتے تھے تو ان کی سہولت کی خاطر ارشاد ہوا کہ تم سب کے سب یہ تکالیف برداشت نہ کرو۔ بلکہ تمہارے ہر قبیلہ میں سے چند آدمی خدمتِ نبوی میں آجایا کریں اور مسائل دین سیکھ کر واپس جائیں اور اپنی اپنی قوم وقبیلہ میں آکر بیان کریں اور غلطی کرنے والوں کو عذاب خداوندی سے ڈرائیں تاکہ وہ خوف کریں تو آیتِ مجیدہ ہر قوم کے لئے طلب علم دین کے وجوب کو ثابت کرتی ہے۔

علمائے اصول نے اس آیت کو خبرِ واحد کی حجیت کی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ شروع میں لولا کلمہ تحضیض ہے۔ جو علمِ دین سیکھنے کے وجوب کو ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ روایات اہل بیتؑ میں آئمہؑ نے وجوبِ تحصیل علم کے اثبات میں اسی

آیۂ مجیدہ کو پیش کیا ہے۔ جب تحصیل علم اور تفقہ فی الدین واجب ثابت ہوا تو اس کی غرض وغایت جو آیت میں ہے وہ ہے انذار و تبلیغِ قوم جس طرح کہ لینذروا کے صیغہ سے ظاہر ہے۔ پس جب تحصیلِ علم واجب ہے تو اس کی غرض وغایت انذار و تبلیغ بھی یقیناً واجب ہو گی۔ کیونکہ غرض وغایت واجب نہ ہونے کی صورت میں تحصیل علم کا وجوب بے معنی ہو جائے گا۔ اور انذار و تبلیغ کی غایت و انجام ہے۔ قوم و قبیلہ کا دل میں خوفِ خدا محسوس کرنا اور ان کے وعظ و نصیحت کا قبول کرنا کیونکہ اگر ان پر ان کا وعظ و ذکر واجب القبول نہ ہو تو ان کے انذار و تبلیغ کا واجب ہونا بے معنی ہوگا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ جب خبر دینے والا عادل ہو تو اس کی بات کا قبول کرنا واجب ہے۔ کیونکہ ہر ہر قبیلہ میں وہ انذار کرنے والا تو ایک ایک فرد ہی ہو گا۔ جن کی بات کو قبیلہ والے قبول کریں گے۔ پس خبر واحد کی حجیت ثابت ہو گئی۔

بعضوں نے کہا ہے کہ آیت غزوہ تبوک کے بعد اُتری ہے۔ اور مومنین جب تخلف کرنے والوں کا حشر دیکھ چکے تھے اور پیچھے رہنے والوں کے حق میں قرآن کی متعدد آیات سن چکے تھے تو بعد میں جو غزوہ پیش آتا تھا سب کے سب چل پڑتے تھے۔ اور رسولِ خدا بعد میں تنہا رہ جاتے تھے تو خداوند کریم نے ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ مومنین کے لئے یہ درست نہیں کہ سب کے سب چلے جائیں بلکہ انہیں اس طرح کرنا چاہیئے کہ ہر ہر قوم سے ایک ایک گروہ جائے۔ اور وہ دشمنوں پر فتح و نصرت اور تائید خداوندی کے مظاہر اور دین مبین کی سربلندی کے اسباب میں فقہ و بصیرت حاصل کرے اور واپس آکر اپنی اپنی قوم و قبیلہ کو چشم دید واقعات سنا کر انہیں مخالفتِ اسلام سے روکے اور زیادہ سے زیادہ ان کو دین کا ہمنوا بنائے۔ پس اس صورت میں نہ انذار کا وجوب ہے اور نہ حذر کا وجوب بلکہ صرف بطور ارشاد کے ہے کہ جب وہ چشم دید قصّے بیان کریں گے تو فائدہ یہ ہو گا کہ لوگ جلد اور زیادہ متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوں گے۔ پس اس صورت میں یہ آیت حجیت خبر واحد کی دلیل نہ بن سکے گی تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اوّلاً تو یہ آیت جنگ سے متعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ کی آیتوں کے درمیان اس کا آجانا اس کی دلیل نہیں بن سکتا اور ثانیاً اگر جنگ کے متعلق ہو بھی تو ہر ہر قبیلہ سے تھوڑے تھوڑے آدمی جانے کا کیا مقصد ہے بلکہ رسول کی تنہائی تو اس سے بھی دُور ہو سکتی ہے کہ صرف ایک قبیلہ کے چند آدمی پیچھے رہ جائیں۔ اور باقی قبیلے سب کے سب چلے جائیں۔ پس اگر جنگ کے لئے ہے تو مقصد یہ ہے کہ سب کے سب ادھر کیوں چلے جاتے ہیں بلکہ کم از کم ہر قبیلے سے ایک ایک گروہ تو دینی مسائل حاصل کرنے کے لئے بھی کوچ کرے تاکہ باقیوں کو واپس آنے پر مسائل دین سے روشناس کرائے۔ پس اس صورت میں خبر واحد کی حجیت سابق تقریب سے ثابت ہو جائے گی۔

اجتہاد و تقلید

اگر اس آیت میں غور کیا جائے تو وجوب اجتہاد و تقلید پر دلالت صاف ظاہر ہے کیونکہ آیت مجیدہ کا صاف اور صریح مقصد دین میں فقہ و بصیرت حاصل کرنا ہے اور پھر جا کر لوگوں کو مسائل دین سے آگاہ کرنے کا حکم ہے اور جب مجتہدین پر احکامِ دین کا بیان کرنا اور مسائل شرعیہ کا بتانا واجب ہوا تو

لوگوں پر ان کا قبول کرنا بھی واجب ہو جائے گا کیونکہ ان پر اگر قبول واجب نہ ہو تو اُن پر بیان کرنیکا وجوب بے معنی ہوگا۔ لہذا حجیت خبر واحد کی اس آیت کو دلیل قرار دینا خود بخود کمزور ہو جائے گا۔ کیونکہ حجیت خبر واحد کا مقصد یہ ہے کہ مجتہد اور فقیہ کے لئے کسی راوی کی نقل یا نسبت قابل قبول ہے۔ اور آیت اس کے برعکس اس مطلب کو ثابت کرتی ہے کہ عوام کے لئے مجتہد اور فقیہ کی بات قابل قبول ہے۔ یعنی آیت کہتی ہے کہ جب خبر دینے والا فقیہ و مجتہد ہو اور سننے والا ایسا نہ ہو تو اُس پر واجب ہے کہ اس کی بات کو قبول کرے۔ اور حجیت خبر واحد کہتی ہے کہ خبر دینے والا غیر مجتہد و غیر فقیہ ہو۔ اور مجتہد اور فقیہ استنباط مسائل شرعیہ میں اس کی خبر کو قبول کریں۔

آیت مجیدہ کا وجوب تحصیل علوم شرعیہ پر دلالت کرنا احادیث اہل بیت سے بالتواتر ثابت ہے۔ اور ظاہر آیت ممکن ہے کسی ایک حادثہ یا مخصوص واقعہ سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن قیامت تک کے لئے اس کا باقی رہنا اور اس کی تاویل و باطن کا جاری رہنا لامحالہ وجوب تحصیل علم پر دلالت کرتا ہے جس کی تائید معصومین کی فرمائشات اور عمل علماء سے صاف ظاہر ہے۔

پس اگر ہر جماعت و قوم میں سے ایک ایک گروہ کے لئے دین میں بصیرت و تفقہ اور مسائل شرعیہ میں اجتہاد حاصل کرنے کا حکم ہے تو اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ تقلید اعلم کا وجوب ساقط ہے کیونکہ اس صورت میں انذار کا حکم صرف اعلم کی طرف ہی متوجہ ہوگا۔ اور عوام کے لئے اسی کا ہی قول واجب القبول ہوگا۔ نہ غیر اعلم فقہاء پر انذار عائد ہوگا اور نہ عوام پر ان کی بات کا قبول کرنا ضروری ہوگا۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ہر قوم سے ایک ایک جماعت کے لئے تفقہ اور اجتہاد کا وجوب بھی ساقط ہو جائے گا بلکہ ہر دور میں صرف ایک ہی فقیہ کا ہونا ضروری ہوگا جس پر انذار واجب ہو۔ اور عوام پر اس کے حکم کے مطابق عمل کرنا ضروری ہو۔ ورنہ یہ بات بعید از فہم بلکہ سراسر ناانصافی ہے کہ سیکھنا ہر قوم و قبیلہ کی ایک ایک جماعت پر واجب ہو۔ اور تبلیغ بھی ہر فقیہ پر ضروری ہو۔ لیکن عوام کے لئے ان میں سے ایک کا قول ہی قابل قبول ہو۔ آیت مجیدہ میں حکم عمومی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دعوت اجتہاد اس لئے دی گئی ہے کہ عوام الناس کو دین کے سیکھنے اور سمجھنے میں سہولت رہے۔ اور مجتہد کے لئے بھی اپنی آواز کا پہنچانا آسان ہو۔ ورنہ اگر دنیا بھر میں صرف ایک شخص ہی دنیا بھر کے مومنین کے لئے واجب التقلید ٹھہرے تو نت نئے پیش آمدہ مسائل سے اس کا عہدہ برا ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہوگا۔ اور لوگوں کے لئے عمل میں جو دشواریاں پیش آئیں گی ان کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ پس جو مجتہد جس قوم میں ہو اُس قوم پر اس کا فتویٰ حجت ہوگا۔ ہاں البتہ اگر ایک جگہ متعدد مجتہد اور صاحبان فتویٰ موجود ہوں تو ان میں سے اعلم فالاعلم کی رعایت کرنا قابل فہم بھی ہے اور قرین عقل بھی۔ لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں خواہ مخواہ ایک کی طرف رجوع کا حکم تقریباً امر بالایطاق کے مترادف ہے۔ اور آئمہ کے زمانہ میں دور دور کے لوگوں کو اپنے اپنے قریب ترین علماء کی طرف رجوع کرنے اور مسائل سیکھنے کا حکم ہمارے قول کی تائید کے لئے کافی ہے اور اس کے شواہد بہت کافی ہیں۔ مقدمہ تفسیر میں مسئلہ تقلید اعلم کے بیان میں مفصل بیان کیا گیا ہے جس میں ہم نے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا

اے ایمان والو لڑو ان سے جو تمہارے قریب ہیں کفار ہیں سے اور چاہیئے کہ

فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا مَا

وہ تم ہیں شجاعت محسوس کریں اور جانو کہ تحقیق اللہ متقین کے ساتھ ہے اور جب کہ کوئی

أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا

سورہ اُترے تو بعض ان (منافقین) سے کہتے ہیں اس نے کس کا ایمان زیادہ کر دیا؟ بہرحال

الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ

جو مومن ہیں تو ان کے ایمان کو تو زیادہ کرتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں اور لیکن جن کے

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ

دلوں ہیں مرض ہے تو ان کا کفر اور کفر کے ساتھ بڑھاتی ہے اور ایسے لوگ

ثابت کیا ہے کہ ہر جامع الشرائط مجتہد کی تقلید جائز ہے اور تقلید اعلم کا وجوب بالکل بلا دلیل اور ناقابلِ فہم ہونے کے علاوہ ناقابلِ عمل بھی ہے۔

رکوع نمبر ۵

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ۔ اس آیت مجیدہ میں تمام اہل ایمان کو اپنی اپنی سرحدوں کے قریب ترین کفار سے جہاد کا حکم ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں جرأت و شجاعت اور سختی و تلخی کے مظاہرے کا فرمان ہے تاکہ اُن پر رعب طاری ہو جائے۔

وَإِذَا مَا چونکہ ایک مقام پر خدا کا فرمان ہے کہ جب قرآن کی آیتیں اُترتی ہیں تو مومنوں کے ایمان زیادہ ہوتے ہیں تو منافقین نے اس سے استہزا کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جب بھی کوئی آیت اُترتی تھی تو ایک دوسرے سے یا مومنین سے مسخری کے طور پر پوچھا کرتے تھے کہ تم میں سے اس آیت کے اُترنے سے کس کا ایمان بڑھا ہے۔ پس خدا ان کے قول کی تردید فرما رہا ہے کہ بے شک مومنوں کے ایمان میں یقینِ قلب اور سکونِ نفس کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دل نفاق کی مرض کا شکار ہیں اُن کے سابق کفر کے ساتھ اور کفر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ پہلے بھی نجس ہوتے ہیں پھر بار بار کے انکار سے اُن کے دل زیادہ سے زیادہ نجس ہوتے جاتے ہیں اور وہ کافر ہو کر ہی مرتے ہیں۔

أَوَلَا يَرَوْنَ ۔ مقصد یہ ہے کہ وہ ہر سال ایک یا دو دفعہ امتحان لئے جاتے ہیں یعنی کفار کے ساتھ جہاد میں ان کو ظاہراً اپنے مال و جان کی حفاظت کی خاطر شریک ہونا پڑتا ہے۔ پس مومنین کی قوت و شوکت کو دیکھتے ہیں اور کفار کی

كُفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ

مرے تو بھی کافر ہوکر کیا تم دیکھتے نہیں کہ تحقیق وہ آزمائے جاتے ہیں ہر سال ایک یا دو دفعہ پھر

ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ

بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں اور جب اترے کوئی سورہ تو بعض ان کے

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ

دوسرے کی طرف گھورتے ہیں کہ کوئی دیکھتا تو نہیں پھر چلے جاتے ہیں پھیر لیا خدا نے ان کے

قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

دلوں کو وہ ایسی قوم ہیں جو نہیں سمجھتے تحقیق تمہارے پاس رسول تم میں سے آیا

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ

ناگوار ہے اس کو تمہاری تکلیف حرص کرتا ہے تمہارے اوپر کہ مسلمان ہو جاؤ اور مومنین پر رؤف رحیم ہے پس اگر

تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِىَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾

وہ پھر جائیں تو کہہ دے کہ مجھے کافی ہے اللہ نہیں کوئی لائق عبادت سوائے اس کے اس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

ذلت کا ملاحظہ بھی کرتے ہیں یا یہ کہ ان کی بدباطنی اور منافقت کا پردہ چاک بھی کیا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں میں لبا اوقات رسوائے عام بھی ہوتے ہیں لیکن بایں ہمہ وہ توبہ نہیں کر لیتے۔ اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ۔ یعنی جب قرآن مجید کی کوئی تازہ سورت اترے تو منافقین جو ایک دوسرے کے قریب یا دور بیٹھے ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ آنکھوں کے اشاروں اشاروں میں باتیں کر لیتے ہیں کہ آیا کوئی ہمیں دیکھنے والا تو نہیں ہے۔ پس اگر جانیں کہ کوئی نہیں دیکھتا تو اسی مشغلہ میں لگے رہتے ہیں کہ آنکھوں کے اشاروں سے آیات پر تمسخر کرتے ہیں۔ اور جب معلوم کر لیں کہ کوئی دیکھ رہا ہے تو پہلو بدلا لیتے ہیں۔ اور چپ ہو جاتے ہیں۔ یا یہ کہ جب جانتے ہیں کہ ہماری طرف کسی کا خیال نہیں ہے تو درمیان میں سے آہستہ آہستہ کھسک کر چلے جاتے ہیں تاکہ کوئی آیت ایسی نہ ہو جس میں ہماری تذلیل ہو۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ۔ عربوں کو غیرت دلائی گئی ہے کہ یہ رسول تمہاری قوم میں سے یا تمہاری جنس میں سے یا تمہارے ملک میں سے تم میں مبعوث ہوا ہے تم نے اس کے بچپنے جوانی بلکہ پوری زندگی کا پورا پورا مطالعہ کیا ہے اگر اس میں کوئی نقص ہوتا تو تم سے اوجھل نہ ہوتا پس جب کوئی عیب اس میں نہیں ہے تو سمجھو کہ وہ تمہاری خیر خواہی کرتا ہے اور تمہارے فائدہ کے لئے

ہی تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہے اور تمہارے ساتھ انتہائی مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے۔ پس تم پر واجب ہے کہ اس کی بات مانو اور اس کے حکم کی حتی الامکان اطاعت کرو۔

سلامتی کے لئے ورد ۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ اس سورہ کی آخری آیت قرآن کی سب سے آخری آیت ہے جو آسمان سے آخر میں اتری ہے اور قرآن کی سورت کاملہ جو سب سے آخر اتری وہ یہی سورہ برأت ہے۔ تفسیر جامع میں بروایت اصبغ بن نباتہ حضرت امیر المومنین علیہ السّلام نے فرمایا کہ گھر سے روانگی کے وقت سورۂ برأت کی آخری دو آیتیں پڑھ کر انسان روانہ ہو تو حیوانات درندوں کے خطرہ سے محفوظ رہتا ہے۔

سُورہ براۃ کی تفسیر ختم ہُوئی۔ والحمد للہ رب العالمین

سُورَۂ یُونُس

اس سُورہ مبارکہ میں ایک سو نو آیتیں ہیں۔ اور بقول صاحب تفسیر جامع کے ۱۸۳۲ کلمات اور ۷۵۳۲ حرف ہیں۔ یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہُوا۔ اور بسم اللہ کو ملا کر اس کی آیات کی تعداد ۱۱۰ بنتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ جو شخص اس سورہ کو دو ماہ یا تین ماہ میں پڑھے تو وہ جاہلوں سے نہ ہوگا اور قیامت کے روز مقربین میں سے ہوگا۔

تفسیر جامع میں کتاب خواص القرآن سے منقول ہے کہ جو شخص اس سُورہ کی تلاوت کرے گا اس کے نامۂ اعمال میں حضرت یونسؑ کی تصدیق و تکذیب کرنے والوں کی تعداد کے برابر نیکیاں درج ہوں گی۔ اگر اس سورہ کو لکھ کر نیچے ان افراد خانہ کے نام لکھے جو اس گھر میں ہوں اور اس نوشتہ کو گھر کے اندر رکھے تو ان ناموں والے اشخاص میں سے جس کے ذمہ کوئی قصور ہوگا وہ ظاہر ہو جائے گا۔ چنانچہ اگر اس سُورہ کو طشت میں لکھ کر دھویا جائے اور اس پانی سے آٹا خمیر کر کے روٹی پکائی جائے (بشرطیکہ مشتبہ لوگوں کے نام بھی سُورہ کے نیچے لکھے جائیں) پس وہ پکی ہُوئی روٹی ان لوگوں کو کھلائی جائے تو جو بھی ان میں سے چور ہوگا وہ لقمہ اس کے حلق میں پھنس جائیگا اور اس کو نہ کھا سکے گا۔ اور اگر کھا لیا تو چوری کا اقرار ضرور کرے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن و رحیم ہے (شروع کرتا ہوں)

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۞ ١ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ

الرا یہ محکم کتاب کی آیتیں ہیں کیا لوگوں کے لئے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی کی

اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ

ایک بندے کی طرف ان میں سے کہ ڈراؤ لوگوں کو اور خوشخبری دے ان کو جو ایمان لائے تحقیق ان کے لئے اچھا اجر

صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۞ ٢

ہے نزدیک ان کے رب کے تو کہنے لگے کافر تحقیق یہ جادو گر ہے صاف

رکوع نمبر ۶

الٓر ۔ یہ حروف مقطعات قرآنیہ میں سے ہے۔

اَلْحَكِيْمِ ۔ یعنی محکم ۔ اس جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات سب محکم ہیں۔ اور دوسری جگہ اس کی بعض آیات کو متشابہ بھی فرمایا۔ اس مسئلہ کی مکمل تحقیق ہم تفسیر انوار النجف کی تیسری جلد صفحہ ۱۹۱ تا صفحہ ۱۹۵ بیان کر چکے ہیں۔ (پہلا ایڈیشن)

ضرورت نبی

اَكَانَ لِلنَّاسِ ۔ چونکہ انسان تدبیر نفس اور تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ میں عقل کی رُو سے ایک خاص نظام پر چلنے کا محتاج ہے۔ اور اپنے معبود حقیقی کے سامنے فریضہ عبدیت کے نبھانے کا طریق کار بھی اس کو مہیا کرنا ہے اور یہ سب کچھ براہِ راست نہ تو اپنی عقل سے طے کر سکتا ہے اِس لئے کہ وہ اوہام و شہوات و خواہشات و اغراض و حرص و ہوس وغیرہ قوائے کثیرہ پر ہمہ گیر غلبہ پانے سے قاصر ہے لہٰذا اس کے طے کردہ اصول و قوانین ان قوائے مذکورہ کے یا ان میں سے بعض کے اشارے سے وضع شدہ ہونے کی حیثیت سے مبنی بر انصاف نہ ہوں گے۔ اور نہ اس میں اس قدر صفائے باطن اور قوتِ قدسیہ ہے کہ براہِ راست اپنے خالق سے رابطہ قائم کر سکے۔ پس خدائے علیم و حکیم نے اس بندۂ عاجز پر اپنا لطف و کرم عام کرتے ہوئے اپنی جانب سے نمایندے بھیج کر ان کو انسانوں کے لئے ایک ضابطہ حیات عطا فرمایا جس کا نام اسلام رکھا۔ اور انہیں ضروریاتِ زندگیٔ انسانی میں جملہ شعبہ جات پر حاوی مفصل احکام کے رواج دینے کی ہدایت کی اور تمام انسانوں کو اس کی دعوتِ عام دی اور حضرت رسالت مآبؐ ان تمام خدائی نمایندوں کے سردار و حاکم اور سب سے افضل ہیں اور ان کا لایا ہوا پیغام کامل اور ان کے بیان کردہ اصول احکام اور فروع و مسائل لازوال مصالح پر مبنی ہیں ۔ جن پر عمل کر کے انسان دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کر سکتا ہے اور جونہی حضورؐ نے نجات انسانی کا

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ

تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پھر

اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ‌ؕ مَا مِنۡ شَفِيۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِهٖ‌ ذٰ لِكُمُ

متمکن ہوا عرش پر وہ تدبیر کرتا ہے انتظام کی کوئی نہیں شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت سے یہ اللہ

اللّٰهُ رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ‌ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا‌ ؕ

ہی تمہارا رب ہے پس اس کی عبادت کرو کیا تم نہیں سوچتے اس کی جانب تمہاری سب کی بازگشت ہے

وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا‌ ؕ اِنَّهٗ يَبۡدَؤُا الۡخَـلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ لِيَجۡزِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا

اللہ کا وعدہ حق ہے تحقیق اس نے ایجاد کی مخلوق پھر اس کو پلٹائے گا تاکہ جزا دے ان کو جنہوں نے ایمان لایا اور

مژدہ سنایا تو کفار قریش نے اپنی اہلیت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ واہ خدا نے ان کو کیسے بھیجا حالانکہ یہ تو ہم جیسا ہے پس آیت مجیدہ میں ان کے اس قول کی تردید ہے۔

قَدَمَ صِدۡقٍ کہتے ہیں کہ آقا کا اچھا فعل ید سے تعبیر کیا جاتا ہے اور غلام کا اچھا فعل قدم سے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ غلام و آقا کے مراتب کا فرق ذہن نشین رہے اور اس جگہ قدم صدق سے مراد ان کا وہ اجر ہے جو ان کے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ان کو ملے گا۔ روایات اہل بیت میں قدم صدق سے محمدؐ و آل محمدؐ کی شفاعت بھی مراد لی گئی ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ۔ آیت مجیدہ کی ضروری تفسیر اسی کتاب کی چھٹی جلد ص۱۴ و ص۴۲ پر گذر چکی ہے۔ اور اسی جلد میں پارہ ۱۲ کے رکوع نمبر ۱ میں بھی بیان ہوگا۔ ص۱۹۲ پر ملاحظہ ہو۔

دلائل بر وجود خدا

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ۔ یعنی تمام نظام عالم کی تدبیر اُسی کے علم و حکمت کا ہی نتیجہ ہے۔ اگر چاہتا تو کائنات کی ہر چیز کو بتعبیر کن فیکون ایک لحہ میں خلق فرما دیتا لیکن کہنے والے کہہ دیتے کہ یہ تخلیق اتفاقی ہے پس اُس نے ایک نظام اور تدبیر محکم کے ماتحت ہی آسمانوں زمینوں کی خلقت کو چھ دنوں میں اور مثلاً انسان کی خلقت کو دس ماہ میں اور کسی کو کم مدت میں اور کسی کو زیادہ مدت میں مکمل کیا تاکہ عقل سلیم کے لئے اُس کے مصالح و مفاسد پر مبنی نظام کا سمجھنا آسان ہو جائے جس سے وجود و توحید خالق کے اقرار تک راستہ ہموار بن جائے۔

مَا مِنۡ شَفِيۡعٍ۔ یہاں شفاعت کا تذکرہ درمیان میں جملہ معترضہ کی حیثیت سے ہے کہ کفار کا یہ خیال تھا کہ اللہ کے سامنے ہمارے بُت ہماری شفاعت کریں گے تو اس کی تردید ہے کہ وہاں تو نبی بھی بغیر اذن کے شفاعت کا حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ یہ بُت شفاعت کریں۔

الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ

عمل نیک کئے ساتھ عدل کے اور جو کافر ہیں ان کے لئے کھولتا ہوا پانی اور عذاب

اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ

دردناک ہوگا بوجہ کفر کے وہ وہ ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو

نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ

چاندنی دی اور مقرر کیا اس کو منزلوں میں تاکہ تم سالوں کا عدد اور حساب جان لو نہیں پیدا کیا اللہ نے یہ مگر برحق

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

کھول کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے اس قوم کے لئے جو سمجھیں تحقیق شب و روز کے اختلاف میں

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ⑥

اور وہ جو پیدا کیا اللہ نے آسمان و زمین میں البتہ آیات ہیں تقویٰ رکھنے والے لوگوں کے لئے

۱۲۵

فَاعْبُدُوْهُ ۔ اپنی خالقیت، حکمت، تدبیر اور علم و قدرت کو مختصر اور جامع الفاظ میں سمجھانے کے بعد فرماتا ہے کہ تمہارا خدا یہ ہے جس کی شان یہ ہے۔ پس اسی کی ہی عبادت کرو۔ اور پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ اللہ فاعل موجب نہیں تاکہ تم یہ سمجھو کہ اس نے پیدا کر دیا ہے۔ بس اب ہم خود مختار ہیں اور ہماری باز پُرس کوئی نہ ہوگی بلکہ وہ فاعل مختار ہے جس طرح اس نے اپنے اختیار سے پیدا کیا ہے وہ تمہیں فنا بھی کر سکتا ہے اور پھر تمہاری اس کی طرف بازگشت ہوگی۔ اور تمہارے اعمال کا جائزہ لے کر نیکیوں کی جزا اور برائیوں کی سزا بھی دے گا۔ لہٰذا اس کے سوا کسی اور کی عبادت و اطاعت نہ کرو۔ یعنی کسی کی اطاعت کے لئے جو داعی ہونے چاہئیں وہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اگر محسن کی اطاعت ضروری ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی محسن نہیں ہے اور اگر طمع سے اطاعت کی جاتی ہے تو اس سے بڑھ کر کسی کے پاس انعام و اکرام نہیں۔ اور اگر ڈر موجب اطاعت ہے تو اس کی سزا اور گرفت کے مقابلہ میں کسی کی سزا نہیں ہو سکتی پس جب اس میں ہر حیثیت سے معبودیت کا داعی موجود ہے تو اسی کی ہی اطاعت کرنی چاہیئے۔

هُوَ الَّذِيْ ۔ تفسیر جامع میں اس کا نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ کفار نے حضرت پیغمبرؐ سے یہ درخواست کی تھی کہ اگر آپ خداوند کریم کے وجود اور اس کی توحید پر واضح علامتیں اور نشانیاں ہمیں بتائیں تو ہم آپ پر ایمان لانے میں کوئی تامل نہ کریں گے پس یہ آیات نازل ہوئیں۔ یعنی خدا وہ ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو تابانی عطا فرمائی اور اس کے لئے منزلیں

مقدر فرمائیں۔ الخ۔

علامہ مفتی جعفر حسین صاحب مرحوم کی دلچسپ اور پُر از معنی تحقیق

محمدیہ جنتری ۱۹۶۶ء دعائے رؤیت ہلال کے عنوان سے اپنے بیان میں فرماتے ہیں۔ "اس سلسلہ میں ہیئت والوں نے جو معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ زمین سے چاند کا فاصلہ مستقل نہیں ہوتا بلکہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے چنانچہ اس کا اوسط فاصلہ ۲ لاکھ ۳۸ ہزار ۸ سو ۶۰ میل ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ۲ لاکھ ۲۵ ہزار، سو ۱۰ میل اور کم سے کم ۲ لاکھ ۲۱ ہزار ۴ سو ۳۶ میل ہے اور قطر ۲ ہزار ایک سو ۶۳ میل ہے۔ جو دو ہزار ۲ سو ۸۷ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ اور ایک ایسے زاویے پر واقع ہے کہ اس کا ۲/۵ حصہ ہمیشہ اہل زمین کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس میں گہرے کھڈ پھیلے ہوئے چٹیل میدان اور سنگلاخ پہاڑ ہیں۔ جن کی چوٹیاں ۵ ہزار فٹ سے ۱۸ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اور بعض ہیئت والوں کا اندازہ ۳۰ ہزار فٹ تک کا بھی ہے۔ اس کی کشش زمین کی بہ نسبت ۱/۶ حصہ ہے۔ اس طرح کہ اگر زمین پر ایک انسان کا وزن ۱۷۵ پونڈ ہو گا تو چاند پر اس کا وزن ۲۹ ۱/۶ پونڈ رہ جائے گا۔ اور اس کے جس حصہ پر سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں۔ وہاں کا درجہ حرارت ۱۳۰ سنٹی گریڈ ہوتا ہے اور جس حصہ پر شعاعیں نہیں پڑتیں وہاں صفر سے ۱۲۰ درجہ سنٹی گریڈ کم ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ سبزہ و روئیدگی کے نشان ہیں نہ پانی کا وجود اور نہ ہوا کا گذر ہے۔ یہ تیرہ و تاریک سورج سے روشنی مستعار لیتا ہے۔ اور یہی روشنی منعکس ہو کر ہماری راتوں کو روشن اور کرۂ زمین کو حسن و رعنائی کے جلووں سے معمور کر دیتی ہے۔ بعض علماء نے ارشاد الٰہی هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا (یعنی اس نے سورج کو ضیا بار اور قمر کو روشن قرار دیا ہے) سے سورج کی روشنی کے اصلی اور چاند کی روشنی کے اکتسابی ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس طرح کہ قدرت نے سورج کے لئے ضیا اور چاند کے لئے نور کی لفظ استعمال کی ہے۔ اور ضیا و نور میں اصلی و اکتسابی ہی کا فرق ہے۔ چنانچہ صاحب ریاض السالکین تحریر فرماتے ہیں

قال المتکلمون القائم بالمعنی لذاته هو الضوء کما فی الشمس و بالمعنی لغیره هو النور کما فی القمر

(متکلمین کا قول ہے کہ جو چیز خود سے روشن ہو وہ ضو ہے جیسے سورج اور جو دوسرے سے روشن ہو وہ نور ہے جیسے قمر"

قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ۔ ممکن ہے ھا ضمیر کا مرجع کُلّ وَاحِدٍ ہو۔ یعنی سورج اور چاند دونوں میں سے ہر ایک کے لئے منازل مقرر فرمائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے ضمیر کا مرجع صرف قمر ہو۔ اور منازل قمر ۲۸ ہیں۔ شرطین۔ بطین۔ ثریا۔ دبران۔ ہقعہ۔ ہنعہ۔ ذراع نثرہ، طرفہ۔ جبہہ۔ زبرہ۔ صرفہ۔ عوا۔ سماک۔ غفر۔ زبانا۔ اکلیل۔ قلب۔ شولہ۔ نعایم۔ بلدہ۔ ذابح۔ بلع۔ سعود۔ سعد الاخبیہ فرع۔ دلو مقدم۔ فرع دلو موخر۔ بطن الحوت۔ انتہیٰ۔

تفسیر جامع میں ہے کہ چاند کی تین قسم کی گردشیں ہیں۔ تبعی۔ انتقالی اور وضعی پہلی گردش یہ ہے کہ زمین جب سورج کے گرد گھومتی ہے اور چاند بھی اس کے تابع ہو کر سورج کے گرد چکر لگاتا ہے۔ پس چاند کی یہ گردش چونکہ زمین کے تابع ہے۔ لہٰذا اس کو تبعی کہتے ہیں۔ دوسری گردش وہ ہے جو زمین کے گرد ۲۷ دن ۷ گھنٹے ۴۳ منٹ میں ایک چکر پورا کرتا ہے اور اس کی یہ

گردش انتقالی ہے اور تیسری وہ جو اپنے محور پر گردش کرتا ہے اور وہ اس کی وضعی گردش ہے اور زمین و چاند کے درمیان اسی طرح کشش موجود ہے جس طرح کہ زمین اور سورج کے درمیان موجود ہے۔ علم ہیئت قدیم والے زمین کے سورج کے گرد گھومنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ زمین کو ساکن مانتے ہیں۔ اور چاند و سورج کی اس کے گرد گردش کے قائل ہیں۔ اس لحاظ سے چاند کی تبعی گردش وہ ہوگی جو سورج کے تابع ہو کر وہ زمین کے گرد کرتا ہے۔

علامہ طبرسی فرماتے ہیں کہ چاند و سورج کی تخلیق و تقدیر میں خدا کی توحید پر بہت زبردست دلائل و براہین موجود ہیں۔ مثلاً دن کی تخلیق دن میں ضیاء و نور کی تفویض، ان کی گردشیں، باہمی کشش، فاصلہ قرب و بعد، ان کی مشارق، مغارب کسوف، خسوف، ضیا باری، گرمی و سردی میں الگ الگ تاثیرات، نشو و نما۔ نباتات۔ پھلوں کا پکنا۔ پھر قمر میں ہلال۔ بدر محاق وغیرہ ان میں سے ہر ایک غور و فکر کے لئے ایک وسیع و عریض میدان رکھتا ہے اور ان کے حالات میں جس قدر تعمق ہوگا، اسی قدر خالق کی معرفت اور اس کی عجیب صنعت اور کمال حکمت کے لازوال ذخائر دستیاب ہوتے جائیں گے۔ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِيْنَ۔ یعنی سورج اور چاند کی منازل کی تعیین فرمائی تاکہ تم حساب اور سالوں کے عدد کو جان سکو۔ اس سلسلہ میں علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ مدظلہ کے سابقہ تحقیقی مقالہ کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اوقات کی حد بندی کا تصور انسان کے دل میں سورج کے طلوع و غروب سے پیدا ہوا، اس طرح کہ اس نے سورج کو نکلتے اور پھر اسے ڈوبتے دیکھا اور طلوع سے لے کر غروب تک کا وقت تاریک پایا تو اس نے ایک طلوع سے لے کر دوسرے طلوع تک کا وقت دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ روشن حصہ کا نام دن ہوا اور تاریک حصہ کا نام رات۔ اب اگر وقت کا حساب اسی شب و روز سے چلتا تو ایک پچاس سالہ شخص کو اپنی عمر کا حساب لگانے کے لئے اٹھارہ ہزار دو سو پچاس راتوں اور اٹھارہ ہزار دو سو پچاس دنوں کا حساب رکھنا پڑتا اور اگر شب و روز کے مجموعہ سے حساب کرتا جب بھی اٹھارہ ہزار دو سو پچاس کے شمار کی ضرورت پڑتی۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح حساب و شمار نہایت دشوار ہوتا۔ اس دشواری کو اس نے چاند کے ذریعہ دور کیا۔ اس طرح اس نے دیکھا کہ وہ ایک معین وقت پر نکلتا ہے اور تغیر و تبدل کے مختلف حالات سے گذرتا ہوا کچھ مدت کے لئے آنکھوں سے روپوش ہوتا ہے۔ اور پھر اسی پہلی وضع و صورت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے۔ جس میں کبھی خلل رونما نہیں ہوتا تو چاند کے دو طلوعوں کے درمیانی عرصہ سے ایک اور وقت کی حد بندی کر لی۔ اور اس کا نام مہینہ تجویز کیا۔ اب پچاس سال کی مدت کے لئے اٹھارہ ہزار دو پچاس دنوں کو یاد رکھنے کے بجائے چھ سو مہینے ہی یاد رکھنا پڑے۔ پھر موسموں کے دورہ کرنے سے ایک اور مدت کی طرف توجہ پیدا ہوئی اور اس نے دیکھا کہ ایک موسم کے شروع ہونے کے بعد دوبارہ اسی موسم کے شروع ہونے تک بارہ مرتبہ چاند طالع ہوتا ہے تو اس نے بارہ مہینوں کی ایک مدت تجویز کر لی اور اس کا نام سال ہوا۔ جب سالوں کے ذریعہ اوقات کی حد بندی ہونے لگی تو اوقات شماری کی تمام دشواریاں دور ہو گئیں۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے تشکیل اوقات کی طرف توجہ کی۔ وہ اہل مصر تھے۔ چنانچہ آثار مصر کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاں وہ ایک مہینہ ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ وہاں ہلال کی شکل بنا دیتے تھے۔ اور ۶۰۰ ق م انہوں

نے اپنے تہواروں کے ناموں پر بارہ مہینوں کے نام رکھ کر سال کی حدبندی کر لی تھی۔ اور یونان۔ روم۔ ہند اور عرب میں بھی قمری مہینوں کا حساب رائج تھا۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے بھی قمری مہینوں کو برقرار رکھا اور قمری مہینوں ہی کے لحاظ سے سال کی تحدید کی اور مہینوں کو گھٹانے بڑھانے اور آگے پیچھے کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں عرب اپنی مقصد براری کے لئے امن و آشتی کے مہینہ کو مؤخر کر دیتے یا حج کے مہینہ کو پیچھے ڈال دیتے تھے۔ یہ سال سنہ ہجری کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس کی ابتدا امیر المومنین علی بن ابی طالب کے مشورہ سے پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ہجرت کا واقعہ ۲۷ صفر کو پیش آیا اور ۱۲ ربیع الاوّل کو آں حضرتؐ کا مدینہ میں ورود ہوا۔ مگر محرم کی اہمیت و شہرت اور اشہر حرم میں نمایاں ہونے کی وجہ سے اور بایں ہمہ چونکہ ہجرت کا ارادہ محرم ہی سے تھا۔ اسے سال کا پہلا مہینہ قرار دیا گیا۔ اگرچہ قمری حساب سیدھا سادہ اور ہر قسم کے پیچ وخم سے پاک ہے مگر اس میں یہ دشواری نظر آئی کہ اس کے ذریعہ فصلوں کی حدبندی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جو مہینہ آج سردی میں آرہا ہے پھر گرمی میں آنا شروع ہو جائے گا۔ اور جو خزاں میں آرہا ہے وہ بہار میں آنے لگے گا۔ لہٰذا یہ نہ بتایا جا سکے گا۔ کہ گرمی کے مہینے کون سے ہیں اور سردی کے کون سے۔ کس مہینے میں کاشت ہوگی اور کس مہینے میں کاٹی جائے گی۔ اور مصریوں کو بھی یہی دقت پیش آئی۔ کیونکہ ان کی زندگی کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا۔ اور ایک برسات سے لے کر دوسری برسات تک انہوں نے بارہ مہینوں کا حساب لگایا تھا مگر برسات تیرہ مہینوں کے بعد آنے لگی۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسی صورت ہونا چاہیئے کہ گرما و سرما اور بہار و خزاں کے موسم کی حدبندی ہو جائے۔ چنانچہ فلکی مطالعہ نے انسان کی رہنمائی کی۔ اور اس نے دیکھا کہ چاند ہر رات کسی نہ کسی ستارے کے پاس نظر آتا ہے۔ اور چونکہ چاند کے نظر آنے کی راتیں اٹھائیس ہوتی ہیں۔ اس لئے اس نے ان ستاروں کو علامت قرار دے کر چاند کی اٹھائیس منزلیں قرار دے لیں۔ ان منزلوں کو ہندی میں نچھتر کہا جاتا ہے جو اسونی، بھرنی، کرتکا روہنی وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اور عربی میں ان کے نام ص۱۴۵ پر مذکور ہو چکے ہیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ منطقۃ البروج پر کئی ستاروں کے جھرمٹ ہیں۔ جنہیں قاعدہ سے ملایا جائے تو بارہ مختلف شکلیں بن جاتی ہیں۔ اور انہیں شکلوں کے لحاظ سے ان کے نام رکھ لئے گئے۔ ہندی میں انہیں راس اور عربی میں برج کہا جاتا ہے۔ ہندی نام یہ ہیں۔ میکھ۔ برکھ۔ متھن۔ کرک۔ سنگھ۔ کنیا۔ تلا۔ برچھک۔ دھن۔ مکر۔ کنبھ۔ مین۔ اور اسی ترتیب سے عربی نام یہ ہیں۔ حمل۔ ثور۔ جوزا۔ سرطان۔ اسد۔ سنبلہ۔ میزان۔ عقرب۔ قوس۔ جدی۔ دلو۔ حوت۔

پھر ان منزلوں کو ۳۶۰ درجوں پر تقسیم کیا۔ اور ہر منزل میں چاند کا قیام ۱۲ درجہ اور تقریباً ۵۱ دقیقہ اور ہر برج میں اس کا ٹھہراؤ دو دن آٹھ گھنٹہ قرار دیا۔ پھر یہ دیکھا کہ جس منزل کو چاند شبانہ روز میں طے کرتا ہے۔ سورج اسے تقریباً ۱۳ دنوں میں تمام کرتا ہے۔ جس سے منزلوں کے دن ۳۶۴ بنتے ہیں لیکن سورج اس مقام پر جہاں سے چلا تھا ۳۶۵ دن میں پہنچتا ہے۔ اس طرح کہ حمل۔ ثور۔ سرطان۔ اسد اور سنبلہ میں ۳۱-۳۱ دن جوزا میں ۳۲ دن میزان۔ عقرب۔ دلو اور حوت میں ۳۰، ۳۰ دن۔ اور قوس و جدی میں ۲۹-۲۹ دن صرف کرتا ہے تو انہوں نے ایام منازل کو دورہ شمسی کے دنوں سے مطابق کرنے کے لئے منزل عقر

ف اس کی وضاحت ص۴۸ پر اسی جلد میں ملاحظہ ہو۔

ہیں ایک دن کا اضافہ کر کے ۳۶۵ دن کا سال مقرر کر لیا۔ اور موسموں کو ان منزلوں پر تقسیم کر کے فصول اربعہ کی حد بندی کر لی۔ اور اُسے شمسی سال سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اور بعض ملکوں میں شمسی سال کے باوجود مہینوں کا حساب قمری ہی رہا۔ حالانکہ قمری حساب سے سال کی مدت ۳۵۴ دن ۸ گھنٹے ۴۸ منٹ ۳۲ سیکنڈ ہوتی ہے کیونکہ قمری مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ اگرچہ چاند ۲۷ دن ۷ گھنٹہ ۴۳ منٹ کی مدت میں سمت متقابل کی طرف حرکت کرتا ہوا زمین کے گرد اپنا دورہ مکمل کر لیتا ہے لیکن حرکت ارضی کی وجہ سے چاند کے سفر میں ۲ دن ۱۲۱ اعشاریہ کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اسے اپنا سفر تمام کرنے کے لئے ۲۹ دن ۱۲ گھنٹہ ۴۳ منٹ ۱۲ سیکنڈ کی مدت درکار ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ کبھی ۲۹ دن کے بعد نظر آتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کے بعد۔ اس رویت پر مہینوں کی مدت کا انحصار ہے اور شمسی سال کی مدت ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ ۴۶ سیکنڈ ہوتی ہے۔ اس لئے قمری سال ۱۰ دن ۱۲ گھنٹے ۱۴ سیکنڈ شمسی سال سے چھوٹا ہوگا اور ہر سو سال کے بعد شمسی سال سے تین سال آگے بڑھ جائے گا۔

چنانچہ اہل کتاب میں سے ایک شخص نے امیر المومنین علیہ السّلام سے کہا کہ قرآن مجید میں اصحاب کہف کے متعلق ہے کہ ولبثوا فی کھفھم ثلث مائۃ سنین وازدادوا تسعا (وہ غار میں تین سو برس ٹھہرے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیئے) اور ہمارے ہاں کی کتاب میں صرف تین سو برس کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف کیوں ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ یونانیوں کے تین سو برس عربوں کے تین سو نو سالوں کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ جب ہر سو سال میں تین سال کا اضافہ ہوگا۔ تو تین سو سالوں کے بعد نو سو سالوں کا اضافہ ہونا ہی چاہیئے۔

روم میں مہینوں کا حساب چاند سے اور سال کا حساب سورج سے لگایا جاتا تھا۔ جب روم میں جولیس سیزر حکمران ہوا تو اُس نے ۴۵ ق م دو ہیئت والوں کی مدد سے سال کی مدت ۳۶۵ دن ۶ گھنٹہ مقرر کی اس طرح کہ فروری کے ۲۹ دن اور باقی مہینوں میں ایک مہینہ ۳۰ دن کا اور دُوسرا ۳۱ دن کا قرار دیا۔ اور ۶ گھنٹوں کی کھپت کے لئے ہر چوتھے سال فروری میں ایک دن کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور اپنے نام پر جون کے بعد آنے والے مہینے کا نام جولائی رکھا۔ اس کے بعد اگسٹس نے جولائی کے بعد والے مہینے کا نام اپنے نام سے اگست رکھا۔ اور فروری سے ایک دن نکال کر اس میں بڑھا دیا۔ یہ حساب صدیوں سے چلتا رہا۔ لیکن سال کی مدت چونکہ ۳۶۵ دن ۶ گھنٹہ تھی اس لئے ۴۰۰ سو سال کے عرصہ میں تحویل آفتاب میں ۳ دن کا فرق پڑ گیا چنانچہ ۴۵ ق م جب یہ سال رائج ہوا تھا تو تحویل آفتاب ۲۵ مارچ کو تھی۔ انہوں نے بتایا کہ شمسی سال کی صحیح مدت چونکہ ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ ۴۶ سیکنڈ ہے اور ملکی سال کا شمار ۳۶۵ دن ۶ گھنٹہ کے حساب سے ہوتا رہا ہے۔ اور ملکی سال شمسی سال سے ۱۱ منٹ ۱۴ سیکنڈ آگے بڑھتا رہا ہے اِس لئے یہ فرق پڑ گیا ہے مگر اس کی تصحیح کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ آخر ۱۵۸۲ء میں پاپائے اعظم گریگری نے اس کی طرف توجہ کی۔ اور گذشتہ سالوں میں جو ۱۰ دن زیادہ شمار ہوئے تھے کم کر دئے۔ اور آئندہ کے لئے ہر تین سال کے دن ۳۶۵ اور چوتھے سال کے دن ۳۶۶ قرار دیئے تاکہ ان چار سالوں میں ہر سال جو ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۶ سیکنڈ زائد ہوتے ہیں۔ ان کی کھپت ہو جائے۔ مگر جب یہ دیکھا گیا کہ اس سے بھی کچھ فرق پڑتا ہے اس طرح کہ کمی تو چار سالوں میں

۲۳ گھنٹے ۱۵ منٹ ۴ سیکنڈ کی ہوئی ہے اور اضافہ ایک دن کی صورت میں ۲۴ گھنٹے کا کیا گیا ہے جس سے ۴۰۰ سال میں ۳ دن دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے پوری صدی والے سالوں میں صرف اس سال میں اضافہ باقی رکھا گیا جو ۴۰۰ پر تقسیم ہو جائے تاکہ یہ بڑھنے والے تین دن کم ہو جائیں لیکن اس صورت میں بھی ۲۶ سیکنڈ ہر سال میں بڑھ جاتے ہیں جو ۳۳۲۳ سال میں ایک دن کے مساوی ہو جائیں گے۔ اس کے تدارک کی یہ صورت نکالی گئی کہ جو سال ۴۰۰۰ پر پورا تقسیم ہو جائے۔ اس میں ایک دن کا اضافہ نہیں کیا جائے گا لیکن یہ ایک دن تو ۳۳۲۳ سالوں میں بڑھتا تھا اور کئی چار ہزار سال میں ایک دن کی تجویز ہوئی تو اس کے نتیجہ میں ۲۰ ہزار سالوں میں ایک دن پھر بڑھ جائے گا مگر اس کے حل کی ابھی تک کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔

جس سال میں ایک دن کا اضافہ کیا جاتا ہے اس کے پہچاننے کا حسابی طریقہ یہ ہے کہ سنہ عیسوی کو چار پر تقسیم کر دیا جائے اگر ایک باقی رہے تو ۳۶۵ دن والا پہلا سال، دو باقی رہیں تو دوسرا، تین باقی رہیں تو تیسرا اور پورا تقسیم ہو جائے تو وہ ۳۶۶ دنوں کا سال ہوگا۔ ایسے سال کو لیپ کا سال کہا جاتا ہے۔

بہرحال اس بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ ملکی سال کبھی شمسی سال سے گھٹ جاتا ہے اور کبھی بڑھ جاتا ہے۔ ادھر چوتھے سال ایک دن کے اضافہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اور پھر بھی تفاوت رہ جاتا ہے اور پھر اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو علم فلکیات میں مہارت رکھتا ہو۔ بخلاف قمری حساب کے کہ وہ گھٹائے بڑھائے بغیر بالکل قدرتی حالت میں ہے۔ اور ہر شخص بآسانی معلوم کر لیتا ہے کیونکہ اس کا تعلق عام مشاہدہ سے ہے۔ اس لئے اسلام نے اعمال وعبادات کی بنیاد زیادہ تر قمری حساب پر رکھی ہے تاکہ تعین اوقات میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور جو سورج سے متعلق ہیں جیسے افطار صوم یا اوقات نماز یا نماز آیات تو ان کا تعلق صرف سورج کے مشاہدہ یعنی طلوع وغروب وزوال اور کسوف سے ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ البتہ کچھ امور ایسے ہیں جو شمسی حساب سے متعلق ہیں مگر وہ اعمال واجبہ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ جیسے نوروز، کیونکہ جس دن غدیر خم میں اعلانِ خلافت علوی ہوا۔ اور جس دن امیر المومنین علیہ السّلام زینت افزائے سریر خلافت ہوئے۔ آفتاب برج حمل میں تھا اسی لئے اس دن کی مسرّت کو دوچند کرنے کے لئے قمری وشمسی دونوں تاریخوں کو یوم مسرّت قرار دیا گیا۔ اسی طرح نوروز کے ۲۳ دن بعد نیسان کا مہینہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں برسنے والے پانی پر مختلف سورتیں اور دعائیں پڑھ کر پینے سے مختلف فوائد وخواص کا تذکرہ روایات میں ہوا ہے۔ یونہی امام جعفر صادق علیہ السّلام نے ماہ حزیراں کی ساتویں تاریخ کو پچھنے لگوانے سے منع کیا ہے۔ اور امام رضا علیہ السلام سے شمسی مہینوں کے لحاظ سے ہر مہینہ کے کچھ اُصولِ صحت وارد ہوئے ہیں۔

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ اللَّیْلِ۔ یعنی دن اور رات کے اختلاف میں بھی وجود وحکمت اور قدرت وصنعتِ پروردگار کی ایسی نشانیاں موجود ہیں جو اُس کی توحید کی بولتی زبان ہیں۔ مثلاً ان میں روشنی وتاریکی کا فرق، محنت وآرام کا فرق اور گرمی وٹھنڈک کا فرق اور ممکن ہے کہ اس اختلاف سے مراد ان کی کمی وبیشی ہو کہ کبھی دن بڑا اور رات چھوٹی اور کبھی اس کا اُلٹ اور سال میں صرف دو دفعہ برابری اور اس کی تفصیل تفسیر ہذا کی تیسری جلد صفحہ ۲۱۳ پر ملاحظہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا
تحقیق جو لوگ نہیں اُمید کرتے ہماری ملاقات کی اور راضی ہیں زندگانی دنیا پر اور مطمئن ہیں اس سے
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ⑦ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا
اور جو لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے بوجہ اس کے جو کسب
يَكْسِبُوْنَ ⑧ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ
کرتے ہیں تحقیق جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کمائے بھیجے گا ان کو رب اپنا بوجہ ایمان کے (اپنی جگہ)
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ⑨ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا
کہ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں نعمتوں کے باغات ہیں ان کا تکیہ کلام ہوگا

اِنَّ الَّذِيْنَ ۔ یعنی دلائل وجود خدا و علائم و آیات توحید باری بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کو از سرِ نو تہدید فرماتا ہے جو اس قسم کی واضح و غیر مبہم آیات میں غور نہیں کرتے۔ اور یہ مالک حقیقی کا انتہائی لطف و کرم ہے کہ بار بار دعوتِ فکر دے کر غافل مخلوق کو اپنی جانب توجہ کی دعوت دیتا ہے۔ اب اس اتمام حجت کے بعد اگر کوئی عارضی دنیاوی منافع کو ترجیح دے کر خدائی فرمائشات کو نظر انداز کرے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

يَهْدِيْهِمْ ۔ اور تفسیر منہج الصادقین میں اس کا مقصد یہ مذکور ہے کہ خدا نورِ ایمان کی بدولت ان کو صراط سے گذارے گا۔ چنانچہ جبریل نے حضور کو یہ مژدہ سنایا کہ خدا بعد سلام کے فرماتا ہے تو میرے نور سے اور علی تیرے نور سے اور اُمّتِ علی کے نور سے گذرے گی۔ کیونکہ اُمّت کا نور علی سے ہے۔ اور علی کا نور تجھ سے ہے۔ اور تیرا نور میرے نور سے ہے۔ یہاں اُمّت سے مراد شیعان علی ہیں۔

دَعْوٰىهُمْ ۔ یعنی جنّت میں ان کا تکیہ کلام یہی ہوگا کہ ہر وقت زبان سے تسبیح پروردگار جاری رکھیں گے۔ اور اس سے وہ لذّت اندوز ہوں گے۔ چنانچہ مجمع البیان میں مروی ہے کہ جب کوئی پرندہ ان کے سروں سے گذر کرے گا تو اس کو دیکھ کر وہ یہی تسبیح کا کلمہ پڑھیں گے۔ پس وہ بھُونے ہوئے گوشت کی صورت میں ان کے سامنے فوراً آموجود ہوگا۔ اور جب یہ لوگ جی بھر کر کھا چکیں گے تو وہ دوبارہ باذنِ پروردگار زندہ ہو کر پرواز کر جائے گا۔ یعنی ان کی ابتداء کلام ۔ تسبیح خدا اور انتہائے کلام حمدِ خدا ہوگی۔

وَتَحِيَّتُهُمْ ۔ یعنی خدا کی جانب سے جو ان کو تحیہ پہنچے گا وہ سلام ہوگا یا یہ کہ فرشتوں کا تحیّہ ان کے لئے سلام ہوگا یا یہ کہ ان کا آپس میں یہ تحیہ ہوگا کہ ایک دوسرے کو سلام کہیں گے اور ان کا اختتام کلام حمد خدا ہوگی۔ واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ

تسبیح خدا۔ اور ان کا تحیہ ہوگا سلام اور آخری تکیہ کلام ان کا حمد پروردگار ہوگی جو عالمین

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ

کا رب ہے اور اگر جلدی کرتا اللہ لوگوں کے لئے شر کی مثل عجلت خیر کے تو پوری کر دی جاتی ان

اَجَلُهُمْ ۗ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا

کی اجل پس ہم چھوڑتے ہیں انکو جو نہیں اُمید کرتے ہماری ملاقات کی کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران ہوتے ہیں اور جب

مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ

چھوئے انسان کو تکلیف تو ہمیں پکارتا ہے پہلو کے بل یا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر پس جب دُور کرتے ہیں ہم اسکی تکلیف

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

کو تو ایسا لگتا ہے کہ گویا کبھی اس نے ہمیں پکارا ہی نہ تھا کسی تکلیف کے لئے جو اسے پہنچی اسی طرح فریب کا باعث بنے غلط کاروں کے لئے اپنے اعمال

رکوع نمبر ۷۔ وَلَوْ يُعَجِّلُ۔ یعنی لوگ جب تنگ دلی سے یا غصہ اور جذبات کے اُبھار میں اپنے یا اپنے اقرباء کے لئے بددُعا کرتے ہیں۔ مثلاً اپنے لئے کہتے ہیں، میں مر جاؤں یا کسی دوسرے کے لئے کہتے ہیں کہ تم مر جاؤ۔ پس اگر خدا ان کی ایسی دُعائیں قبول کرنے میں جلدی کرتا جس طرح کہ خیر کی دعاؤں میں کرتا ہے تو وہ ختم ہو چکے ہوتے۔ اِسْتِعْجَالَهُمْ میں ضمیر جمع غائب ھم مصدر کا مفعول ہے اور مصدر کا فاعل اللہ ہے یعنی اِسْتِعْجَالَهٗ اِيَّاهُمْ یعنی خدا جلدبازی نہیں کرتا اور وہ جانتا ہے کہ جذبات اور غصہ کی رَو میں بہہ کر اپنی خاطر بددُعا کر رہے ہیں۔ جب یہ حالت دُور ہو گی تو وہ پشیمان ہوں گے۔ اور یہ بھی معنی ہو سکتا ہے کہ اگر لوگوں کے لئے خداوند کریم گرفت کی تعجیل کرتا جیسا کہ ان کے گناہوں کا تقاضا ہوتا ہے جس طرح کہ وہ دنیا میں اچھائی اور اپنے نفسوں کی بہتری کے لئے تعجیل کرتے ہیں تو معاملہ کبھی کا صاف ہو جاتا اور یہ لوگ ختم کر دئے جاتے لیکن وہ تو ڈھیل دے دیتا ہے تاکہ ان کو توبہ کا کھلا وقت مل سکے۔

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ۔ یہاں مَرَّ اِسْتَمَرَّ کے معنی میں ہے یعنی تکلیف کے وقت تو اس کو خدا یاد آتا ہے لیکن جب وہ اس کی سختی کو ختم کر دے تو وہ شکریہ ادا کرنے کی بجائے حسب سابق اکڑ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کبھی ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ اور ایسا ہی کفار اپنے کرتوتوں میں مست نظر آتے ہیں اور اُن کی نظروں میں ان کی بداعمالیاں بھلی لگتی ہیں خداوند کریم نے آیت مجیدہ میں سختی اور نرمی کی حالتوں کی تبدیلی کو اپنی معرفت و عبادت کا داعی ظاہر کیا ہے کاش کہ انسان درسِ عبرت

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

اور ہم نے ہلاک کیا قوموں کو تم سے پہلے جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس رسول آئے واضح دلیلوں کے ساتھ

وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ

اور نہیں امید تھی کہ وہ ایمان لائیں ایسی ہی جزا دیتے ہیں ہم مجرم لوگوں کو پھر ہم نے تم کو کیا

خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰى

قائم مقام زمین میں ان کے بعد تاکہ دیکھیں کہ کس طرح عمل کرتے ہو اور ان پر پڑھی

عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ

گئیں ہماری آیات واضح تو کہنے لگے وہ جو نہیں امید کرتے ہماری ملاقات کی لاؤ قرآن اس کے علاوہ یا اسے

اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا

تبدیل کرو کہہ دو نہیں جائز مجھے کہ اس کو تبدیل کروں اپنی جانب سے میں تو نہیں پیروی کرتا مگر اسکی

يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

جو وحی ہو میری طرف تحقیق میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب سے بڑے دن کے عذاب سے

حاصل کرے۔

لِيُؤْمِنُوْا - یعنی اُن کو مہلت دی گئی اور جب اُن کے ایمان لانے کی اُمید منقطع ہوگئی تو ان کو عذاب دیا گیا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ - یعنی تمہارے لئے ان سالقہ اقوام کے اعمال کے نتائج باعثِ نصیحت ہیں اور تم انہیں کے جانشین ہو اور خدا اپنے عدل و انصاف کے ماتحت اتمامِ حجت کے بغیر کسی کو سزا و عقاب نہیں کرتا۔ پس تم بھی اگر اسی سالقہ لوگوں کے طریق کار پہ گامزن ہوئے تو مستحق عذاب بنو گے۔ ورنہ اگر سنبھل جاؤ اور راہِ راست کو اپنالو۔ تو خدا کی رحمت اس کے غضب سے وسیع تر ہے وہ تمہیں اپنے اکرام و انعام سے نوازے گا۔

وَاِذَا تُتْلٰى - تفسیر مجمع البیان میں اس کے شان نزول کے متعلق ہے کہ عبداللہ بن اُمیہ مخزومی دیگر چار مشرکین قریش کے ہمراہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ آپ کوئی ایسا قرآن لے آئیں۔ جس میں ہمارے خداؤں کے خلاف کوئی بات نہ پائی جائے یا یہ کہ اسی قرآن سے قابلِ اعتراض مواد نکال کر ایسی صورت میں اسے پیش کریں جو ہمارے مزاجوں کے موافق ہو۔ پس یہ آیت اتری۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ گویا انہوں نے میرے پیش ہونا ہی نہیں ہے۔ پس ان کو

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا

کہہ دو اگر چاہتا اللہ تو میں اس کی تم پر تلاوت نہ کرتا اور نہ بتاتا وہ تمہیں پس تحقیق میں ٹھہر رہا ہوں تم میں عمر کا ئی

مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا

اس سے پہلے بھی کیا تم سمجھتے نہیں ہو پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افترا کرے اوپر اللہ کے یا جھٹلائے اس

اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا

کی آیات کو تحقیق نہیں چھٹکارا پائیں گے مجرم لوگ اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کے سوا اس کی جو نہ

صاف جواب دیجئے کہ میں تمہارے پاس قرآن کے احکام پہنچانے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں تبدیلی کروں اور میں تو صرف وحی پروردگار کے ہی تابع ہوں۔ گویا مطلب یہ ہے کہ کتاب میں ترمیم کرنے کا کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا۔ حتیٰ کہ کتاب اللہ کے لانے والا بھی اس میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ پس یہ اعلان قرآن مجید کے کامل و مکمل ہونے کا صراحتی بیان ہے۔

قُلْ۔ گویا کفار قریش یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضورؐ اس میں ایر پھیر کرنے کا خود اختیار رکھتے ہیں تو اس خدشہ کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ اگر اللہ نہ چاہتا ہوتا تو مجھے از خود تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ نہ میرے اُوپر نازل کرتا۔ اور نہ میں تم تک پہنچاتا وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ وہ تمہیں نہ جتلاتا یعنی میرے اُوپر نازل کر کے تم تک پہنچانے کا حکم نہ دیتا۔ ورنہ تم دیکھتے نہیں ہو۔ اس سے قبل بھی تو میں تم میں رہا ہوں اور کبھی تمہیں یہ باتیں نہیں کہی تھیں۔ اب حکم ملا ہے تو کہتا ہوں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ۔ مزید وضاحت کے لئے ارشاد ہے کہ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ اللہ کے حکم کے بغیر اس کی طرف کوئی چیز منسوب کرنا اور اس پہ افترا باندھنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اور میری سیرت کا تم مطالعہ کر چکے ہو۔ اور میں تم میں سے ایک ہی فرد ہوں۔ سچائی۔ امانت۔ دیانت میں تمہیں میری پوزیشن کا صاف پتہ ہے۔ جب میں عام جھوٹ بولنے سے گریز کرتا ہوں تو اپنے خالق کی طرف جھوٹی نسبت کیسے دے سکتا ہوں؟ اسی طرح جب تم مجھے امین جانتے ہو۔ اور میں کسی آپ جیسے انسان کی امانت میں خیانت نہیں کرتا تو خدا کے دین اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ پس اس کے بعد یقین جانو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ خدا کی جانب سے ہے۔ تو جس طرح میرا اس کے متعلق جھوٹ کہنا ناجائز ہے تمہارا یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد اس کی واضح نشانیوں کو جھٹلانا اور اس کی اور اس کے رسول کی تکذیب کرنا بھی ظلم عظیم ہے۔ پس اس سے باز آ جاؤ۔

يَعْبُدُوْنَ۔ اپنی جانب سے ان کو مطمئن کرنے کے بعد ان کو اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی عبادت کی خامیوں سے آگاہ فرماتا ہے کہ تم ایسوں کی عبادت کرتے ہو جو نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ نہ ان کے پاس قدرت ہے نہ اختیار۔

يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ

ان کو نقصان دے اور نہ نفع دے اور کہتے ہیں یہ لوگ ہمارے شفیع ہوں گے اللہ کے پاس کہہ دو کیا بتاتے ہو

اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا

اللہ کو ایسی باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا آسمانوں اور زمین میں وہ پاک ہے اور بلند تر ہے اس سے جس

يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا

کا وہ شرک کرتے ہیں اور نہیں تھے لوگ مگر ایک اُمّت پس انہوں نے اختلاف کیا اور اگر

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾

نہ ہوتا کلمہ سابق تیرے رب سے تو فیصلہ کیا جاتا ان میں اس کا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں

پس اس کی عبادت کرو۔ جو سب کا خالق اور رازق اور قادر و مختار ہے۔ اور نفع و نقصان کا مالک بھی ہے۔

هٰؤُلَاءِ۔ آپ کی پُر از حکمت مدلل و مبرہن تقریر سُننے کے بعد اُنہیں یقین ہو جاتا تھا کہ آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن اپنے باپ دادا کے مذہب کی لاج رکھنے کے لئے یہ بہانا پیش کرتے تھے کہ ہم ان کی عبادت مقصود بنا کر نہیں کرتے بلکہ عبادت تو اللہ کی کرتے ہیں اور ان کو اس کی بارگاہ میں اپنا شفیع سمجھتے ہیں تو خداوند کریم ان کے اس جواب میں فرماتا ہے کہ یہ لوگ اس قدر فریب خوردہ ہیں کہ اللہ کے سامنے بھی چالاکی کرتے ہیں۔ کیا وہ اللہ کو ایسی بات بتا رہے ہیں جس کو وہ نہیں جانتا؟ استفہام انکاری ہے۔ یعنی اس قسم کی دروغگوئی اور حیلہ سازی تو اُس کے سامنے کرتے جو حقیقت کو نہ جانتا ہو۔ لیکن وہ خدا جو سب کو جانتا ہے اُس کے سامنے اس قسم کی مکاریوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے ؟

اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اس میں کئی اقوال ہیں۔

۱۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت نوحؑ تک ایک دین حق (اسلام) پر تھے پھر اختلاف پڑ گیا۔ ۲۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ایک ملّت پر تھے۔ بعد میں بُت پرستی کی وجہ سے اختلاف پڑ گیا۔ (۳) ایک ہی فطرت پر خلق کئے گئے لیکن جذبات و خواہشات میں آکر الگ الگ ادیان و مذاہب بنا لئے۔ ان کے علاوہ دیگر اقوال بھی ہیں۔ اور ہم نے اس کے متعلق پوری وضاحت تفسیر کی تیسری جلد میں صد ۲۵ سے صد ۳۲ تک کر دی ہے۔

يَقُولُونَ۔ کفار کا یہ اعتراض بھی تھا کہ اگر یہ خدا کے سچے رسول ہوتے تو خدا کی جانب سے ایک خاص علامت ان کے ساتھ ہوتی کہ جو انکار کرتا اُس کو فوراً سزا ملتی تاکہ ڈر کے مارے سب کے سب اُس کے سامنے جھک جاتے تو اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ دین اسلام جبری دین نہیں ہے بلکہ اختیاری دین ہے اور اس کی مصالح کو وہ خود ہی بہتر جانتا ہے کہ اس

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا

اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتاری گئی اس پر کوئی نشانی اپنے رب سے پس کہہ دو کہ بس غیب اللہ کے لئے ہے پھر تم انتظار کرو

إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّن بَعْدِ ضَرَّاءَ

اور تحقیق میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنیوالوں میں سے ہوں اور جب ہم چکھائیں لوگوں کو رحمت کا مزا بعد دکھ کے جو

مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِي آيَاتِنَا قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ

انہیں پہنچے تو وہ مکر کرنے لگیں ہماری آیات میں کہہ دو کہ اللہ جلد ہی گرفت کرے گا اس مکر کی تحقیق ہمارے فرشتے لکھ

مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي

کر لیتے ہیں جو وہ مکر کرتے ہیں وہ جس نے تمہیں چلایا خشکی و تری میں حتیٰ کہ جب تم ہو کشتی

الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ

میں اور چلائیں ہم پاکیزہ ہوا اور وہ خوش ہو جائیں تو اچانک آجائے آندھی

وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا

اور آئے موج ہر طرف سے اور ان کو گمان ہو جائے کہ ابھی ہلاک ہوئے تو پکارا اللہ

اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٢٢﴾

کو خلوص اعتقاد سے کہ اگر تو ہمیں نجات دے دے اس سے تو ہم تیرے شکر گذار ہوں گے

فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ

تو جب اس نے نجات دیدی پھر وہ سرکشی کرنے لگے زمین میں ناجائز اے لوگو تمہاری سرکشی کا وبال تمہارے

نے ایسا کیوں کیا ہے۔

رکوع نمبر ۸ ۔ وَإِذَا ۔ خداوند کریم آیت کریمہ میں بے شکرے اور بالخصوص کفار کی بدباطنی کی خبر دے رہا ہے کہ جب تکلیف کے بعد ہم اُن سے درگذر کرتے ہوئے اُنہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھائیں۔ اور مصیبت سے ان کو نجات دیدیں تو بجائے شکر کے ہماری آیات کی تردید میں لگ جاتے ہیں۔ گویا وہ حوادث زمانہ کو خدا کے اختیار کے تابع نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں تو ایک فطرت مادہ کا دائمی دستور ہے۔ کبھی دکھ اور کبھی سکھ۔ چنانچہ مثال کے طور پر انسان اگر کشتی میں بیٹھا

عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

نفسوں پر ہوگا (چند روزہ) زندگانی دنیا کا (لطف اٹھالو) پھر تمہاری بازگشت ہماری طرف ہوگی تو ہم بتائیں گے کہ تم کیا عمل

تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ

کرتے تھے بجز اس کے نہیں کہ زندگانی دنیا کی مثال اس پانی جیسی ہے جو اتارا ہم نے آسمان سے پس مل گئی

بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ

اس کے ساتھ انگوری زمین کی اُس سے جو آدمی کھاتے ہیں اور حیوان یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی نمائش بنا

زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا

لی اور بارونق ہوگئی اور سمجھے مالک اس کے کہ ہم اس سے پُورا نفع اٹھائیں گے تو پہنچا ہمارا حکم رات کو

اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

یا دن کو پس کر دیا ہم نے اس کو خاکستر گویا یہاں کل کچھ تھا ہی نہیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ہم (اپنی

لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى

نشانیاں فکر کرنیوالے لوگوں کے لئے اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور ہدایت کرتا ہے جسے چاہے سیدھے

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ

راستہ کی ان کے لئے جو نیکی کریں بدلہ اور زیادتی بھی ہے اور نہ پہنچے گی

ہو۔ اور دھیمی دھیمی ہوا چل رہی ہو۔ اور خوشی خوشی میں اچانک تیز ہوا کا جھونکا آجائے موج پر موج اور لہر پہ لہر اٹھنے لگے جس سے کشتی کے اُلٹنے کا خطرہ اور پانی میں ڈوب جانے کا ڈر اسے تمام ظاہری اسباب و ذرائع سے مایوس کردے تو فوراً اس کے دماغ میں جو ذات سماتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی ذات ہے پس فوراً اس کی طرف نہایت خلوص سے گڑگڑا کر اپنی نجات کی درخواست کرتے ہوئے شکر کا عہد کرتا ہے لیکن نجات پانے کے بعد وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور ازراہِ سرکشی احسانِ خداوندی کو جھٹلاتا ہے۔ اور اپنی نجات کو کسی اور سبب کا مرہونِ منت قرار دے دیتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

مِنَ السَّمَآءِ۔ اس آیت میں نصیحت کے لئے خداوند کریم نے اپنی قدرت اور دنیا کے فنا و تغیر کی ایک مثال دی ہے جس طرح بارش کے بعد زمین کی سرسبزی سے مالکانِ زمین توقعات

وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

ان کے چہروں کو سیاہی اور خواری وہی جنت والے ہوں گے کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ

اور جن لوگوں نے کمائی برائیاں تو بدلہ برائی کا اس جیسا ہوگا اور پہنچے گی ان کو خواری نہیں ہوگا

مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ

ان کا اللہ سے کوئی بچانے والا ایسا معلوم ہوگا کہ ڈھانپے گئے ہیں ان کے چہرے رات کے سیاہ ٹکڑوں سے

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا

وہی دوزخ والے ہوں گے کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے

ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ

پھر کہیں گے ان کو جو مشرک ہیں رہو اپنی جگہ پر ساتھ اپنے شریکوں کے پھر ان کو آپس میں جدا کر کے پوچھیں گے تو

وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا

ان سے شریک بت کہیں گے کہ تم تو ہماری عبادت نہیں کرتے تھے پس کافی ہے اللہ گواہ ہم

وابستہ کرتے ہیں کہ اب اس سے خوب نفع اندوز ہوں گے لیکن خداوند کریم کسی آفت سماویہ یا ارضیہ کے ذریعہ سے اس کی تمام آبادی و سبزی کو خشک اور برباد کر دیتا ہے۔ پس پوری زندگانی دنیا کا یہی انجام ہے۔ پس اس دنیا میں رہ کر دار آخرت کے لئے ہی ذخیرہ بنانا چاہیئے۔ جہاں فنا نہ ہو۔ اور یہ تغیرات قریب نہ آئیں اور اسی کو دار السّلام سے تعبیر فرمایا۔ اور اسی کی طرف تمام انسانوں کو دعوتِ عامہ دی۔ اور یہ پیش کش بھی ساتھ ساتھ کر دی کہ نیکی کا بدلہ جزا سے زیادتی ملے گی خواہ دس گنا خواہ ہزار د لاکھ گنا اور خواہ بے حساب اور جنتیوں کے چہرے نورانی ہوں گے نہ ان پر کوئی میل ہوگی نہ غبار۔ خوش خوش کھلتے پھرتے ہوں گے۔ اور جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ جس کی آنکھ سے ایک قطرہ آنسو خوفِ خدا کی وجہ سے گرے گا۔ وہ شخص بروز محشر ذلت اور چہرہ کی سیاہی سے بچ جائے گا۔ اور اس کے برعکس بدکار کو اگرچہ سزا برائی کے برابر ملے گی۔ لیکن اس کا چہرہ سیاہ اور بدنما ہوگا۔ جیسے کہ رات کا ٹکڑا۔ اور اسی ظاہری حلیے سے تمام اہل محشر جان لیں گے کہ کون جنتی ہے۔ اور کون جہنمی ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ۔ جب تمام اہل محشر اکٹھے ہوں گے تو مشرکین کو اپنے شرکاء کے ہمراہ ایک جگہ کھڑا کیا جائے گا۔ اور

رَبَّيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ

اور تم میں کہ تحقیق ہم تمہاری عبادت سے بے خبر تھے وہاں جانچے گا ہر

نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

نفس جو اس نے بھیجا اور پلٹائے جائیں گے اللہ کی طرف جو ان کا مولائے حق ہے اور باطل ہوگا ان سے جو وہ

يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ

افترا کرتے تھے کہہ وہ کون تم کو رزق دیتا ہے آسمان و زمین سے یا کون مالک ہے کان

وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ

اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے

پھر ان کو الگ الگ کرکے سوال کیا جائے گا تو وہ وہی وقت ہوگا جب پیر و مرید ایک دوسرے سے تبرا کریں گے عبادت کرنے والے اور ان کے وہ بت جن کی وہ عبادت کرتے تھے ایک دوسرے سے بیزار نظر آئیں گے اور جب ان بتوں سے پوچھا جائے گا کہ کیا تمہاری پرستش کی گئی تھی تو وہ ان کو شرمسار اور لاجواب کرنے کے لئے کہیں گے کہ ہم نے تم کو اپنی عبادت کے لئے کب کہا تھا۔ تم نے تو اپنی اغراض کی خاطر اور اپنی خواہش نفس کی اطاعت کے لئے ہماری پرستش کی تھی۔ پس وہ ہماری نہیں بلکہ درحقیقت تم نے ازراہ سرکشی اپنے نفسوں کی اطاعت کی تھی اور بت وغیرہ اس وقت بقدرت خدا بول کر جواب دیں گے اور ان کو شرمسار کریں گے اور پھر آخر میں فیصلہ کے طور پر کہیں گے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا شاہد ہے کہ ہمیں تمہاری عبادت کا علم ہی نہیں تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ جواب زبان حال سے ہو کر جب ان کے پاس نہ قوت سامعہ تھی نہ باصرہ بلکہ وہ بے حس و حرکت پتھر یا درخت یا کچھ اور تھے تو بھرے میدان میں ان کی حالت کذائیہ خود بخود زبان حال ہوگی۔ اور جب دیکھیں گے کہ خدا کی عبادت کرنے والے اور توحید سے تمسک رکھنے والے نعیم جنت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ان کی حسرت میں اور اضافہ ہوگا کہ کاش ان بے حس و حرکت پتھروں یا قبروں کی بجائے خدائے واحد کی عبادت کی ہوتی۔ اسی لئے فرماتا ہے کہ اس وقت ہر شخص کو پتہ چلے گا کہ میں آخرت کے لئے کیا کچھ بھیج چکا تھا اور کیا کچھ بھیجنا چاہیئے تھا وہاں دنیا کی افترا پردازیاں اور حیلہ سازیاں کام نہ آئیں گی۔

رکوع نمبر ۹ توحید کا بیان

اس سے قبل وجود خدا پر دلائل قائم ہوئے اور پھر دعوت عبادت دی گئی۔ اس رکوع میں شرک سے روکنے کے لئے توحید کو ثابت کیا گیا ہے اور سب سوالیہ فقرے اس واسطے استعمال کئے ہیں تاکہ مطلب عام فہم ہو۔ اور اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے۔

وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ

اور کون تدبیر کرتا ہے امر کی تو کہتے ہیں کہ اللہ پس کہہ دو پھر کیا تم اُس سے ڈرتے نہیں ہو؟ پس یہ ہے اللہ تمہارا

رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ

سچا پروردگار پس نہیں بعد حق کے مگر گمراہی پھر کہاں جاتے ہو؟ اسی طرح

حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

سچی ہے بات تیرے رب کی ان لوگوں کے متعلق جو فاسق ہیں تحقیق وہ ایمان نہیں لاتے

(۱) تمہیں آسمان سے مینہ برسا کر اور زمین سے پیداوار اُگا کر رزق کون دیتا ہے؟

(۲) کان اور آنکھیں تمہیں کس نے دی ہیں اور ان کا مالک کون ہے؟ یہ سوال اگرچہ معمولی سا ہوتا ہے لیکن درحقیقت بہت بڑا سوال ہے۔ اور اس میں غور و فکر کے لئے بڑی راہیں کھلتی ہیں۔ اول تو تمام اعضائے بدن میں سے صرف کان اور آنکھوں کو مخصوص فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حیوانی زندگی اور کمال بشری کا دار و مدار انہی دونوں پہ ہے کہ آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر ہی انسان کسی میدان میں قدم رکھ سکتا ہے۔ گویا کسب علوم بلکہ تحصیل جملہ مطالب کا ذریعہ یہی دونوں ہیں۔ جب کوئی بات کرنے والا بات کرتا ہے تو حکمت خداوندی اور تدبیر ایزدی یہ ہے کہ آواز کی رسائی کی حدود تک کی جملہ ہوا ان الفاظ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ پس وہاں جس قدر بھی کان ہوں وہ الفاظ اپنے صحیح اندازے سے ان میں سپرد کردہ قوت سامعہ میں نقش ہو جائیں گے۔ پھر قوت سامعہ اس کو حس مشترک تک پہنچا کر اپنا فریضہ ادا کرے گی۔ پس ہوا اس پر مسخر ہے کہ ہر زبان میں ہونے والی بات کے سانچے میں فوراً ڈھلتی جائے۔ تاکہ قوت سامعہ اسے بعینہٖ جذب کرتی چلی جائے۔ اسی کے متعلق پوچھتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے ہوا میں یہ تدبیر اور نظام محکم پیدا کیا۔ اور قوت سامعہ کو آوازوں کی شناخت اور ان کو اپنے اصلی رنگ و وضع میں حاصل کرنے اور حس مشترک تک بھیجنے کی صلاحیت بخشی؟ اور اسی طرح آنکھوں کو تمام دیکھنے کے قابل اشیاء کا عکس لینے کے قابل کس نے بنایا کہ اس کے رنگ حجم مقدار اور باقی ظاہری صفات کو جذب کر کے حس مشترک تک پہنچائے؟ سمع کو واحد اور ابصار کو جمع کے صیغوں میں لانے کی وجہ یہ ہے کہ سماعت کا ادراک صرف ایک چیز سے تعلق رکھتا ہے یعنی آوازیں۔ لیکن بصر کا ادراک مختلف رنگوں۔ شکلوں۔ جسموں۔ حجموں اور مقداروں سے ہوا کرتا ہے۔ نیز سمع مصدر ہے اور اس قوت کو باسم مصدر ہی موسوم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں کسی خاص جانب کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ جہات ستہ میں جہاں سے آواز آئے کان اُسے بلا کلفت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن بخلاف اس کے آنکھ صرف ایک سمت یعنی سامنے کی چیز کا ہی ادراک کر سکتی ہے۔ اور بس۔ پس انہی مناسبات سے کان کے لئے سمع کا واحد صیغہ کافی ہے۔ اگرچہ مراد کثرت ہو۔ کیونکہ مصدر کا اطلاق واحد و کثیر پر یکساں ہوا کرتا ہے۔ اور بصر میں چونکہ یہ بات نہیں ہے لہٰذا اس کی تعمیم و استغراق کے لئے جمع کا صیغہ

لانا پڑتا ہے۔

(۳) مردہ سے زندہ جیسے نطفہ سے حیوان، زمین میں بیج ڈالنے سے سبز باغ اور زندہ سے مردہ جیسے ذی روح حیوان کہ روح کے جانے کے بعد وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دانا اور لائق سے نالائق اور نالائق سے لائق یا نیک سے بد اور بد سے نیک وعلیٰ ہذاالقیاس یہ سب کچھ کون کرتا ہے؟

(۴) تدبیر امر کون کرتا ہے؟ یعنی ارضی دستور، دریا، پہاڑ۔ زمینوں، وادیوں اور احجار و اشجار اور حیوان و نبات میں باہمی انس یا نفرت یا میل ملاپ اور انسانوں میں کلی نظام تمدن اور گٹھ جوڑ اور آسمانی نظام میں افلاک کی حرکت۔ سورج کی ضیا پاشی چاند کی تابانی اور سیارگان کی دستوری گردش۔ محاق۔ تربیع کسوف اور خسوف کے حالات اور ہر ایک کی محوری حرکات اور پھر آسمان و زمین کے درمیان فضائی حالات ہوا کی تیزی تندی گرمی و سردی موسموں کی تبدیلی خزاں و بہار کے جداگانہ اثرات، بادلوں کی صف آرائی، بارشوں کا سماں اور لاتعداد جزوی کرشمہ ہائے قدرت جو منظرِ عام پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اور پھر کبھی کسی کا اپنی سپرد کردہ ڈیوٹی میں سرِ مو فرق نہ کرنا۔ اور ہر ایک کا ایک خاص نظام کے ماتحت مطیع و مسخر ہونا اور ایسی پُر از حکمت صورت میں ہونا کہ کسی ذی ہوش کے لئے جائے دم زدن باقی نہ رہے۔ یہ سب کچھ کس کی حسن تدبیر کا نتیجہ ہے؟ تو بلا تامل کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔ پس فوراً ارشاد فرماتا ہے کہ جب تمہیں یہ اعتراف ہے اور تمہاری ضمیر یہ بات تسلیم کرتی ہے تو پھر نافرمانی کرنے میں اس سے ڈرتے کیوں نہیں؟ پس جو ذات یہ سب کچھ کرتی ہے وہی تمہارا سچا پروردگار ہے اور اس اعتقاد کے علاوہ دوسرا اعتقاد رکھنا صاف گمراہی ہے۔ اور جس طرح یہ اعتقاد حق اور صحیح ہے۔ اسی طرح ان دلائل کو ٹھکرا کر اس کی حدود اطاعت سے خارج ہونے والوں کے لئے خدا کا کلمۂ عذاب بھی حق اور صحیح ہے۔

توضیح جس شخص کے پاس عقل سلیم اور فہم مستقیم ہے وہ اپنے خالق علیم و حکیم کا انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ بعض سر پھرے لوگ صرف اپنی خواہشاتِ نفسیہ سے مغلوب ہو کر اس عقل کے بدیہی فیصلہ سے باغی ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ عالم خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ صرف دین سے بغاوت کی خاطر ہی انہوں نے اقدام کیا ہے۔ کیونکہ دین کسی کو شرافت و تہذیب کے دائرہ سے نکل کر آوارہ زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دیتا تو دنیا کے بندوں نے جب اپنے جذبات کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب دین کو دیکھا اور سمجھا کہ عیش کوشی، شہوت رانی اور نفس پرستی کے آزادانہ مشغلہ کے رستہ میں صرف دین کا تصور ہی سنگ گراں ہے تو وہ اس تصور کے دشمن بن گئے اور چونکہ اس کی بنیاد وجود خدا کے ثبوت پر تھی تو انہوں نے اس کے انکار کے لئے بہانے تلاش کرنے شروع کئے۔ کسی وقت مادہ کو قدیم کہا اور کسی وقت طبیعت کو خالق قرار دیا اور کبھی اتفاق کی پیداوار تمام کائنات کو ظاہر کیا۔ بہرکیف دشمنانِ خدا عقل سلیم کو قید نہیں کر سکتے اور نظامِ عالم کا اس پُر از حکمت صورت میں ظہور پذیر ہونا اور باقی و برقرار رہنا اپنے صانع حکیم کے وجود بلکہ اس کی توحید کی بولتی ہوئی زبان ہے جس سے ہر سلیم العقل اور صحیح الفطرت انسان بہرہ ور ہو کر اس کی یکتائی و بے ہمتائی کا قائل ہوتا ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ

کہہ دو کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو ایجاد کرے مخلوق کی پھر پلٹا بھی سکے کہہ دو کہ وہ اللہ ہی ہے جو ایجاد

الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٣٤﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي

کرتا ہے مخلوق کی پھر پلٹاتا بھی ہے پس تم کدھر جاتے ہو کہہ دو کیا ہے تمہارے شرکاء میں سے جو ہدایت کرے حق

إِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ

کی طرف تو کہہ دو کہ اللہ ہی ہدایت کرتا ہے حق کی تو جو ہدایت حق کی کرے زیادہ سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی

يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ ۖ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٥﴾

جائے یا وہ جو نہیں ہدایت کرتا بلکہ ہدایت کیا جاتا ہے تم کو کیا ہو گیا ہے کیسی باتیں کرتے ہو؟

وجودِ باری تسلیم کرنے کے بعد مشرکین میں متعدد خیالات پائے جاتے تھے اور اب بھی ہیں۔ کسی نے خیر و شر کے لئے نور و ظلمت کو الگ الگ خالق مانا۔ کسی نے عبادت میں اس کا شریک قرار دے دیا۔ پھر کسی نے فرشتوں کو کسی نے نبیوں کو کسی نے پیر و مرشد کو کسی نے چاند سورج اور ستاروں کو معبود بنایا۔ کسی نے درخت پانی یا پتھر کے بت تراش کر ان کے سامنے سجدہ کیا۔ کسی نے کچھ کیا اور کسی نے کچھ۔ بہرکیف ہر ایک نے من مانے جتن کیے۔ خداوند کریم آیت مندرجہ بالا میں ان مختلف اشیاء کی عبادت کرنے والوں سے بلا استثناء سوال فرماتا ہے کہ رزق کون دیتا ہے؟ آنکھ اور کان یعنی جملہ اعضائے بدن کا خالق کون ہے؟ زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کو کون پیدا کرتا ہے؟ اور تمام کائنات میں تدبیر کون کرتا ہے؟ اور یہی چار سوالات ایسے ہیں۔ جن کے اندر باقی اس قسم کے فروعی عقائد سب آجاتے ہیں۔ پس اگر ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ وہ صرف اللہ ہے تو بس وہی لائق عبادت ہے۔

مشرکین سے جب سوال کیا جاتا تھا کہ اللہ کو تسلیم کر کے پھر ان بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہو تو وہ کہتے تھے۔ کہ یہ قربِ خدا کا وسیلہ ہیں تو آیت نمبر ۱۸ میں اس عقیدہ کی تردید گذر چکی ہے لہذا شیعوں پر یہ اعتراض کرنا کہ وہ محمدؐ و آل محمدؐ کو خالق و رازق یا مدبر الامور مانتے ہیں۔ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ شیعہ اور شیعہ کے آئمہ ایسے عقیدہ والوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ شیعہ کی کتب عقائد میں یہ مسئلہ مبرہن موجود ہے۔

قُلْ هَلْ۔ اُسی سابق دلیل توحید کا تتمہ ہے فرماتا ہے جن کو تم لوگ میرا شریک بناتے ہو۔ اُن میں سے کوئی ہے جو مخلوق کو پیدا کرے اور پھر ان کی موت کے بعد دوبارہ ان کو جلا سکے۔ اس کے بعد جواب میں خود فرماتا ہے کہ ایسا کوئی بھی نہیں ہے سوائے اللہ کے وہ ہی مارتا ہے اور مارنے کے بعد زندہ بھی کر سکتا ہے۔ لہذا بعض مقامات پر انبیاء کا بطورِ اعجاز کے

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ

اور نہیں پیروی کرتے ان کے اکثر مگر گمان کی حالانکہ تحقیق گمان نہیں کفایت کرتا حق سے کچھ تحقیق اللہ

عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ

جاننے والا ہے جو وہ کرتے ہیں اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ افترا باندھا گیا ہو اللہ پر غیر کی

دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ

جانب سے بلکہ اس میں تصدیق ہے اس کی جو اس سے پہلے تھیں اور تفصیلی بیان ہے اس میں شک نہیں کہ

یا آئمہ طاہرین کا معجزہ کے طور پر مردہ کو زندہ کرنا اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ درحقیقت معجزہ خدا کا فعل ہوا کرتا ہے۔ آئمہ طاہرین یا انبیاء معصومین صرف دعا کرتے ہیں۔ اور خدا قبول فرما کر مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں شرک نہیں لازم آتا۔ پھر بُت پرست طبقہ کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے شرکا یعنی جن کی تم عبادت کرتے ہو کیا وہ تمہیں حق کی طرف بلاتے ہیں تو ان کا جواب نہیں میں ہوگا کہ وہ بُت بے حس و حرکت کسی کو کیسے ہدایت کر سکتے ہیں۔ پس فرماتا ہے پھر ان کے سامنے جھکنے میں کونسی عقلمندی ہے بلکہ اطاعت اور پیروی کا سزاوار وہ ہے جو حق کا راستہ بتائے نہ وہ جس کو راستہ بتایا جائے۔

وَمَا يَتَّبِعُ۔ جب دلیل و برہان سے ثابت ہو گیا کہ اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور مشرکین کے پاس اپنے باطل مذہب کی کوئی علمی وجہ تو تھی نہیں کہ وہ بیان کرتے تو خدا اسی کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ اس کا علمی جواب نہیں دے سکتے۔ بس ظن و گمان ہی کی باتیں کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے تھے۔ پھر فرماتا ہے کہ اس قسم کی باتوں میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ اور یہ کہ ان کے اکثر ظن و گمان کے پیچھے جاتے ہیں۔ گویا ان میں بعض مسئلہ کو سمجھنے والے بھی تھے لیکن وہ صرف عناد اور تکبر کی وجہ سے راہِ حق پر آنا گوارا نہیں کرتے تھے۔

وَمَا كَانَ۔ مشرکوں نے اعتراض کیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ ان کا اپنا بنایا ہوا ہے اور انہوں نے اس کے مضامین کے فسخ کی یا تبدیلی کی خواہش ظاہر کی تھی تو خدا ان کے مزعوم کی تردید فرماتا ہے کہ یہ ایسا کلام ہے کہ افترا ہو ہی نہیں سکتا بلکہ یہ تو کتب سابقہ کی تصدیق ہے یا یہ کہ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد آئندہ واقعات ہوں کہ قیامت کے حالات کی تصدیق ہے۔

تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ۔ یعنی مسائل ضروریہ حلال و حرام کی تفصیل ہے۔ یا یہ کہ عقائدِ حقہ کی مفصل دلیلیں اس میں موجود ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ۔ فرماتا ہے اگر خواہ مخواہ اصرار کریں کہ یہ خدا کا کلام نہیں تو ان کو کہو پھر تم کم از کم اس جیسا ایک سورہ تو بنا کر پیش کر دیں تمہارا اس کے مقابلہ سے عاجز ہونا اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل ہے اور تنہا نہیں بلکہ تمام دنیا کے فصحاء و بلغاء کی مدد حاصل کرنے کی بھی تمہیں اجازت ہے۔

مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ

جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے افترا کیا ہے تو کہہ دو لاؤ تو اس جیسا ایک سورہ

وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٨﴾ بَلْ

اور بلا لو جتنے بلا سکتے ہو سوائے اللہ کے اگر سچے ہو بلکہ

كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ

انہوں نے جھٹلایا اس کو جس کے علم کا احاطہ نہ کرسکے اور نہ آئی اُن کے پاس اس کی تاویل ایسا ہی جھٹلایا انہوں نے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُمْ

جو پہلے تھے پس دیکھو کیا انجام ہے ظالموں کا بعض ان میں

مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤٠﴾

سے اس پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض ایمان نہیں رکھتے اس پر اور تیرا رب جانتا ہے فسادیوں کو

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــــُٔوْنَ مِمَّآ

اور اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ دو کہ میرے لئے اپنا عمل اور تمہارے لئے اپنا عمل ہے تم اس سے بیزار ہو جو میں

اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ

کرتا ہوں اور میں اس سے بیزار ہوں جو تم کرتے ہو اور بعض ان میں سے کان دھرتے ہیں تیری طرف کیا تو

بَلْ كَذَّبُوْا ۔ فرماتا ہے ان کی تکذیب کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مطالب کا وہ صحیح احاطہ علمی نہیں رکھتے اور بفرمان علیؑ انسان جس کا جاہل ہو اُس کا دشمن ہوتا ہے الناس اعداء ما جھلوا۔ اس لئے معصوم سے وارد ہے کہ جس کا تمہیں علم نہ ہو اس کی تردید نہ کرو اور جو بات تم نہ جانتے ہو وہ بیان نہ کرو۔ جیسا کہ مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے

رکوع نمبر ۱

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ ۔ جب دلائل توحید اور دعوت عبادت اور بت پرستی سے ممانعت کا بیان پورا ہوا تو چونکہ جھٹلانے والوں کی زبان تو بند نہیں ہوتی تھی۔ پس خدا ارشاد فرماتا ہے کہ ایسے بیہودہ لوگوں سے دماغ سوزی کی کوئی ضرورت نہیں۔ پس ان کو کہہ دیجئے کہ تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔ اور میں اس سے بری ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔

وَمِنْهُمْ ۔ یعنی ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بنظر غائر آپ کی طرف توجہ سے دیکھتے ہیں لیکن طلب ہدایت کے لئے

تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ

سنائے گا بہرے کو؟ اگر وہ عقل نہ رکھتے ہوں ؟ اور بعض ان میں سے دیکھتے ہیں تیری طرف تو تو کیا

تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا

ہدایت کرے گا اندھوں کو اگر وہ نہ دیکھ سکتے ہوں ؟ تحقیق اللہ نہیں ظلم کرتا لوگوں پر کچھ

وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا

لیکن لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور جس دن ہم اُن کو اکٹھا کریں گے ایسا لگے گا کہ نہیں رہے

إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ

دنیا میں، مگر ایک گھڑی دن کی پہچانیں گے آپس کو تحقیق نقصان پایا جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی ملاقات کو

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

اور نہیں تھے ہدایت پانے والے یا تو ہم تم کو دکھائیں گے بعض وہ جو ان سے وعدہ کرتے ہیں یا تجھے وفات دیدیں گے

نہیں بلکہ ازراہِ سرکشی تو چونکہ وہ عبرت و نصیحت کے لئے نہیں دیکھتے تھے لہٰذا باوجود دیکھنے کے ان کو اندھا کہا ہے اور فرمایا ان عقل کے اندھوں کو تم کیا نصیحت کرو گے ؟

اِنَّ اللّٰہَ ۔ یعنی جب تک لوگوں پر اتمامِ حجت نہ ہو جائے خدا عذاب نہیں کرتا تو حجت پوری ہو جانے کے بعد اگر کوئی ازراہِ عناد و تکبّر راہِ حق کو قبول نہ کرے تو گویا اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور خود ہی جہنم کی بھٹی میں کود گیا۔ لہٰذا خدا نے اس پر ظلم نہیں کیا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ ۔ یہ ظرف یا تو يَتَعَارَفُونَ سے متعلّق ہے اور یا كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا کے معنی سے متعلّق ہے یعنی ان لوگوں کے احوال متشابہ ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے احوال سے جو دنیا میں صرف ایک گھنٹہ رہے ہوں۔ ای تشابہ احوالھم يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ ۔ گویا بروزِ حشر ایسا لگے گا کہ ہمیں دنیا میں صرف ایک گھنٹہ ہی رہنا نصیب ہوا تھا اور يَتَعَارَفُونَ کا معنی یہ ہے کہ بروزِ حشر لوگ ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہوں گے۔

وَإِمَّا ۔ یعنی کفار و منافقین کے متعلّق جو عذاب کا وعدہ ہم کر چکے ہیں یا تو تمہاری عینِ حیات میں ہوگا اور یا یہ کہ آپ وفات پا جائیں گے اور وہ بعد میں ہوگا۔ بہرکیف وہ عذاب سے نجات نہیں پا سکتے۔ آخر ان کی ہماری جانب ہی تو بازگشت ہے اور ہمیں پتہ ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ ۔ یعنی ہر اُمّت کے لئے اتمامِ حجت اور دعوتِ حق کے لئے رسول آیا کرتا ہے پس خدا کسی اُمّت کو

فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ

تو ہماری طرف ان کا رجوع ہوگا پھر اللہ گواہ ہے وہ جو عمل کرتے ہیں اور ہر گروہ کے لئے رسول

فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ

آتا ہے پس جب آئے رسول ان کے پاس (اور اتمام حجت ہو جائے) تو فیصلہ ہوتا ہے ان کے درمیان عدل کا اور وہ نہیں ظلم کئے جاتے

يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ

اور کہتے ہیں کب ہوگا وعدہ اگر تم سچے ہو کہہ دو میں نہیں مالک اپنے نفس کا

لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ

ضرر اور نفع ہیں مگر وہ جو چاہے خدا ہر اُمت کے لئے ایک مدت ہے جب ان کی مدت

اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ

آجائے تو نہ موخر ہو سکتے ہیں ایک گھنٹہ اور نہ مقدم ہو سکتے ہیں کہدو کہ کیا تمہیں خبر ہے

بغیر دعوتِ حق کے نہیں چھوڑتا۔ اور یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ہر زمانہ میں حجتِ خدا کا وجود ضروری ہے اور مذہب شیعہ کا یہی عقیدہ ہے۔ اور اتمامِ حجت کے بغیر کسی سے باز پرس یا عذاب خلافِ عدل ہے۔

فَاِذَا جَآءَ۔ پس جب رسول آجائے اور حق و باطل سمجھا کر ان کو حق کی دعوت دے پھر وہ لوگ ازراہِ عناد و سرکشی اس کی دعوت کو ٹھکرا دیں تو وہ مستحقِ عذاب ہوں گے۔ ورنہ اتمامِ حجت کے بغیر ان کو گرفت کرنا ظلم ہے اور خدا ظلم نہیں کرتا۔

وَيَقُوْلُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ (کفار) عذاب کے وقت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کب ہوگا تو ان کے جواب میں کہہ دو کہ میں تو اپنے نفس کے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں مگر اتنا کہ خدا چاہے اور یہ کہ ہر اُمت کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب ان کا وقت آجاتا ہے تو ایک لمحہ نہ اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ لہٰذا میرے پاس تمہارے عذاب یا موت کی تاریخ معین موجود نہیں ہے۔ اور جناب رسالت مآبؐ سے خدا کا کہلوانا کہ میں تو اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں جُہلاء کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ وہ بھی خدا کو ہی اپنے نفع و نقصان کا مالک جانیں۔ اور نفع حاصل کرنے یا تکلیف کے دور کرنے کی دعا محمدؐ و آل محمدؐ کے وسیلہ سے خدا سے ہی مانگیں اور یہ اعتقاد رکھیں کہ کسی کو تکلیف اللہ کی جانب سے پہنچتی ہے اور تکلیف کو دُور کرنے اور نفع پہنچانے پر بھی وہی قادر ہے۔

قُلْ۔ یعنی ان سے کہہ دو کہ عذاب تو اپنے وقت پر ہی آئے گا۔ خواہ دن ہو گا یا رات۔ لیکن تم کیسے عذاب کی جلدی

اِنۡ اَتٰىكُمۡ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوۡ نَهَارًا مَّاذَا يَسۡتَعۡجِلُ مِنۡهُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾

اگر آئے تم پر اس کا عذاب رات کو یا دن کو تو کونسے عذاب کی جلدی چاہتے ہیں مجرم لوگ ؟

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ ؕ آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾

کیا جب واقع ہوگا تو ایمان لائیں گے اس پر اب ؟ (ایمان لاتے ہو) حالانکہ تم اس کی جلدی چاہتے تھے

ثُمَّ قِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡخُلۡدِ ۚ هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا بِمَا

پھر کہا جائے گا ظالموں کو کہ چکھو دائمی عذاب تمہیں نہیں جزا دی جاتی مگر وہ جو

كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسۡتَنۡۢبِـُٔوۡنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلۡ اِىۡ وَرَبِّىۡۤ اِنَّهٗ

کماتے تھے اور تجھ سے خبر چاہتے ہیں کہ کیا سچ ہے وہ ؟ کہہ دو ہاں خدا کی قسم تحقیق وہ

لَحَقٌّ ؕ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوۡ اَنَّ لِكُلِّ نَفۡسٍ ظَلَمَتۡ مَا فِى

سچ ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے اور اگر ہر وہ نفس جو ظالم ہے زمین کی تمام چیزوں کا مالک

الۡاَرۡضِ لَافۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ وَ

ہو تو اس (عذاب) کے فدیہ میں دیدے اور چھپائیں گے ندامت کو جب دیکھیں گے عذاب اور

قُضِىَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى

فیصلہ ہوگا ان میں عدل کا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا تحقیق اللہ کے لئے ہے جو کچھ

چاہتے ہو کیونکہ عذاب تو ایسی شئی نہیں کہ اس کی خواہش کی جائے۔ ہاں جب وہ واقع ہوگا تو تمہیں مجبوراً ماننا پڑے گا۔ اور خدا کی طرف جھکنا پڑے گا۔ لیکن اس وقت کا ایمان اور جھکنا کس کام کا ؟

اَحَقٌّ هِىَ ۔ تفسیر جامع میں بروایت صادقین علیہما السلام منقول ہے کہ اہل مکہ نے پوچھا تھا کہ علی کی امامت حق ہے۔ تو اس کا جواب ہے اور حدیث مشہور و معروف بلکہ متواتر علی مع الحق والحق مع علی بھی اسی سے موافقت رکھتی ہے۔

رکوع نمبر ۱۱ ۔ قرآن روحانی و جسمانی امراض کا علاج ہے

وَلَوۡ اَنَّ ۔ یعنی قیامت کی ہولناکی اور عذاب خدا کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ ظالم لوگ اگر پوری زمین اور اس کے اندر کی تمام موجودات کی ملکیت رکھتے تو اپنے پیش آنے والے عذاب کا فدیہ دینے میں تامل نہ کرتے۔

اَسَرُّوا النَّدَامَةَ ۔ وہ پیرلوگ اور لیڈر و قائد طبقہ جنہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا تھا بروز محشر جب عذاب خداوندی کا معائنہ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا

آسمانوں اور زمین میں ہے تحقیق اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں

يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ

جانتے وہی جلاتا اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پلٹو گے اے لوگو

قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَ

تحقیق آئی تمہارے پاس نصیحت اپنے رب سے اور شفا اس کی جو سینوں میں ہے اور

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ

ہدایت اور رحمت مومنوں کے لئے کہدو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پس اس کے ساتھ

کریں گے تو شرمسار ہوں گے۔ اور اپنے مریدوں اور مقتدیوں سے اس شرمساری کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن وہاں کیسے چھپ سکیں گے بلکہ وہاں تو صرف رسوائی ہی رسوائی ہوگی۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ۔ آیت مجیدہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ قرآن مجید روحانی اور جسمانی دونوں بیماریوں کا علاج ہے لہذا تمام نوع انسان کو اس آیت میں دعوت عام دی گئی ہے کہ اگر تم روحانی امراض کی شفا چاہتے ہو تو قرآن مجید تمہارے پروردگار کی طرف سے موعظہ حسنہ اور نصیحت کی کتاب ہے اس پر عمل پیرا ہو کر ہر قسم کی شفایابی حاصل کر سکتے ہو۔ اور اگر تم جسمانی طور پر درد و الم کی شکایت رکھتے ہو تو قرآن سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اس کی آیات یا اس کے اجزا کی تلاوت بدنی تکالیف کو بھی رفع کر سکتی ہیں۔ چنانچہ تفسیر جامع میں بروایت عیاشی حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت پیغمبر اکرمؐ سے اپنے درد سینہ کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا اس کا علاج قرآن سے کرلو۔ اور آپ نے یہی آیت پڑھی۔ گویا سینہ کے درد کے دفع کرنے کے لئے یہ آیت پڑھی جائے تو درد رفع ہو جائے گا۔ تو چونکہ قرآن کو روحانی اور جسمانی امراض کا علاج قرار دیا ہے اس لئے اس کو ھدًی و رحمۃً سے تعبیر فرمایا کہ روحانی امراض کے علاج کے لحاظ سے یہ ھدًی (ہدایت ہے) اور جسمانی امراض کے علاج کے لئے رحمت ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ۔ اس کی تاویل میں متعدد اقوال ہیں مثلاً فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد جناب رسالتمآبؐ یا فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اسلام یا اس کا الٹ اور ایک روایت میں حضورؐ نے فرمایا کہ جس کو خدا اسلام عنایت کرے اور قرآن کا علم بھی دے پھر وہ فقر و فاقہ کی شکایت کرے تو روز محشر تک اس کی پیشانی پر خدا فقر و فاقہ لکھ دے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت امام محمد باقرؑ سے اس آیت کی تاویل یہ منقول ہے کہ فضل سے مراد جناب

فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

خوش رہو یہ اچھا ہے اُس سے جو جمع کرتے ہو کہہ دو کیا تم نے دیکھا ہے کہ جو اتارا اللہ نے

لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ

تمہارے لئے رزق پس بنا لیا تم نے اس سے کچھ حرام اور کچھ حلال کہہ دو کیا اللہ نے اجازت دی تمہیں

اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

یا خود اللہ پر بہتان باندھتے ہو اور کیا خیال ہے ان کا جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹا

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا

قیامت کے دن ؟ تحقیق اللہ تو صاحب فضل ہے لوگوں پر لیکن ان کے اکثر شکر

يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا

نہیں کرتے تم کہیں کسی حالت میں ہو اور کچھ بھی قرآن پڑھو

رسولِ خدا ہیں اور رحمت سے مُراد حضرت علی ابن ابی طالب ہیں (مجمع البیان)

فَبِذٰلِكَ - نحوی قواعد کے لحاظ سے بذالک بدل ہے بفضل اللہ سے یعنی اللہ کے فضل و رحمت کو ہی خوشی کا باعث سمجھنا چاہیئے نہ کہ مال و دولت کو اور یہ چیزیں تمہارے جمع کردہ مال سے بہتر ہیں اور بروایت تفسیر جامع کافی میں ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگوں کے لئے آلِ محمدؐ کی ولادنیاوی جمع کردہ مال سے خوب تر ہے۔ اور حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ رسالتمآبؐ کی نبوت کا اقرار اور علی و اولاد علی علیہ السلام کی ولایت کا اقرار دنیاوی مال خزانوں سے بہتر ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ - یہ اہل کتاب یہود کے لئے سرزنش ہے جنہوں نے حیوانوں میں اپنی خواہشات کی بنا پر کچھ حلال اور کچھ حرام بنا رکھے تھے کہ کوئی مردوں پر حلال اور عورتوں پر حرام اور کسی کا بعض حصہ حلال اور بعض حصہ حرام وغیرہ۔ اور یہ سب کچھ اپنی خواہشِ نفس سے تھا۔ انہی کے متعلق فرماتا ہے کہ حلال و حرام کی اس تقسیم کی تمہیں کس نے اجازت دی۔ کیا خدا کا کوئی حکم اس نوعیت کا تمہارے پاس پہنچا ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر اس قسم کے بہتان کیوں باندھتے ہو۔ اور اس کی تفصیل تفسیر کی پانچویں جلد سورہ مائدہ کی تفسیر میں مذکور ہو چکی ہے۔

رکوع نمبر ۱۲

وَمَا تَكُوْنُ - آیت مجیدہ میں خداوند کریم اپنے علم کلی کی وضاحت فرماتا ہے تاکہ مومنین جس مقام پر ہوں اور جس حالت میں ہوں وہ یہ سمجھیں کہ خدا ہمارے ساتھ ہے پس کسی وقت بھی خدا کے بھروسہ سے باہر نہ جائیں۔ اور تفسیر مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب جناب رسالتمآبؐ

تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيۡكُمۡ شُهُوۡدًا اِذۡ تُفِيۡضُوۡنَ فِيۡهِ ؕ وَمَا يَعۡزُبُ

اور جو بھی عمل کرو ہمیں اس کی پوری خبر ہے جب تم اس میں گھستے ہو اور نہیں غائب

عَنۡ رَّبِّكَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ

تیرے رب سے کوئی چیونٹی کی مقدار نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں اس سے کوئی چھوٹی چیز

ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكۡبَرَ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ

اور نہ بڑی مگر یہ کہ وہ لوح محفوظ میں موجود ہے تحقیق اللہ کے اولیاء پر نہ کوئی خوف ہوگا

عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ لَهُمُ

اور نہ وہ محزون ہوں گے جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے

الۡبُشۡرٰى فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ

خوشخبری ہے زندگانی دنیا میں اور آخرت میں بھی نہیں تبدیلی اللہ کے وعدہ میں

اس آیت مجیدہ کی تلاوت فرماتے تھے تو بہت گریہ کرتے تھے۔

اَوۡلِيَآءَ اللّٰهِ۔ مجمع البیان میں امام علی زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ وہ ہیں جو فرائض خداوندی کو ادا کریں۔ اور سنّتِ رسول پر عمل پیرا ہوں۔ خدا کی حرام کردہ اشیاء سے بچیں۔ دنیا میں زہد کریں اور آخرت میں رغبت کریں۔ اپنے گذارا کے لئے حلال رزق کمائیں نہ کہ فخر و تکبر کی خاطر اور پھر اس سے حقوق واجبہ ادا کریں۔ پس ان لوگوں کے کسب میں خدا برکت دے گا اور آخرت میں اس کی ان کو جزائے خیر دے گا۔

خداوند کریم نے اولیاء اللہ کی جامع تعریف یہ کی ہے کہ جو ایمان لائیں اور تقوائے اختیار کریں۔

لَهُمُ الۡبُشۡرٰى۔ تفسیر مجمع البیان اور جامع میں عقبہ بن خالد سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا اے عقبہ بروز قیامت خداوند کریم بندوں سے کوئی دین قبول نہیں کرے گا سوائے اس دین کے جو تمہارا شیعوں کا ہے اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک میں صرف یہی دیر ہے کہ جب روح کے نکلنے کا وقت ہوگا تو سرہانے حضرت پیغمبرؐ اور حضرت علی پہنچیں گے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ فرمائیں گے کہ میں تیرا رسول ہوں اور دنیا میں تیرے پیچھے چھوڑے ہوئے ترکہ سے میں بہتر ہوں پھر حضرت علیؑ فرمائیں گے۔ میں علی بن ابی طالب ہوں جس کی تو ولا و محبت رکھتا تھا۔ آج تجھے میری دوستی فائدہ دیگی پس آپ نے فرمایا جو کچھ میں نے کہا ہے قرآن مجید میں موجود ہے۔ عقبہ کے پوچھنے پر آپ نے یہی آیت تلاوت کہ اولیاء اللہ کو دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی جائے گی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ مومن جب قبر میں جائے گا تو اس کی قبر

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ

یہ ہی بڑی کامیابی ہے اور تجھے نہ غمزدہ کریں ان کی باتیں کیونکہ عزت اللہ کے پاس ہے

جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن

سب وہ سننے جاننے والا ہے تحقیق اللہ کے لئے ہے جو بھی آسمانوں اور زمین

فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ

میں ہے اور وہ جو اتباع کرتے ہیں ان کی جنہیں پکارتے ہیں اللہ کے سوا وہ نہیں اتباع کرتے

إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ

مگر گمان کی اور وہ صرف تخمیناً ہی ایسا کرتے ہیں وہ وہ ہے جس نے بنایا رات کو کہ تم اس میں

لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾

آرام کرو اور دن کو دیکھنے کے لئے تحقیق اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں

سے ایک دروازہ جنت کی طرف کھل جائے گا۔ (مجمع البیان)

وَفِی الاٰخرۃ۔ تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ قبروں سے نکلتے ہی فرشتے ان کو جنت کی بشارت دیں گے اور قیامت کے میدان میں بھی ان کو جنت کی بشارت دیں گے۔ یعنی وقتاً فوقتاً جنت میں داخل ہونے تک ان کو بشارتیں اور مبارکبادیوں کے پیغامات ملتے رہیں گے۔

وَلَا یَحْزُنْکَ۔ کفار و مشرک خواہ مخواہ اپنی بدباطنی اور حسد و بغض کے اظہار کے لئے حضورؐ کے متعلق زبان طعن کھولتے تھے کہ یہ شاعر ہے کبھی دیوانہ کہتے تھے کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ بہرکیف حضور کو تکلیف پہنچانے میں وہ کمی نہ کرتے تھے تو خداوند کریم اپنے حبیب کی ان لفظوں میں تسلی فرما رہا ہے کہ آپ مطمئن رہیں آپ کا وہ بگاڑ کچھ بھی نہیں سکتے کیونکہ عزت اور غلبہ میرے ہاتھ میں ہے میں ان کی مکاریوں کا خود ہی علاج کروں گا۔

مَا یَتَّبِعُ۔ اگر اس ما کو نافیہ بنایا جائے تو بعد میں اِنْ یَّتَّبِعُوْن اس سے بدل ہوگا۔ یعنی یہ لوگ ماسوا اللہ کی اطاعت صرف ظن اور تخمین کی بنا پر کرتے ہیں کہ چونکہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے تھے ورنہ ان کے پاس دلیل کوئی نہیں ہے۔ اور اگر اس کو موصولہ بنایا جائے تو معنی وہی ہوگا جو تحت اللفظ موجود ہے۔ اور محل اعراب نصب ہوگا کیونکہ اِنَّ کا اسم ہوگا اور اس کا عطف مَن پر ہوگا یعنی یہ لوگ بھی اللہ کی ملکیت کے اندر ہی ہیں جو غیر پرستی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما کو استفہامیہ ای شی کے معنی میں قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کیا کر رہے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسرے شرکاء کو پکارتے ہیں تو یہ استفہام انکاری ہوگا۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

کہنے لگے بنا لیا اللہ نے بیٹا پاک ہے وہ وہ تو بے نیاز ہے اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

نہیں ہے تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل کیا تم کہتے ہو اللہ پر ایسی بات جو تم نہیں جانتے

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا

کہدو تحقیق وہ لوگ جو افترا باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹا نہ چھٹکارا پائیں گے معمولی فائدہ ہے دنیا میں

ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

پھر تو ہماری جانب پلٹنا ہوگا پھر ان کو چکھائیں گے عذاب سخت بوجہ اس کے جو کفر کرتے تھے

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ - اب رُخِ کلام ان لوگوں کی طرف ہے جو خدا کے لئے اولاد ثابت کرتے تھے ان کی دو قسمیں تھیں۔

(۱) کفار قریش جو یہ خیال کرتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں (۲) نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان دونوں گروہوں کی تردید ہے کہ وہ غلط بکواس کرتے ہیں۔ اور اس کا جواب تین طرح سے دیا ہے (۱) سُبْحَانَهٗ اپنی تنزیہ بیان فرمائی۔ اولاد اپنے والد کے مشابہ ہوا کرتی ہے اور خدا مشابہت سے پاک و منزہ ہے۔ نیز اولاد کا ہونا حدوث کو چاہتا ہے اور خدا حدوث سے منزہ ہے۔ نیز اولاد کا ہونا تغیر کو چاہتا ہے اور خدا اس سے بلند و بالا ہے۔

(۲) هُوَ الْغَنِيُّ - یعنی اولاد کا وجود احتیاج کو ثابت کرتا ہے اور وہ خدا جو تمام کائنات کا واحد مالک ہے اس کو کسی کی احتیاج کیا ہے تاکہ اولاد کی اس کو ضرورت ہو؟

(۳) لَهٗ جن اشیاء کو خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء وہ خدا کی اولاد سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ سب ملکیتِ خدا میں داخل ہیں اور مملوک اور اولاد الگ الگ ہوا کرتے ہیں جو چیز مملوک ہو وہ اولاد نہیں ہو سکتی کیونکہ اولاد باپ کی جنس سے ہوتی ہے نہ کہ غیر تاکہ مملوک بنے اور تمام کائنات اس کی مملوک ہے خواہ آسمان میں ہو۔ جیسے فرشتے۔ یا زمین میں ہو جیسے انبیا و اولیاء پس ان کو خدا کا ولد کہنا غلط اور بے دلیل ہے۔ اور پیار و محبت میں مبالغہ کے لئے بمنزلہ اولاد کہنا بھی ناجائز ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر جن کی بنا پر اس کے لئے اولاد کا تجویز کرنا باطل ہے۔ پس ایسی باتیں صرف افترا پردازی اور بہتان طرازی ہیں۔ جن کا انجام عذاب شدید ہوگا۔

رکوع نمبر ۱۳ حضرت نوحؑ کا ذکر

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ - پیغامِ توحید اور تبلیغ رسالت پر جب مشرکین مکہ نے جناب رسالتمآبؐ پر طعن و تشنیع شروع کی تو خداوند کریم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ

اور پڑھ ان پر خبر نوح کی جب اُس نے کہا اپنی قوم سے اے قوم اگر شاق ہے تم پر میرا ہونا

مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ

اور نصیحت کرنا ساتھ آیات خدا کے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کیا ہے پس اکٹھا کرو اپنی قوت کو اور

شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا

ساتھیوں کو اور نہ ہو تمہارا معاملہ تم پر پوشیدہ پھر بڑھو میرے (قتل کی) طرف اور نہ مہلت

تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا

دو پس اگر تم نہ مانو تو میں نے تم سے کوئی مزدوری تو نہیں لی۔ میری مزدوری تو میرے اللہ

عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ

کے ذمہ ہے اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ ہوں تسلیم کرنے والوں میں سے پس انہوں نے اس کو جھٹلایا تو ہم نے

وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

اس کو نجات دی اور اس کے ساتھیوں کو کشتی میں اور کیا ہم نے ان کو قائم مقام (غرق ہونیوالوں کا) اور غرق کر دیا ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیات کو

نے جناب رسالت مآبؐ کے لئے تسلّی کے طور پر اور لوگوں کے لئے عبرت و نصیحت کے طور پر سابق انبیاء کی مثالیں پیش فرمانا شروع کر دیں اور تمام انبیاء میں حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت یونس کی ہی مثالوں کا انتخاب فرمایا کیونکہ ان کے واقعات نہایت نتیجہ خیز اور بالکل صاف اور واضح طور پر منصف طبائع کے لئے مؤثر ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا کہ وہ اس قسم کے جرأت مند دلیر اور نڈر مبلغ تھے کہ قوم کے انکار کے بعد ان کو صاف اور واشگاف الفاظ میں ببانگِ دہل کہہ دیا کہ تم میرے وعظ سے کبیدہ خاطر ہوتے ہو۔ اور میرا وجود تم نہیں برداشت کر سکتے تو میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے تم سے مرعوب ہو کر اپنا کلمہ حق چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں ہوں۔ تم بے شک سوچ سمجھ کر مشورہ کر کے میرے اوپر جو پہاڑ گرانا چاہتے ہو گرا دو۔ اور ذرہ بھر بھی دیر نہ کرو۔ اور فرمایا تمہارا میں نے نقصان ہی کیا کیا ہے؛ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ اگر نہ مانو تو نہ سہی۔ کوئی تم سے فیس تو وصول نہیں کرتا تاکہ تمہیں اس کا رنج ہو۔ تم اپنا باطل نہیں چھوڑتے تو ہم اپنا حق کیوں چھوڑیں ہمیں اس کا اجر اللہ ہی دے گا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے تکذیب کی اور غرق ہوئے اور ہم نے بذریعہ کشتی نوح کو اور اس پر ایمان لانے والی جماعت کو نجات دے کر ان کا قائم مقام بنایا۔ پس یہی انجام ہوتا ہے نہ ماننے والوں کا۔ اور

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى

پس دیکھ کیا انجام گذرا ان کا جنہیں ڈرایا گیا (لیکن نہ مانے) پھر بھیجا ہم نے ان کے بعد رسولوں کو اپنی قوموں کی

قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ

طرف پس وہ آئے دلیلیں لے کر پس نہ ایمان لانے والے بنے ساتھ اس کے جسے جھٹلا چکے تھے پہلے اسی

قَبْلُ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٧٤﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ

طرح ہم مہر لگاتے ہیں سرکشوں کے دلوں پر پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد

مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا

موسیٰ و ہارون کو فرعون اور اس کے سرداران قوم کی طرف اپنی آیات دیکر تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم

مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ

لوگ تھے پس جب آیا ان کے پاس حق ہماری جانب سے تو کہنے لگے تحقیق یہ ظاہر

مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ اَسِحْرٌ هٰذَا

جادو ہے فرمایا موسیٰ نے کیا تم کہتے ہو حق کو جب تمہارے پاس آیا کیا یہ جادو ہے حالانکہ

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

نہیں چھٹکارا پاتے جادوگر کہنے لگے کیا تو آیا ہے تاکہ پھیر دے ہمیں اس دین سے جس پر

حضرت نوح کا ذکر تفسیر کی چھٹی جلد ص۲۴ تا ص۶۶ میں بھی مذکور ہو چکا ہے اور مفصل ذکر اسی جلد میں سورہ ہود کی تفسیر میں آئے گا۔ ص۲۰۳ تا ص۲۱۹ ملاحظہ ہو۔

حضرت موسیٰ کا ذکر رُسُلًا۔ یعنی حضرت نوح کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد پیغمبر آتے رہے اور جھٹلانے والے جھٹلاتے رہے۔ اور بار بار کی نافرمانیوں سے دل اس قدر تاریک ہو جاتا ہے کہ پھر نصیحت کو قبول ہی نہیں کرتا گویا کہ اس پر گمراہی کی مہر لگ جاتی ہے اور اس کو طبع یا ختم کے لفظ سے قرآن میں تعبیر کیا گیا ہے۔ اور خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ مجبور نہیں کرتا اور اس کی مزید وضاحت تفسیر کی دوسری جلد میں ص۶۵ سے ص۶۷ تک مسئلہ قضا و قدر اور جبر و تفویض میں پوری تفصیل سے موجود ہے

اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

ہم نے اپنے آبا کو پایا تھا اور ہو تمہارے لئے بڑائی زمین میں اور ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ

اور کہا فرعون نے لاؤ میرے پاس ہر ماہر جادوگر کو پس جب آئے جادوگر

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ

تو کہا ان کو موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالنے والے ہو پس جب وہ ڈال چکے تو فرمایا

مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ

موسیٰ نے وہ جو لائے ہو تم جادو تحقیق خدا اسے باطل کرے گا تحقیق اللہ نہیں کامیاب کرتا

جَآءَهُمُ الْحَقُّ ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو حق کا نام دے کر خدا نے اپنی جانب منسوب فرمایا اور اس سے یہ تنبیہ کر دی کہ معجزات کا فاعل نبی نہیں ہوا کرتا بلکہ میں ہوا کرتا ہوں ۔

لَا يُفْلِحُ ۔ یعنی جادوگروں کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ تو صرف نہ جاننے والے لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں اور میرے معجزات دلائل کے ساتھ ہیں ۔ لہٰذا ان کو جادو کہنا صرف حسد اور کور باطنی ہے ۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا ۔ جب موسیٰ کے جواب سے عاجز ہوئے تو کہنے لگے تو ہمیں اپنے باپ دادا کے مذہب سے ہٹانا چاہتا ہے اور زمین میں حکومت کرنا چاہتا ہے لہٰذا ہم تیری بات ہرگز نہ مانیں گے ۔

فِرْعَوْنَ ۔ ہر دور میں باطل حق سے نبرد آزما رہا ہے لیکن حق والوں نے حوصلہ شکن حالات میں بھی حق کا ساتھ دیا اور آخر کار حق کی فتح ہوئی اور باطل کے بلند و مضبوط پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر حق کے قدموں میں گر گئے یا حق کے ہمہ گیر سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ۔ موسیٰ نے جب اژدہا کا معجزہ دکھایا تو فرعون اپنے دور کے عام چرچے کے ماتحت یا اپنے اقتدار کو بچانے کی خاطر اسے جادو کہنے پر مصر ہوا ۔ اور موسیٰ کے مقابلہ کیلئے اس نے جادوگروں کو جمع کرا لیا ۔ چنانچہ جب جادوگروں نے اپنی رسیوں پر منتر پڑھا یا جادو کیا تو بہرکیف لوگوں کی نظروں میں وہ چلتے پھرتے سانپ بن گئے ۔ ادھر حضرت موسیٰ نے بہ حکم خداوندی عصا کو زمین پر ڈالا تو وہ اژدھا بن گیا اور ان سب جادو کے سانپوں کو کھا گیا اور حضرت موسیٰ کے پکڑنے سے حسب سابق عصا بن گیا ۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کو اقتدار کی ہوس کے اندھے نے آخر تک نہ مانا اور منصف طبع جادوگروں نے تسلیم کر لیا کہ موسیٰ کی طاقت مافوق البشر ہے ۔ اور وہ خدائی نمائندہ ہے لہٰذا انہوں نے صرف ہار ہی نہیں مانی بلکہ کفر کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور حضرت موسیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے اور اس قدر پختہ یقین سے اسلام لائے کہ ان کے حق

عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

فسادیوں کے عمل کو — اور ثابت کرتا ہے اللہ حق کو ساتھ اپنے حکم کے اگرچہ ناپسند کریں مجرم

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ

پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر مگر بچے اس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون اور اپنے سرداروں سے

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

کہ کہیں فتنہ میں نہ ڈالیں اور تحقیق فرعون ایک متکبر تھا زمین میں اور تحقیق بے راہ رو تھا

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ

اور فرمایا موسیٰ نے اے قوم اگر تم ہو ایمان لائے اللہ پر تو اس پر بھروسہ کرو اگر

ہیں پھانسی کی سزا تجویز ہوئی تو موت کو گلے سے لگا لیا لیکن حق کو گلے سے الگ نہ کیا۔ مفصل بیان تفسیر کی چھٹی جلد صفحہ ۶۸ تا صفحہ ۷۱ میں دیکھیے۔

مَاجِئْتُمْ ۔ ما موصولہ مبتدا ہے اور فعل اس کا صلہ ہے اور السحر خبر ہے اس کی۔ حضرت موسیٰ کا تذکرہ ابھی اسی جلد میں سورۂ ہود میں بھی ہوگا صفحہ ۲۳۵

بِكَلِمٰتِهٖ ۔ یا تو اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو خدا نے موسیٰ سے کیا تھا یا اس سے مراد نوشتہ لوح محفوظ ہے کہ حق کو کامیاب کروں گا اور یا اس سے مراد اُس کے کلام کی آیات ہیں جو بیان حق کے لئے اُترتی ہیں۔

رکوع نمبر ۱۴

مِنْ قَوْمِهٖ ۔ ھا ضمیر غائب کا مرجع فرعون بھی بن سکتا ہے اگر فرعون ضمیر کا مرجع بنے تو معنی یہ ہوگا کہ فرعون کی قوم کے چند بچے مومن ہو گئے ان کو ذرّیت یعنی بچے اس لئے کہا گیا کہ ایک سرکش اور ظالم مطلق العنان حکمران کے مقابلہ میں انتہائی کمزور تھے جس طرح بچہ کمزور ہوتا ہے۔ پس اس بارے میں چند اقوال ہیں۔ ۱۔ یہ کہ ان کی مائیں بنی اسرائیل سے تھیں اور باپ قبطی تھے۔ ۲۔ یہ کہ ان سے مراد آسیہ زنِ فرعون، مومن آلِ فرعون اور فرعون کی زوجہ کی مشاطہ ہو۔ ۳۔ یہ کہ بعض قبطی تھے جن کے والدین مسلمان نہ ہوئے اور اگر ضمیر غائب کا مرجع موسیٰ کو قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ موسیٰ کی قوم کی اولاد ایمان لائی لہٰذا اس میں بھی چند اقوال ہیں (۱) بنی اسرائیل کی ایک جماعت تھی جن کو فرعون نے جادو کی تعلیم دلوا کر اپنے خواص میں شامل کیا ہوا تھا (۲) یہ بنی اسرائیل تھے اور حضرت یعقوب جب مصر میں داخل ہوئے تھے تو ان کی اولاد ۷۲ نفوس پر مشتمل تھی لیکن اب وہ چھ لاکھ تک پہنچ چکے تھے (۳) موسیٰ جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے وہ سب کے سب مر چکے تھے کیونکہ زمانہ زیادہ گذر چکا تھا اور یہ لوگ ان کی اولاد تھے۔

مُسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ

مسلمان ہو تو کہنے لگے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا اے رب نہ کر ہمیں آزمائش ظالم لوگوں کے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَوْحَيْنَا

لئے اور ہمیں نجات دے اپنی رحمت سے کافر لوگوں سے اور ہم نے وحی کی طرف

اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ

موسیٰ کے اور اس کے بھائی کے کہ بناؤ اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر اور اپنے گھروں کو

قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ

قبلہ اور قائم کرو نماز کو اور خوشخبری دو مومنوں کو اور کہا موسیٰ نے اے رب تو نے دی

اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِيُضِلُّوْا عَنْ

فرعون اور اس کے لشکر کو خوشحالی اور مال زندگانی دنیا میں اے رب تاکہ گمراہ کریں تیری

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۔ یعنی ان کو ڈر تھا کہ کہیں ظالم فرعون ظلم و تشدد کرکے ہمیں فتنہ و مصیبت میں نہ ڈالے تاکہ دوبارہ ہمیں مرتد نہ ہونا پڑے۔

لَا تَجْعَلْنَا ۔ حضرت موسیٰ کے جرأت دلانے سے وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم تو ہو گئے لیکن دعائیں مانگتے تھے کہ پروردگارا ہمیں ظالم لوگوں کی آزمائش گاہ نہ بنانا۔ یعنی ان کو ہم پر کامیابی نہ دینا۔ کیونکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ اگر موسیٰ پر ایمان لانے والے حق پر ہوتے تو خدا ان کی مدد کرتا۔ لہٰذا تو ہماری نصرت فرما اور ان کافر لوگوں سے ہمیں نجات دے۔

اَنْ تَبَوَّاٰ ۔ یعنی ہم نے موسیٰ و ہارون کو حکم دیا کہ مصر میں اپنی رہائش رکھ لو اور گھر بنالو۔

وَاجْعَلُوْا ۔ بعضوں نے کہا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی مساجد کو مسمار کر دیا تھا پس خدا کا حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو ہی قبلہ بنالو یعنی مساجد سمجھ لو اور وہیں نماز ادا کر لیا کرو۔ اور بعض مفسرین نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے مقابل بنالو۔

زِيْنَةً ۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کے حق میں بددعا کی تھی جو مقبول ہوئی۔ کہ اے پروردگار تو نے ان کو زینت اور مال دے رکھے ہیں۔ زینت سے مراد سامان آرائش زیورات لباس اور عمدہ عمدہ بنگلے محل وغیرہ۔ پس وہ اسباب عیش کی فراوانی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو راہ راست سے گمراہ کرتے ہیں تو ان کے اموال کو تباہ کر دے تاکہ گمراہی کا یہ اہم سبب ان سے سلب ہو جائے اور ان کو ہلاک و برباد کر دے اُشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کا یہ

سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا

راہ سے اے رب خراب کر دے ان کے مالوں کو اور بند کر دے ان کے دلوں کی حرکت کو پس وہ ایمان نہیں لاتے

حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٨٨﴾ قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا

یہاں تک کہ دیکھیں عذاب دردناک فرمایا تحقیق قبول کی گئی تمہاری دعا پس تم ڈٹے رہو

وَلَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾ وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ

اور نہ اتباع کرو ان لوگوں کے راستہ کی جو بے علم ہیں اور گذارا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا

الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ

سے تو پیچھے لگا ان کے فرعون اور اس کا لشکر ازراہِ ظلم و سرکشی یہاں تک کہ جب غرق

معنی کیا گیا ہے کہ ان کے دلوں کی حرکت بند کر دے یعنی ہلاک کر دے کیونکہ یہ ایمان لانے والے نہیں جب تک کہ عذاب نہ دیکھیں پس وحی ہوئی کہ تمہاری دُعا مقبول ہے۔ پس تم اپنا کام کئے جاؤ۔ تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے کہ موسےٰ و ہارون کی دُعا اور فرعون کے غرق ہونے میں چالیس سال کا فاصلہ تھا تو اس سے معلوم ہوا کہ دعا کے مستجاب کے لئے ضروری نہیں کہ فوراً ہی اس کا نتیجہ نکل آئے بلکہ یہ خدا کی مصلحت کے تابع ہے۔ مروی ہے کہ دعا مانگنے والا حضرت موسیٰ تھا اور ہارون آمین کہنے والے تھے۔ پس آخر کار فرعون غرق ہوا اور ان کے مال و خزائن خراب ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ان کا سونا ٹھیکریاں اور کنکر بن گئے تھے۔

تفسیر جامع میں ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں بھی طمس اموال کا واقعہ ہوا کہ ایک شخص نے حضرت رسالت مآبؐ کی خدمت میں درخواست دی کہ میں نے کمال محنت سے اپنے لڑکے کی پرورش کی ہے۔ اب وہ جوان ہے اور میں بوڑھا ہوں اور مجھے خرچہ نہیں دیتا تو آپ نے لڑکے کو سمجھایا لیکن اُس نے کہا کہ میں غریب ہوں حضورؐ نے ایک ماہ کا خرچہ اپنی طرف سے دیا اور دوسرے ماہ میں بوڑھے کی شکایت پر لڑکے کو بلا کر تنبیہ فرمائی تو اُس نے وہی پہلا جواب دیا تو آپ نے فرمایا جاؤ۔ خدا تیرے مال کو ضائع کرے گا۔ چنانچہ اس کے تمام ذخائر گندم وغیرہ میں کیڑا پڑ گیا اور بدبودار ہو گئے اور مزدوروں کو بلا کر باہر پھینک دئے۔ جب مزدوری ادا کرنے کے لئے خزانہ کو دیکھا تو سب ٹھیکریاں اور سنگریزے تھے۔ خداوند کریم مومنین کی اولاد کو حقوق والدین ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین

وَجَاوَزْنَا۔ یعنی ہم نے گذارا بایں طور کہ دریا کو خشک کر کے اُس میں بارہ راستے پیدا کر دئے۔

تفسیر جامع و مجمع البیان میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے موسےٰ سے درخواست کی کہ دعا مانگو کہ خدا فرعون کو تباہ

الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ

ہونے لگا تو کہا کہ میں مانتا ہوں کہ کوئی لائق عبادت نہیں مگر وہ جس کو مان چکے بنی اسرائیل

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾

اور میں ہوں مسلمانوں میں سے (تو کہا گیا) اب جب کہ نافرمانی کر چکا پہلے اور تھا تو فساد کرنیوالوں میں سے؟

کردے کیونکہ وہ اس کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے پس موسیٰ نے دعا کی تو حکم ہوا کہ ان کو ساتھ لے کر نکل جاؤ۔ چنانچہ رات کو روانہ ہوئے۔ جب دن ہوا تو فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔ دریائے نیل کے کنارہ پر پہنچے تو باذن خدا موسےٰ نے عصا مارا۔ پانی شگافتہ ہوا۔ اور بارہ راستے پیدا ہوگئے۔ نیز ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے پانی کی دیواروں میں روشندان نما شگاف بھی بن گئے۔ پس ایمان والے گذر گئے اور جب لشکر فرعون پہنچا تو پانی میں عبور کرنے سے ڈر گئے تو جبریل بشکل انسانی ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آگے بڑھے اور فرعون مشکی رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ گھوڑی کے پیچھے پانی میں اترا اور پھر لشکر بھی داخل ہوا ... یہ واقعہ مفصلاً تفسیر کی دوسری جلد صہ پر مذکور ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کسی واعظ سے سُنا تھا اور نہ خود کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور وہ یہ کہ جب موسےٰ کی دعا مستجاب ہوئی اور فرعون پر غرقابی کا عذاب حتمی قرار دیا گیا تو مزید اتمام حجت کے لئے ایک دن جبریل بصورت بشر ایک مقدمہ لے کر فرعون کے دربار میں داخل ہوا اور کہا کہ اگر کوئی غلام ایسا ہو جس پر اپنے آقا کا بڑا لطف و کرم ہو لیس وہ غلام موقع پاکر اپنے آقا کے سب احسانات بھلا کر اس کے تخت و تاج پر قبضہ کرے۔ پھر ایسا غلام کسی وقت مغلوب ہو جائے اور وہی آقا جو پہلے بادشاہ تھا دوبارہ اپنا تخت سنبھالے اور سابق احسان فراموش غلام گرفتار ہو کر اس کے پیش کیا جائے تو بتائیے کہ وہ غلام کس پاداش کا مستحق ہے۔ فرعون نے فوراً جواب دیا کہ ایسا نمک حرام غلام کسی رحم و معافی کے قابل نہیں۔ پس اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو دریا میں غرق کر دیا جائے۔ چنانچہ جبریل نے کاغذ پیش کر کے یہی فیصلہ لکھوا لیا۔ اور اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ پس جب فرعون غرق کا وقت آیا تو موسےٰ اپنی قوم سمیت دریا سے پار ہو گئے اور فرعون کا پورا لشکر دریا میں اُتر آیا پس دریا کی موجیں مل گئیں اور وہ غرق ہوا۔ اثنائے غرق میں فرعون نے خدا سے معافی کی درخواست دی کہ میں اب مسلمان ہوتا ہوں۔ اور اس خدا کو مانتا ہوں جس پر بنی اسرائیل کا ایمان ہے تو اس وقت جبریل نے وہی اس کے ہاتھوں کا لکھا ہوا فیصلہ اس کے سامنے کیا کہ ایسے غلام کی توبہ قبول نہیں بلکہ وہ غرق ہونے کا مستحق ہے۔

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ۔ جب فرعون نے ایمان کا اظہار کرنا چاہا تو جبریل نے یہ لفظ کہہ کر اس کی بات کو ٹھکرا دیا کہ اب معافی مانگتا ہے جب گناہوں میں وقت گذار کر عذاب خدا میں گرفتار ہو چکا ہے۔ مروی ہے کہ اس کے بعد جبریل

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا

پس آج ہم نجات دیں گے بدن تیرے کو تاکہ ہو بعد والوں کے لئے نشانی اور تحقیق بہت

مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ ﴿٩٢﴾ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ

لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں اور تحقیق ہم نے ٹھکانہ دیا بنی اسرائیل

مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ

کو اچھا ٹھکانا اور ان کو رزق دیا پاکیزہ پس نہ اختلاف کیا انہوں نے یہاں تک کہ آیا

الْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾

ان کے پاس علم تحقیق تیرا رب فیصلہ کرے گا ان کے درمیان بروز قیامت جس میں وہ اختلاف کرتے تھے

کبھی خوش نہیں نظر آیا تھا کیونکہ اُسے خیال تھا کہ ممکن ہے خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی ہو۔ اور میرا فرعون کو جواب دینا منظور پروردگار نہ ہو۔ جب جبریل یہ آیت لایا تو اُس دن اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار تھے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ اب خوش کیوں ہے حالانکہ اس سے قبل تجھے ہمیشہ میں نے غمناک دیکھا ہے تو اُس نے عرض کی کہ فرعون نے جب کلمہ توبہ کا اظہار کرنا چاہا تھا تو میں نے ایک کوئلہ اس کے منہ میں ڈال کر خاموش کر دیا تھا لیکن اُس وقت سے اب تک ڈرتا ہوں کہ یہ فقرہ میں نے بغیر اذنِ پروردگار کے کیوں کہا تھا۔ لیکن اب اُسی قول کو بصورتِ قرآن پہنچانے آیا ہوں تو مجھے تسلی ہوئی ہے کہ خدا میرے اس قول پر راضی تھا۔

نُنَجِّيكَ۔ یہ نجوہ سے ہے جس کا معنی ہے زمین میں بلند جگہ، پس اس کا معنی یہ ہے کہ ہم تجھے بلند جگہ رکھیں گے تاکہ دوسری اقوام کو تیرے انجام کا بخوبی پتہ چل سکے پس باقی لشکر پانی میں بہہ گیا اور فرعون کا بدن پانی کے اُوپر نکل آیا اور بعض نے کہا ہے کہ بدن کا معنی زرہ ہوتا ہے اور فرعون کی زرہ سونے کی تھی۔ اور معنی یہ ہے کہ ہم تجھے تیری زرہ سمیت بچائیں گے۔ پس وہ زرہ سمیت پانی کے اُوپر نکل آیا تو لوگوں نے پہچان لیا کہ فرعون مر چکا ہے اور اس وقت تک بنی اسرائیل فرعون کی موت کو نہیں مانتے تھے۔ اب دیکھا تو مان گئے۔ اور مصر جانے والوں سے سُنا ہے کہ اب تک فرعون کی لاش اہرامِ مصر میں محفوظ ہے جو دیکھنے والوں کے لئے باعث عبرت ہے۔

پس خدا کا وعدہ سچا ہوا کہ تیرے بدن کو یعنی صرف ڈھانچہ کو روح کے بغیر بچا لیں گے تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے عبرت و نصیحت اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی باقی رہے۔

رکوع نمبر ۱۵ ۔ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا ۔ یعنی فرعون کے غرق ہونے کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانہ دیا۔

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ

پس اگر ہے تو شک میں اس سے جو ہم نے اتارا تجھ پر تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب

مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۹۴﴾

تجھ سے پہلے تحقیق آیا تیرے پاس حق تیرے رب سے پس نہ ہو شک کرنے والوں میں

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿۹۵﴾

اور نہ ہو ان میں سے جنہوں نے جھٹلایا خدا کی آیات کو ورنہ ہوگا نقصان پانے والوں میں سے

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ

تحقیق جن پر ثابت ہوا تیرے رب کا کلمہ (عذاب) نہ ایمان لائیں گے اگرچہ

جَاءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ

آئیں ان کے پاس تمام نشانیاں یہاں تک کہ دیکھیں دردناک عذاب پس کیوں نہیں

فَمَا اخْتَلَفُوْا۔ یعنی حضرت رسالت مآبؐ کی آمد تک انہیں کوئی اختلاف نہ تھا لیکن جب حضور تشریف لائے تو انہوں نے اختلاف کر دیا یہ یہود کی مذمت ہے۔

فَاِنْ كُنْتَ۔ یہ خطاب حضور کی جانب ہے۔ اور مراد اُمت ہے یا خطاب حضور سے ہے لیکن نہ اس لئے کہ آپ کو شک تھا بلکہ صرف تقریر کے لئے مثلاً کوئی اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو فلاں کام کرو، حالانکہ اس کے بیٹے ہونے میں شک نہیں ہوتا بلکہ کلام کی پختگی میں اضافہ کے لئے ایسا کیا جاتا ہے یا ہر مخاطب سے خطاب ہے۔ گویا زبانِ پیغمبر پر جاری کرکے فرمایا اے مخاطب اگر تجھے ان باتوں میں شک ہے تو سابق اہلِ کتاب سے دریافت کرو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب سے پوچھنے کا حکم کیوں دیا۔ حالانکہ وہ تو اُلٹا دشمن تھے تو جواب یہ ہے کہ اوّلاً تو حکم ان اہلِ کتاب سے پوچھنے کا ہے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ اور ثانیاً یہ سورہ مکیہ ہے اور مکہ والوں کو خطاب ہے کہ پیغمبر کے متعلق اگر اس کی باتوں یا قرآن کی آیتوں میں شک ہے تو اہلِ کتاب سے اس کی تصدیق کرا لو یا یہ کہ آیت مذکورہ شبِ معراج آسمانوں پر اُتری تھی اور وہاں سابق اہلِ کتاب مومنین کے ارواح سے پوچھنا ممکن تھا۔ اور یہ روایت تفسیر مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

حضرت یونسؑ کا ذکر

فَلَوْلَا۔ چونکہ اس سے قبل فرعون کے غرق ہونے کا تذکرہ تھا کہ اس نے اس وقت ایمان لانے کی خواہش ظاہر کی جب کہ عذاب میں گرفتار ہو چکا تھا تو اسی مناسبت سے

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا

کوئی بستی ایمان لاتی ایسے وقت ہیں کہ نفع دے اس کو ایمان اس کا مگر قوم یونس کہ جب ایمان لائے تو دُور کر دیا ہم نے

عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۹۸﴾

ان سے عذاب رسوائی کا زندگانی دنیا میں اور ان کو نفع دیا ایک وقت تک

فرماتا ہے کہ عذاب آجانے کے بعد کسی قوم کا ایمان قابل قبول نہیں ہوا۔ سوائے قوم یونس کے۔ پس آیت مجیدہ کا ترجمہ یوں ہوگا کہ کیوں نہیں ایمان لاتیں تو ہیں درحالیکہ ان کو ایمان نفع دے۔ یعنی عذاب نازل ہونے سے پہلے۔ پس یہاں عبارت محذوف ہوگی۔ کہ عذاب نازل ہونے کے بعد ایمان لانا مفید نہیں ہوتا۔ اور نہ عذاب خدا ٹل سکتا ہے مگر حضرت یونس کی قوم کہ انہوں نے ایمان قبول کیا تو ان سے عذاب ٹل گیا۔

تفسیر مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت یونس کی قوم میں ایک شخص عابد تھا جس کا نام ملیخا تھا اور ایک مرد عالم تھا جس کا نام روبیل تھا جو عابد تھا وہ قوم کی سرکشی سے تنگ آکر حضرت یونس کو بددعا کا مشورہ دیتا تھا اور روبیل روکتا تھا۔ آخر کار۔ عابد کے مشورہ سے حضرت یونس نے بددعا کی جو قبول ہوئی۔ اور خدا نے عذاب کی تاریخ مقرر فرمادی۔ جب وقت قریب آیا تو حضرت یونس اس عابد کو ہمراہ لے کر ہجرت کر کے چلے گئے۔ لیکن وہ عالم ٹھہرا رہا۔ جب عذاب کے آثار نمودار ہوئے تو عالم نے ان کو توبہ کا مشورہ دیا کہ جنگل میں چلے جاؤ۔ اور بچوں کو ماؤں سے مردوں کو عورتوں سے اور تمام حیوانات کو اپنی اولاد سے جدا کر کے نہایت گڑگڑا کر نہایت عاجزی وزاری سے توبہ کرو اور گناہوں کی بخشش طلب کرو۔ شاید خداوند کریم معاف فرمادے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور عذاب خدا دفع ہوگیا۔

موصل کے قریب ایک جگہ تھی جس کا نام نینوئی تھا۔ یہ وہاں کے باشندے تھے اور عبداللہ بن مسعود کی روایت کے مطابق ان کی توبہ کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے اپنے مظالم اور حقوق ایک دوسرے کو سب واپس کر دیئے حتیٰ کہ اگر کسی کے مکان میں دوسرے کا ایک پتھر لگا ہوا تھا تو اس نے اپنے مکان کو گرا کر اصل مالک کو اپنا پتھر واپس کر دیا۔ پس جب اس طرح خلوص نیت سے توبہ کی تو معافی مل گئی۔ روایت سابقہ کے مطابق حضرت یونس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دریا کے کنارہ پہ پہنچے تو کشتی تیار تھی۔ سوار ہوئے تو وسط دریا میں ایک بڑی مچھلی نے سر نکالا اور کشتی کو روک دیا۔ ملاحوں نے کہا کہ یہاں کوئی اپنے آقا سے بھاگا ہوا غلام ہے لہٰذا قرعہ اندازی کی گئی تو سات دفعہ قرعہ حضرت یونس کے نام نکلا۔ آپ اٹھ کھڑے ہوگئے اور اپنے آپ کو دے گئے۔ چنانچہ مچھلی نے اسے پیٹ میں رکھ لیا۔ ادھر مچھلی کو خدا کا حکم ہوا کہ یہ تیری خوراک نہیں لہٰذا اس کو ہضم نہیں کرنا بلکہ یہ امانت ہے اور تیرے شکم کو اس کا قید خانہ بنایا گیا ہے۔ بہرکیف تین دن یا سات دن

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ

اور اگر چاہتا تیرا رب تو ایمان لاتے جو زمین میں ہیں سب کے سب کیا تو مجبور کرتا ہے لوگوں کو

حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

کہ مومن ہو جائیں اور نہیں ممکن کسی نفس کو کہ ایمان لائے مگر خدائی توفیق سے

وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ

اور وہ کرتا ہے عذاب ان لوگوں پر جو نہیں سوچتے کہہ دو کہ دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں اور

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

زمین میں؟ اور نہیں فائدہ دیتی نشانیاں اور ڈرانا اس قوم کو جو ایمان نہ رکھتی ہو

یا چالیس دن باختلاف اقوال مچھلی کے شکم میں رہے۔ آبی مخلوق کی تسبیحات سنتے رہے۔ اور خود بھی زبان پر لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کی تسبیح مسلسل جاری رکھی حتی کہ مچھلی نے دریا کے کنارہ پر اگل دیا۔ اسی کے متعلق ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت امیر علیہ السّلام سے سوال کیا تھا کہ وہ کونسا قیدخانہ ہے جس نے اپنے قیدی کو سیر کرائی تھی تو آپ نے جواب دیا کہ وہ مچھلی ہے جس نے حضرت یونسؑ کو دریاؤں کی سیر کرائی۔ جب مچھلی نے اُگلا تو ان کا بدن بالکل ملائم ہو گیا تھا۔ پس خدا نے ایک کدّو اگایا جس کے سایہ میں وہ رہے اور ایک ہرنی کو حکم دیا جو ان کو روزانہ دودھ پلا جایا کرتی تھی۔ ایک دن دیکھا کہ درخت کدو خشک ہو چکا تھا تو رونے لگے۔ پس وحی خداوندی ہوئی کہ ایک کدو کی شاخ کے لئے رو رہا ہے اور ایک لاکھ یا اس سے زیادہ انسانی نفوس کے ہلاک ہونے اور معذّب ہونے کے لئے دُعا مانگتا تھا۔ پس حضرت یونسؑ روانہ ہوئے۔ ایک نوجوان سے ملے جو بکریاں چرا رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ تو کون ہے تو اُس نے جواب دیا کہ میں حضرت یونسؑ کی قوم کا ایک فرد ہوں تو آپ نے اس کو پیغام دیا کہ گھر جا کر اپنی قوم کو میری اطّلاع دے دینا۔ چنانچہ اس طرح سے وہ واپس دوبارہ اپنی قوم میں پلٹے اور قوم والے خوش ہوئے اور ایمان لائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بعد میں وہ کسی دوسری قوم کی طرف بھیجے گئے۔

وَلَوْ شَآءَ ۔ خدا ان واقعات کے بعد حضورؐ کو تسلی دے رہا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو جبر کے ذریعے سے سب کو مومن بنا دیتا لیکن ایسا کرنا میری مصلحت کے خلاف ہے لہٰذا آپ بھی کسی کو مجبور نہ کریں۔ اور فرماتا ہے کہ جو بھی ایمان کو قبول کرتا ہے وہ میری عطا کردہ توفیق سے کرتا ہے یہاں اذن سے مراد توفیق ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا ۔ اقوام گذشتہ مثلاً نوح و موسیٰ و یونس کی قوموں کے ذکر کے بعد دوبارہ آثار قدرت اور مظاہر حکمت میں غور کرنے کی دعوت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں غور سے دیکھو تو سہی یہ نظام پر از حکمت اور اس کی رنگینیاں خود بخود ایک صانع حکیم کی

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ط قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا
پس وہ نہیں انتظار کرتے مگر مثل ان لوگوں کے دنوں کے جو ان سے پہلے گذر چکے کہہ دو پس انتظار کرو

اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّىْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ج
میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں پھر ہم بچالیں گے اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائیں اسی طرح

حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ
حق ہے ہم پر کہ نجات دیں مومنوں کو کہہ دے کہ اے لوگو اگر تمہیں شک ہے میرے دین

شَكٍّ مِّنْ دِيْنِىْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ
کے متعلق تو میں تو نہیں عبادت کرتا ان کی جن کی تم کرتے ہو اللہ کے علاوہ لیکن میں تو

ازلیت وابدیت کی طرف متوجہ کرکے اس کی عبادت کی طرف دعوت دینے کے لئے کافی ہیں۔

وَمَا تُغْنِیْ ۔ پھر خود فرماتا ہے کہ ہٹ دھرمی اور ضد کے عادی دشمنانِ ایمان کو یہ نشانیاں بلکہ رسولوں اور نبیوں کا عذاب اخروی سے ڈرانا بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا۔

فَهَلْ : گویا یہ لوگ انہی ایام کا انتظار رکھتے ہیں جو پہلی تکذیب کرنے والی اقوام پر آئے تھے یعنی عذاب ہی کے منتظر ہیں۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ جب حضور معراج سے واپس آئے اور صحابہ کو بتایا کہ میں بیت المقدس گیا۔ اور نبیوں سے ملاقاتیں کیں۔ اور براق پر سوار ہوا۔ اور اگر کوئی نہ مانے تو میں ایک نشانی بتلاتا ہوں اس کو نوٹ کرلو۔ اور وہ یہ کہ میں ابوسفیان کے قافلہ کے پاس سے گذرا تھا کہ فلاں مقام پر ان کا سرخ رنگ کا اونٹ وہاں گم ہو گیا اور وہ اس کو ڈھونڈھ رہے تھے قریشی یہ سن کر کہنے لگے کہ کسی تیز رو پیک نے اس کو بتا دیا ہوگا تو انہوں نے شام کے بازاروں اور دروازوں کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا، آپ خاموش ہوئے تو فوراً جبریل نے وہ منظر پیش کیا۔ پس وہ جو کچھ پوچھتے گئے آپ بتلاتے گئے۔ اور باوجود اس سب کچھ کے بہت تھوڑوں نے اسلام قبول کیا۔ انہی کے متعلق خدا تسلی دے رہا ہے کہ آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ یہ لوگ بھی عذاب کا ہی انتظار کرتے ہیں۔

حَقًّا عَلَيْنَا ۔ تفسیر مجمع البیان میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ تم اپنے مرجانے والے کے متعلق جو ولائے اہلبیت پر مرا ہو جنت کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا فرماتا ہے ہم پر حق ہے مومنوں کو نجات دینا۔

رکوع نمبر ۱۶ ۔ اتمام حجت ۔ **قُلْ** ۔ کفار کے لئے پھر دعوتِ فکر ہے کہ اگر تمہیں میرے دین کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آ رہا تو یہ بات اس قدر گنجلک وار نہیں بلکہ سیدھی سادی بات ہے کہ میں ان کی عبادت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جو

اُعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ

عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو تمہیں مارتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ہو جاؤں مومنوں سے (اور مجھے کہا گیا ہے)

اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا

کہ قائم کر اپنے منہ کو دین کے لئے جو سیدھا ہے اور نہ ہو مشرکوں میں سے اور نہ

تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَ لَا یَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ

پکار اللہ کے سوا ان کو جو نہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اگر ایسا کرو گے تو ہو جاؤ گے

اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ

ظالموں سے اور اگر تم کو پہنچائے اللہ کوئی تکلیف تو نہیں دور کرتا اس کو مگر وہ

وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ

اور اگر چاہے تیرے ساتھ اچھائی تو کوئی اس کے فضل کو نہیں روک سکتا دے جسے چاہے اپنے بندوں میں سے

اللہ کے سوا تم نے بنا رکھے ہیں بلکہ صرف اسی کی عبادت کروں گا جو موت پر قادر ہے۔ یہاں حیات کا ذکر نہ کیا اور موت کا ذکر کیا اس لئے کہ نفع کے مقابلہ میں انسان فطری طور پر نقصان کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے اور یہاں ان کو توجہ ہی دلانی تھی۔

وَاَنْ اَقِمْ۔ یہ اُمِرْتُ کے ماتحت ہے یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مومن ہو جاؤں اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ دین پر ثابت قدم رہوں اور مشرک نہ بنوں۔ اور ایسوں کو نہ پکاروں جو اطاعت گذاروں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور نافرمانوں کو سزا نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا کرے گا تو ظالم ہو جائے گا۔

اس سے بہتر تبلیغ اور اتمام حجت کا اور کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ صرف اپنا مذہب ہی بیان کیا اور مشرکین کے مذہب کے نقائص خود بخود سامنے آگئے اور تبلیغ کا طریقہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنے مذہب کی صفائی بیان کرے اور اپنے عمل سے اس کی تصدیق کرے۔ غلط اور باطل مذہب والا خود بخود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر پشیمان ہوگا۔ اور آخر کار اسے اپنا مذہب چھوڑ کر حق والوں کا ساتھ دینا ہوگا اور یہی احسن طریقہ ہے کسی کو راہ راست پر لانے کا۔

سورہ کا ملخص

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ۔ یہ سورہ یونس کی آخری آیتیں ہیں اور پوری دعوت کا آخری فیصلہ ہے۔ یعنی سورہ مجیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شروع میں اثبات خالق اور اس کے احسانات کا تذکرہ کر کے دعوت عبادت دی۔ اور پھر بت پرستی اور غیروں کی طرف جھکاؤ کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے توحید کے دلائل بیان کئے یعنی حق سے محبت اور باطل سے نفرت یا یوں کہا جائے کہ تولّا اور تبرّا کے دونوں پہلوؤں کو نہایت حسن اسلوبی سے بیان فرمایا

وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٧﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن

اور وہ غفور رحیم ہے کہدے اے لوگو تحقیق آیا تمہارے پاس حق تمہارے

رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا

رب سے تو جو ہدایت پائے گا وہ ہدایت پائے گا اپنے فائدہ کے لئے اور جو گمراہ ہوگا تو وہ گمراہ ہوگا اپنے نقصان کے لئے

وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ

اور میں نہیں تم پر چوکیدار اور تو اتباع کر اس کی جو وحی ہو تجھ پر اور صبر کر یہاں تک کہ

يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾ ع ۱۱

فیصلہ کرے اللہ اور وہ اچھا فیصلہ کرنے والا ہے

اس کے بعد جو لوگ جناب رسالت مآبؐ کو ایذا دیتے اور ان کے مشن کو خراب کرنے کی کوشش کرتے تھے تو آپ کو حلم کی تلقین کے لئے سابق اُمتوں کے حالات دُہرائے کہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ بس گذشتہ نبیوں کے قصے بلکہ ان میں سے خصوصاً حضرت نوح۔ موسٰے اور حضرت یونس کا ذکر کر کے حضورؐ کو تسلّی دی اور کافروں کو سابق غرق و تباہ ہونے والوں کے انجام بد سے متنبہ کیا۔ اور توبہ کی طرف راغب فرمایا۔ اور آخر میں پھر اسی دعوت کو ایک مرتبہ دہرا کر اتمام حجت فرمائی اور اب ان دو آیتوں میں یہ دو ٹوک فیصلہ سُنا دیا ہے کہ پروردگار کی طرف سے حق تم تک آچکا لہٰذا تم بروز محشر عذر نہیں کرسکو گے اور جو ہدایت قبول کرے گا وہ خود ہی اس سے نفع اٹھائے گا اور جو گمراہ ہوگا اس کا وبال وہ خود ہی برداشت کریگا۔ میں ان باتوں میں تمہارا پاسبان نہیں ہوں۔ اور آخر میں خدا کی طرف سے یہ تفہیم ہے کہ اے میرے حبیب تو وحی کے مطابق عمل کرتا جا۔ اور صبر و سکون سے کام چلائے جا۔ بعد کا فیصلہ اور انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ہی اس کا اچھا فیصلہ کریگا۔ سورہ یونس کی تفسیر ختم ہوئی۔

والحمد للہ رب العالمین

سُوْرَۂ ھُوْد

یہ سُورۂ مکیّہ ہے۔ اس کی آیات کی تعداد ایک سو تیئس ہے۔ اس میں ۱۷۱۵ لفظ اور ۷۵۶۷ حروف ہیں (تفسیر جامع) اور بسم اللہ کو ملا کر آیات کی تعداد ۱۲۴ ہو جائے گی۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو شخص ہر جمعہ کو سُورہ ہود پڑھیگا قیامت کے دن اس کا حشر پیغمبروں کے ساتھ ہوگا اور کوئی گناہ اس کے ذمہ باقی نہ رہے گا۔

حضور اکرم سے مروی ہے کہ جو شخص سورہ ہود کو پڑھے گا تو اس کے ساتھ جملہ تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کے برابر نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوں گی۔ اور اس کا مرتبہ و مقام شہداء کے برابر ہوگا اور اس کا حساب آسان ہوگا۔ اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جو شخص ہرن کی کھال پر لکھ کر اپنے پاس رکھے خدا اس کو ایسی ہیبت عطا کرے گا جو اس سے لڑے گا مغلوب ہوگا۔ اور جو اس کو دیکھے گا۔ خوف کھائے گا (جامع)

تفسیر مجمع البیان میں جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے کہ جو اسے پڑھے گا حضرت نوح۔ ھود۔ صالح۔ شعیب۔ لوط اور ابراہیم علیہم السلام کے تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوں گی۔ اور مروی ہے کہ حضورؐ سے بڑھاپے کے جلدی آنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا

شَیَّبَتْنِیْ هُوْدٌ وَ اَخَوٰتُهَا الْحَاقَّةُ وَالْوَاقِعَه ، الخ

یعنی مجھے سورہ ہود اور واقعہ وغیرہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾

الرا یہ کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں اور مفصل ہیں اس ذات کی طرف سے جو حکیم و خبیر ہے

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا

نہ عبادت کرو مگر اللہ کی تحقیق میں تمہارے لئے اس سے ڈرانیوالا اور خوشخبری دینے والا ہوں بخشش طلب

رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ یُؤۡتِ

کرو اپنے رب سے پھر توبہ کرو اس کی طرف تم کو نفع دے گا نفع خوب ایک مقررہ وقت تک اور دے گا

کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ ؕ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ

ہر صاحب فضل کو زیادتی اور اگر اعراض کرو تو میں ڈرتا ہوں تمہارے متعلق بڑے دن کے عذاب

کَبِیۡرٍ ﴿۳﴾ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴﴾

سے اللہ کی طرف تمہاری بازگشت ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے

رکوع نمبر ۱۷ محکم و مفصل اُحۡکِمَتۡ - یعنی آیاتِ قرآنیہ کا نظم محکم ہے کہ اس کی تمام آیتیں فصاحت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔ اور ان کی حق بیانی میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ اور اس کی مزید وضاحت تفسیر کی تیسری جلد ص۱۹۴ پر گذر چکی ہے۔ اور فُصِّلَتۡ سے مُراد یہ ہے کہ اس میں فرائض شرعی حلال و حرام کی تفصیل ہے یا یہ کہ امر و نہی کے لحاظ سے محکم اور وعدو وعید اور ثواب و عقاب کے لحاظ سے مفصل ہیں یا یہ کہ اجمال کے لحاظ سے مجموعی طور پر محکم ہیں اور موقع و محل کے اعتبار سے ایک ایک یا دو دو آیتیں تفصیل وار بھیجی گئیں۔ یا یہ کہ فصاحت و بلاغت و صدق بیانی میں محکم اور مقام نزول میں تفصیل دار ہیں۔ اور یہی آخری معنی سب معانی سے انسب ہے۔

یُمَتِّعۡکُمۡ - یعنی اگر توبہ کرو اور اچھے طریقہ سے رہو تو وہ تم پر عذاب نہ بھیجے گا اور دنیا میں ایک وقت مقرر تک تمہیں اپنی نعمات عطا کرے گا اور صاحبِ فضل کو زیادتی بھی دے گا۔ یعنی عمومی متاع دنیاوی میں سب برابر کے شریک ہوں گے اور اپنی محنت و کاوش کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فوقیت بھی ہوگی۔ اور ممکن ہے اعمالِ خیر کے لحاظ سے جنت میں زیادتی نعمات کی بشارت ہو۔ اور علامہ نے اس جگہ ذو فضل حضرت علی کو ثابت کیا ہے اور اس فقرہ کو حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ

آگاہ ہو تحقیق وہ سمیٹتے ہیں اپنے سینوں کو تاکہ چھپے رہیں اس سے خبردار جب ڈھانپ لیتے ہیں اپنے اوپر کپڑے تو اس وقت

يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵

بھی جانتا ہے وہ جو پوشیدہ کرتے ہیں اور وہ جو ظاہر کرتے ہیں تحقیق وہ دلوں کی باتوں کے جاننے والا ہے

کی دلیل قرار دیا ہے۔

تَوَلَّوْا ۔ غائب کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور ممکن ہے مخاطب کا صیغہ ہو۔ اور ایک تاء کو حذف کیا گیا ہو۔ جیسے تَنَزَّلُ میں ہے تو پھر فعل مضارع بنے گا۔

اَلَآ اِنَّهُمْ ۔ یعنی اپنے سینوں کو لپیٹتے ہیں۔ یعنی اپنی سازشوں کو سینہ میں بند رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ خدا سے چھپے رہیں یا مومنوں کو پتہ نہ چل جائے تو اس کے متعلق فرماتا ہے کہ جب یہ لوگ اپنے اوپر چادریں اور لحاف وغیرہ تان کر چھپ کر باتیں کریں تو خدا تو ان کو بھی جانتا ہے وہ تو سب ظاہر و پوشیدہ امور سے مطلع ہے کیونکہ وہ تو سینہ کی باتوں کو بھی جانتا ہے خواہ زبان پر بھی آئیں لہذا ان کی سازشیں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

پارہ ۱۲

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ

اور نہیں کوئی چلنے والا زمین پر مگر یہ کہ اللہ پر ہے اس کا رزق اور وہ جانتا ہے اس کی رہائش اور

مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

قرارگاہ سب کچھ لوح محفوظ میں موجود ہے اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور

وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ

زمین کو چھ دن میں اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزمائے کون تم میں

اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ

سے اچھے عمل کرتا ہے اور اگر تو (ان کو) کہے کہ تم اٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو کہیں گے وہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ

جو کافر ہیں نہیں ہے یہ مگر صاف جادو اور اگر ہم موخر کر دیں ان سے

رکوع نمبر ۱ - اللہ رازق ہے

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ - دابہ کا لغوی معنی ہے - ہر زمین پر چلنے والا اور اس مقام پر تمام زمین کی ذی روح مخلوق مراد ہے خواہ جن ہوں یا انسان پرندے ہوں یا چوپائے، درندے ہوں یا حشرات الارض اور خشکی میں رہنے والے ہوں یا دریاؤں کی موجوں اور سمندروں کی تہوں میں رہنے والے پس یہ سب مخلوق اپنے خالق کے دسترخوان پر ہر وقت مہمان ہے۔ اور وہ اس تمام کائنات کے رزق کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ وہ خود رزق دیتا ہے اور خود ہی تقسیم فرماتا ہے۔ امیر و غریب شاہ و گدا، عالم و جاہل، مومن کافر، خورد و کلاں، عابد و عاصی، اولیاء و انبیاء سب کے سب بلا استثناء اسی کا ہی رزق کھاتے ہیں۔ لہذا جو شخص کسی غیر کی طرف رزق کو منسوب کرے تو اگر مجاز یا تاویل مقصود نہ ہو تو اس آیت مجیدہ کی رو سے وہ شرک کا مرتکب ہو گا لہذا تشیع کی طرف منسوب ہوتے ہوئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں علیؑ یا آئمہ یا محمدؐ و آل محمدؐ رزق دیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ رازق خدا ہے اور یہ وسیلہ ہیں جیسے کہ بہت سی احادیث میں اس قسم کا مضمون موجود ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا پس اگر آل محمدؐ کی خلقت نہ ہوتی تو نہ کوئی مخلوق ہوتا اور نہ کوئی مرزوق ہوتا۔ یعنی لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ کا مفہوم مراد لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ خدا بالکل الگ تھلگ ہے اور خلق یا رزق یا دیگر صفات مخصوصہ الٰہیہ بلکہ نظام کائنات کے تمام تر محرک و ذمہ دار یہی ہیں۔ حتیٰ کہ بقول بعض جہال خدا ان کا محتاج ہے تو یہ کلمہ شرک و کفر و الحاد ہے۔ بنا بریں حاجت مند انسان کو اپنی حاجت صرف اللہ کے سامنے ہی پیش کرنی چاہیئے اور اسی سے ہی اپنی حاجت روائی

کی دعا کرے۔ زندگی وہی بڑھاتا ہے۔ موت اسی کے یدِ قدرت میں ہے۔ رزق کی کمی و بیشی اسی کے اختیار میں ہے۔ اولاد وہی دے سکتا ہے۔ بیماری یا تندرستی اسی کی جانب سے ہیں۔ کسی معاملہ میں فتح و نصرت کے اسباب اسی کی مہربانی سے مہیا ہو سکتے ہیں۔ بہرکیف سب نفع و نقصان کا مالک وہی ہے۔ اور چونکہ محمدؐ و آل محمدؐ اس کی تمام مخلوق میں سے بہتر و برتر اور سید و سردار ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں ان کی اس قدر قدر و منزلت ہے کہ انسان اس کا ادنیٰ سا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا انہی کے واسطہ اور وسیلہ سے دعا جلد مستجاب ہوا کرتی ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے تھے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی مجھے ضرورت ہو تو میں خدا سے مانگتا ہوں یہ اور اس قسم کی فرمائشات تاقیامت تمام انسانوں کے لئے ایک مینار ہدایت اور چراغ راہ ہیں کہ ان کو مدنظر رکھنے کے بعد کوئی انسان راہِ توحید سے بھٹک نہیں سکتا۔ آیت مجیدہ میں مستقر سے مراد باپ کی صلب اور مستودع سے مُراد ماں کا رحم ہے یا مستقر سے مراد جائے رہائش و سکونت اور مستودع سے مراد قبر اور جائے دفن ہے۔

آسمان و زمین کی خلقت

وَهُوَ الَّذِیْ۔ رزق کے بعد فوراً خلق کا مسئلہ بھی واضح فرمادیا کہ جو اللہ تمام کائنات کو رزق دے رہا ہے اس ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق فرمایا۔ یعنی اس کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ چیزوں کی پیدائش اسباب و ذرائع سے ہو تاکہ لوگ اس کو امر اتفاقی نہ قرار دیں ورنہ وہ چشم زدن میں بھی پیدا کرنے پر قادر تھا۔ اس مسئلہ کے متعلق تفسیر مذکور کی چھٹی جلد ص۱۱ و ص۲۲ میں اور اسی جلد کے سورہ یونس کے پہلے رکوع میں بھی بیان ہو چکا ہے ص۱۴۵۔ اور تفسیر جامع میں اس کی تاویل یہ بھی مذکور ہے کہ خداوند کریم نے جنات کو بروز ہفتہ (سنیچر) زمین کو بروز یکشنبہ (اتوار) زمین پر بسنے والی ذی روح مخلوق کو بروز دوشنبہ (سوموار) نباتات کو بروز سہ شنبہ (منگلوار)، پرندوں کو بروز چہار شنبہ (بدھوار) اور آسمانوں اور دیگر علوی مخلوق کو بروز پنجشنبہ (خمیس یا جمعرات) خلق فرمایا اور اس طرح چھ دنوں میں ان کی خلقت تمام ہوئی۔ اور پھر جمعہ کے روز حضرت آدم کو خلق فرمایا۔ گویا شمسی دور کی ابتدا بھی جمعہ کو ہوئی۔ کیونکہ عالم علوی کی خلقت جمعرات کو مکمل ہوئی۔ پس دورِ فلک کی ابتداء اور سورج کی گردش جمعہ سے ہی شروع ہوئی۔ اور اسی سے قبل ایام کی تعیین صرف سمجھانے کے لئے ہی ہے کہ اگر شمسی نظام ہوتا تو یوں کہا جا سکتا تھا۔ اب یہ کہنا کہ اس طرح سے ایجادِ خلق کیوں ہوئی۔ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہرکیف اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق فرمایا۔ اب کیوں یا کس طرح یا کیسے؟ تو اس کا علم وہ خود جانتا ہے جس نے ایسا کیا۔ اور یا وہ جانیں جن کو اس نے اس کا علم دیا۔

عرش خدا

وَكَانَ عَرْشُهٗ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پانی اور عرش پہلے تھے اور نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے جہاں ابتدائے خلق عالم کا واقعہ بیان فرمایا ہے اس میں بھی یہی ہے کہ خدا نے ہوا کو پیدا کیا جس نے پانی میں تلاطم پیدا کر کے ہوا بنائی اور وہ منجمد ہو کر زمین بنی۔ اور

اس کے بخارات اُڑکر آسمان بنے۔ آج کل کے محققین آسمان کو ایک ٹھوس جسم نہیں مانتے بلکہ جہت علو کا نام آسمان رکھتے ہیں۔ اور اس کی تائید قرآن مجید کی متعدد آیات میں بھی ہے۔ جیسے فرماتا ہے کہ ہم نے آسمان سے بارش برسائی۔ اور سورج اور چاند یا سیاروں کا آسمان میں چکر لگانا جہاں مذکور ہے۔ اس سے مراد ان کے جہت علو میں وہ مدارات ہیں جن پر اپنے خالق کی تدبیر محکم کے ماتحت ہمیشہ گردش کرتے نظر آتے ہیں کہ اس اپنے مدار سے ذرّہ بھر ادھر اُدھر نہیں ہوسکتے بلکہ آج کل کے انکشافات و تجربات بلکہ مشاہدات نے اس نظریہ کو ایک حقیقت ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک سے چاند تک راکٹ بھیجے جا رہے ہیں اور پچھلے دنوں کے اخبارات میں یہ خبر عام شائع ہوئی کہ امریکی راکٹ بھیجے جا رہے ہیں۔ بلکہ امریکی سائنسدان چاند پر اترے اور وہاں سے کچھ مٹی اٹھا بھی لائے اور ٹیلیویژن میں بھی لوگوں نے انکو چاند پر چلتے پھرتے بھی دیکھا پھر زہرہ پر راکٹ کا اُترنا بھی اخبارات نے بتایا۔ اور ساتھ ساتھ یہ پیشین گوئی بھی ہوئی کہ مستقبل قریب میں انسان بردار جہاز بھی وہاں پہنچے گا۔ لہٰذا ان تحقیقات کی بنا پر افلاک کے خرق و التیام کے محال ہونے کا مسئلہ ایک فرسودہ خیال سے زیادہ کوئی وقعت و اہمیت نہیں رکھتا۔ اور جناب رسالتمآبؐ کے معراج کے متعلق شکوک و شبہات کی سب سے بڑی حصار بھی (مسئلہ خرق والتیام) خود بخود منہدم ہوگئی۔ اور انسان نے اپنی حدودِ امکان تک بلندیوں کو سر کر کے جناب رسالتمآبؐ کے معراج پر ایمان لانے کی راہیں ہموار کر دیں کہ اگر ایک عام انسان کوشش و محنت سے آسمانوں کی بلندیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور چاند و زہرہ پر ڈیرہ ڈال سکتا ہے تو چرخ چہارم تک عیسٰے کا جانا یا قاب قوسین او ادنیٰ کے مقام تک حبیبِ خدا کا جانا جب کہ لے جانے والا خود وہی تھا، کیسے بعید از عقل قرار دیا جا سکتا ہے۔

چونکہ باقی سب کائنات کی خلقت کی ابتدا پانی سے ہوئی تو عرش کا پانی کے اُوپر ہونے کا مقصد شاید یہ ہو کہ خدا کی سلطنت و حکومت اس پر محیط و غالب ہے اور انسان جتنا ترقی کر کے عروج کرے وہ اس پانی سے اُٹھنے والے غبارات تک ہی پہنچے گا۔ اور ان تمام حدود کو طے کر کے عرشِ خداوندی تک پہنچنا اس کے بس سے باہر ہے۔ ہاں وہاں تک وہی جا سکتا ہے جسے وہ خود لے جائے۔

لِیَبْلُوَکُمْ۔ یعنی اس تمام مخلوق کو پیدا کر کے تمہیں پیدا کیا اور عقل و شعور عطا کیا تاکہ تم میں سے احسان شناسوں اور احسان فراموشوں کا فرق ہو اور تمہاری آزمائش کی خاطر نہیں نیک و بد کے اختیار میں مجبور نہیں کیا۔

لَئِنْ قُلْتَ۔ یعنی یہ لوگ اس قدر غافل اور سرکش ہیں کہ ان سے اگر کہا جائے کہ تمہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو باور ہی نہیں کرتے حالانکہ اگر ذرّہ بھر تامل کرتے تو انہیں آسانی سے پتہ چل سکتا تھا کہ جو خدا اس قدر بڑے نظام کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا تو اس قدر مشکل نہیں ہے۔ اور اس ساری تفہیم کے بعد بھی وہ عقل کے اندھے کہہ دیتے ہیں کہ حضور جادو کی سی بات کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح اس میں حقیقت نہیں ہوتی بلکہ صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے حشر و نشر کی باتوں کو وہ اسی طرح ایک بے حقیقت امر ٹھہراتے ہوئے اپنے نفسوں کو دھوکا دیتے ہیں

الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ

عذاب کو ایک وقتِ معین تک تو کہیں گے کس نے اس کو روکا ہے ؟ خبردار جس دن آئے گا تو

لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٨﴾

نہ روکا جائے گا ان سے اور اترے گا ان پر وہ جس کے ساتھ مسخری کرتے ہیں

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ﴿٩﴾

اور اگر ہم چکھائیں انسان کو اپنی رحمت (کا مزا) پھر چھین لیں اس سے تو وہ مایوس و منکر ہوتا ہے

أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ ۔ قرآن مجید میں اُمّت کا اطلاق، معانی میں وارد ہوا ہے (۱) مذہب جیسے فرماتا ہے کَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً یعنی لوگ ایک مذہب پر تھے (۲) جماعت جیسے فرماتا ہے وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ ۔ یعنی وہاں دیکھا کہ لوگوں کی ایک جماعت پانی لے رہی تھی (۳) ایک فرد جیسے إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً ۔ تحقیق ابراہیم ایک اُمّت تھا ۔ (۴) قوم جیسے إِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۔ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو ۔ (۵) اُمتِ محمدیؐ جیسے أَرْسَلْنَاكَ إِلَىٰ أُمَّةٍ ہم نے تجھے ایک اُمت کی طرف بھیجا (۶) وقت جیسے وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ ۔ یعنی اس نے ایک عرصہ اور وقت کے بعد یاد کیا (۷) خلق جیسے تَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً تمام خلق کو وہاں پڑا دیکھو گے ۔

اس مقام پر اُمّت کا معنی وقت بھی لیا گیا ہے ۔ اور مقصد یہ ہے کہ اگر ہم نے ان لوگوں کو ایک وقت معین تک مہلت دے دی تو کہنے لگتے ہیں کہ تمہارا عذاب کہاں گیا ۔ اس کو کس نے روک رکھا ہے ؟ یعنی عجلت عذاب کے خواہاں ہوتے ہیں ۔ اور استہزاء کرتے ہیں ۔ اور اُمت کا معنی یہاں جماعت بھی کیا گیا ہے ۔ اور تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمدؐ باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس سے مُراد حضرت مہدی علیہ السّلام کے وہ اصحاب ہیں جن کی تعداد اصحاب بدر کے برابر یعنی ۳۱۳ ہو گی ۔ اور موسم خریف کے بادلوں کی طرح فوراً ایک جا ہو جائیں گے ۔ اور تفسیر جامع میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت مجیدہ کا معنی یہ منقول ہے کہ اگر ان منافقوں اور کافروں کے عذاب کو ہم تا ظہور قائم آلِ محمدؐ مؤخر کرتے ہیں تو یہ لوگ ازراہِ تمسخر و استہزا کہتے ہیں کس چیز نے اس کو روک رکھا ہے اور وہ کیوں ظہور نہیں کرتا ۔ بے شک آئے اور ہمیں سزا دے اور ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ کسی قائم کا وجود نہیں ہے ۔ لہٰذا انتظار کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ پس خدا ایسے لوگوں کو متنبہ فرماتا ہے کہ جب وہ آئے گا تو پھر عذاب خدا سے بچنے کا کوئی سہارا نہ ہو گا ۔ اور جس چیز کا تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اس کا وبال ان کو اپنے احاطہ میں لے لے گا ۔

رکوع نمبر ۲ ۔ صبر و شکر

وَلَئِنْ ۔ انسان کا عام دستور ہے کہ جب خوش حالی کے بعد خدا اس سے کوئی نعمت لے لے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے ۔ یعنی صبر نہیں کرتا اور جب دکھ کے بعد خدا اس کو آرام عطا

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ

اور اگر چکھائیں اس کو سکھ (کا مزا) بعد دکھ پہنچنے کے تو کہتا ہے گئی سختیاں مجھ سے تحقیق

اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ⑩ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

وہ خوش خوش اکڑتا ہے سوائے ان کے جنہوں نے صبر کیا اور عمل نیک کئے ایسوں کے لئے

مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑪ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ

مغفرت اور بڑا اجر ہے پس شاید تو چھوڑنے والا ہے بعض اس کو جو وحی کی گئی تیرے لئے اور

بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ

تیرا دل تنگ ہوا ہے اس سے کہ کہتے ہیں کیوں نہیں اُتارا گیا اس پر خزانہ یا یہ کہ (کیوں نہیں) آیا ساتھ اس کے فرشتہ؟

زبانِ تو شکر نہیں کرتا بلکہ زیادہ اکڑتا اور لوگوں کے سامنے فخر کرتا پھرتا ہے۔ ہاں ایسے خدا کے بندے بھی موجود ہیں جو مصیبت کے وقت بجائے مایوسی کے صبر کرتے ہیں۔ اور راحت کے وقت بجائے اکڑنے کے شکر کرتے ہیں۔ پس انہی کے لئے اجر کبیر ہے۔ میں نے مواعظ کی ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی عابد کی تلاش میں نکلے۔ ایک عابد کے ہاں پہنچے پھر دوسرے عابد کے پاس گئے اور اُس نے بڑے عابد کا پتہ دیا۔ جب اس کے پاس پہنچے تو دیکھا وہ ایک لوہار ہے جو اپنی حلال کمائی میں مشغول ہے اور زبان پر شکرِ پروردگار جاری ہے۔ موسیٰ نے پوچھا۔ تیری زیادتی عبادت کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا حلال رزق کماتا ہوں اور واجبات ادا کرتا ہوں۔ دکان کی آمدنی میں سے ایک حصہ مالک کو دوسرا حصہ بچوں کے لئے اور تیسرا حصہ فی سبیل اللہ مساکین کو دیا کرتا ہوں۔ پس اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوں سختی پر صبر کرتا ہوں اور نعمت پر شکر کرتا ہوں آمدنی کم ہوجائے تو گھبراہٹ و مایوسی کا اظہار نہیں کرتا اور زیادہ ہوجائے تو اتراتا اور اکڑتا نہیں ہوں۔ اُس نے پوچھا آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ تو جواب دیا کہ موسیٰ بن عمران کے وطن سے تو اُس نے کہا کہ گھر جانے کا کیا خیال ہے۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا۔ جانا چاہتا ہوں تو اُس نے ایک بادل کو حکم کیا وہ فوراً حاضر ہوا۔ اور پوچھا کہاں برسے گا۔ تو اُس نے جواب دیا کہ فلاں جگہ پر۔ پھر اس کو روانہ کرکے دوسرے کو بلایا۔ پھر تیسرے کو آخر ایک نے کہا کہ میں موسیٰ کے ملک پر جاؤں گا تو عابد نے حضرت موسیٰ کو سوار کرکے روانہ کیا۔ جب آپ کوہ طور پر پہنچے تو عرض کی۔ اے پروردگار! تجھے اس لوہار کی کونسی عادت پسند آئی۔ ارشاد ہوا کہ وہ میری قضا پر راضی۔ میری آزمائش پر صابر اور نعمتوں پر شاکر ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی کا مضمون وارد ہے کہ مَنْ لَمْ یَصْبِرْ عَلٰی بَلَائِیْ وَلَمْ یَشْکُرْ عَلٰی نَعْمَائِیْ وَلَمْ یَرْضَ بِقَضَائِیْ فَلْیَخْرُجْ مِنْ اَرْضِیْ وَسَمَائِیْ وَلْیَعْبُدْ رَبًّا سِوَائِیْ۔ یعنی جو شخص میری قضا پر راضی نہ ہو۔ میری آزمائش پر صبر نہ کرے اور میری نعمتوں کا شکر نہ کرے تو میری زمین سے نکل جائے اور کوئی دوسرا خدا تلاش کرے۔

إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ وَكِيلٌ ﴿١٢﴾ أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ

تحقیق تو صرف ڈرانیوالا ہے اور اللہ ہر شے کا نگہبان ہے کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے افترا باندھا ہے

قُلْ فَأْتُوا۟ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِۦ مُفْتَرَيَٰتٍ وَٱدْعُوا۟ مَنِ ٱسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ

تو کہدو کہ لے آؤ تم بھی دس ایسی سورتیں افترا باندھ کر اور بلالو ان کو جن کو بلا سکتے ہو سوائے اللہ کے

ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿١٣﴾ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا۟ لَكُمْ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّمَآ

اگر سچے ہو پس اگر قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ اُتارا گیا ہے

أُنزِلَ بِعِلْمِ ٱللَّهِ وَأَن لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٤﴾

اللہ کے علم سے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں کیا تم مانتے ہو ؟

اَمْ يَقُوْلُوْنَ۔ اس کے شانِ نزول کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ بعض قریش حاضر بارگاہ نبوی ہوئے اور عرض کی کہ اگر آپ سچ مچ اللہ کے رسول ہیں تو دعا کریں کہ مکہ کے پہاڑ سونا بن جائیں اور فرشتے اُتر کر آپ کی نبوت کی گواہی دیں۔ پس آپ کی تسکینِ خاطر کے لئے یہ آیت اُتری۔

پیغام ولایت اور دعائے پیغمبر

تفسیر جامع اور مجمع البیان میں بروایت عیاشی امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ حضرت رسالت مآبؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ تجھے میرا بھائی قرار دے اور یہ کہ تجھے میرا وصی و خلیفہ بنائے تو خدا نے میری دُعا کو مستجاب فرمایا اور تجھے میرا وصی و خلیفہ اور بھائی قرار دیا تو بعض جہلاء کہنے لگے کھجور کا ایک صاع اس سے بہتر ہے جو محمدؐ نے خدا سے طلب کیا ہے۔ خدا سے ملک اور خزانہ مانگنا چاہیئے تھا نہ کہ یہ جو مانگا ہے۔ پس یہ آیت اُتری کہ آپ دل تنگ نہ ہوں۔

تفسیر جامع میں بروایت کافی ابن ارقم سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر مکہ میں جبریل ولایت علی کا حکم لایا تو حضور نے خوف ظاہر کیا کہ لوگ تکذیب کریں گے۔ پس جبریل دوبارہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ آپ کیوں تاخیر فرماتے ہیں تو حضور نے جواب دیا کہ لوگوں کی ذہنیت اس قدر پست ہے کہ مجھے ان سے تکذیب کا خطرہ ہے۔ پس کچھ دیر کے بعد جبریل سورہ ہود کی دس آیتیں لایا فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ سے لے کر اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تک۔ اور یہ حدیث امالی بن بابویہ میں بھی منقول ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ۔ تفسیر جامع میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ولایت کا حکم حضور نے اپنی مرضی سے دیا ہے تو یہ آیت مجیدہ ان کی تردید کے لئے اُتری۔ اور یہ بھی منقول ہے کہ قرآن کو کلام پیغمبرؐ کہنے والوں اور رسول

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ

جو چاہتا ہو زندگانی دنیا اور اس کی زینت تو پورا (بدلہ) دیں گے ان کو ان کے اعمال کا اس میں اور وہ اس

فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ

میں نہ خسارہ دیے جائیں گے ایسوں کا نہیں آخرت میں مگر جہنم اور

پر افترا کا الزام تراشنے والوں کو چیلنج ہے کہ اگر رسول نے اپنی طرف سے یہ کلام پیش کیا ہے تو تم بھی اہل لسان ہو۔ اس جیسا پورا قرآن نہ سہی۔ اس جیسی دس سورتیں تو لے آؤ۔ اور اپنے تمام فصحا و بلغاء کو اور اپنے نام نہاد خداؤں کو بھی بلا لو۔ پس اس سب کاوش و کوشش کے باوجود بھی اگر قرآن جیسی دس سورتیں (بلکہ تحدی بالائے تحدی کی بنا پر ایک سورہ کا چیلنج بھی کیا جیسا کہ سورہ یونس کی آیت نمبر ۳۸ میں گذرا ہے) بھی نہ لا سکو تو سمجھ جاؤ کہ بشر کا کلام نہیں ورنہ تم اس کے مقابلہ سے عاجز نہ ہوتے۔ پس تمہارا مقابلہ سے عاجز آ جانا اس کے کلام خدا ہونے کی اٹل دلیل ہے۔

مومن کا انجام مَنْ كَانَ۔ اس آیت کے مصداق تمام وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے اعمال اس قابل نہ ہوں کہ وہ جنت میں جا سکیں اس لئے کہ ان کا اعتقاد درست نہ تھا۔ پس کافر مشرک منافق وغیرہ اگر صدقہ خیرات یا صلہ رحمی یا غریب پروری یا رفاہِ عامہ کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ اور انسانی خدمات کو خلوص سے بجا لائیں تو چونکہ ان کا ایمان درست نہیں ہے لہذا خدا اپنی عدالت کے پیش نظر ان کو دنیا میں بدلہ دے گا۔ مثلاً وسعتِ رزق، کثرت اولاد جاہ و عزت، مال و دولت صحت و تندرستی، عیش و آرام اور طول عمر وغیرہ اور اگر کسی کی نیکیاں زیادہ ہوں گی تو قیامت میں ان کے دائمی عذاب میں یک گونہ کمی کر دی جائے گی۔ بہرکیف جنت میں نہیں جا سکے گا۔ اور ریاکاری والے اعمال کا بھی یہی حال ہے۔ اور حدیث نبوی میں بھی ہے کہ جو دنیا میں ریا کے لئے عمل کرے گا اُس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو گا اور حبطِ اعمال کا یہی مقصد ہے کہ اُن کے اعمال کی جزا جنت نہیں قرار دی جائے گی جب کہ ایمان کی صورت میں وہ اعمال جنت کی کلید ہوتے اور ہم نے حبط اور ضبط کے درمیان فرق تفسیر کے مقدمہ میں ص۲۳۵ پر ایک عنوان مستقل کے ماتحت مفصل بیان کیا ہے جو کافی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ لہذا اس کا مطالعہ کر کے مقصد کو خوب سمجھیئے اور خلاصہ یہ کہ ضبط کا معنی یہ ہوتا ہے کہ عمل عمل ہو اور اس کی جزا کو ضبط کیا جائے اور یہ صفت خدا میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عدل کے منافی ہے۔ اور حبط کا معنی یہ ہے کہ عمل وہ عمل ہی نہیں جو جزا کے قابل تھا۔ کیونکہ عمل کے ساتھ شرائط تھیں۔ مثلاً ایمان اور خاتمہ بالخیر ہونا اور ریاکار نہ ہونا اور خلوص وغیرہ۔ پس ان شرائط کی عدم موجودگی میں وہ عمل گویا عمل ہی نہ رہا۔ جو آخرت میں جزا کے قابل ہوتا۔ پس دنیا میں اس کو اس کی محنت و کاوش کا بدلہ پورا ملے گا۔ چنانچہ تفسیر مجمع البیان میں مروی ہے کہ ایک صحابی نے ایک عورت کی طرف دست درازی کی اور نیتِ بد سے اس کا تعاقب کیا تو راستہ میں اس کی پیشانی پر دیوار کے ٹکرانے سے چوٹ لگی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ خدا نے تجھے تیرے گناہ کی سزا دنیا میں دے دی۔ کیونکہ جب

وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾ أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ

برباد ہوگا وہ جو کیا دنیا میں اور باطل ہوئے وہ جو عمل کرتے تھے کیا جو شخص ایک برہان پر ہو

بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً

اپنے رب سے اور اس کے پیچھے اُسی سے شاہد بھی موجود ہو حالانکہ اس سے پہلے کتاب موسیٰ بھی گذری جو امام و رحمت تھے

خدا انسان کو آخرت میں مبتلائے عذاب کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے دنیا کی سزا کو روک لیتا ہے اور جب آخرت میں اس کو جنت دینا چاہتا ہے تو گناہوں کی سزا اس کو دنیا میں دے دیتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کافر کو اپنے اچھے اعمال کی جزا دنیا میں مل جاتی ہے۔ اور آخرت میں کورا ہو کر صرف استحقاق جہنم لے کر جاتا ہے اور خَفَّتْ مَوَازِينُهُ کا یہی مطلب ہے۔ اور مومن کو بداعمالیوں کی سزا دنیا میں مل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ روایات میں ہے مومن کو اگر کانٹا چبھے یا چوٹ لگے یا جسمانی و روحانی کوئی تکلیف پہنچے یا مال و اولاد کا کوئی صدمہ ملے تو یہ اس کے بعض گناہوں کا کفارہ ہوا کرتا ہے اور بعض ایسے گناہ ہوا کرتے ہیں جن کا کفارہ بے گناہ قتل ہو جانے سے ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کے ذمہ کچھ گناہ رہ جائیں تو مرت کی سختی اس کا کفارہ بن جاتی ہے اور اس سے بھی بچیں گے تو قبر میں ان کی سزا مل جائے گی۔ بہر کیف خدا چاہتا ہے کہ مومن جب قیامت کو میدان حشر میں آئے تو اس کے اعمال میں نیکیوں کی کثرت ہو۔ اور بے حساب جنت میں جائے اور اگر برائیوں کی زیادتی کی وجہ سے کچھ باقی ہوں گے تو حساب و کتاب تک ان کا قصہ پاک ہو جائے گا اور خالص نیکیاں لے کر جنت میں جائے گا اور اَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ کا یہی مطلب ہے جیسا کہ ایک سابق حدیث نبوی بھی اسی مضمون کی شاہد ہے۔

بہرکیف مومنین کو اپنے گناہوں کی کثرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ خداوند کریم کے فضل و کرم سے بعید ہے کہ مومن کو جہنم میں ڈالے وہ شخص جس نے دنیا میں لادینیت کے ہمہ گیر طوفان کا سینہ تن کر مقابلہ کرتے ہوئے دین کا پرچم بلند رکھا ہو۔ وہ شخص جس نے دہریت اور الحاد کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہو کر توحید پرستی کی دعوت دی ہو۔ وہ شخص جس نے اس کی کتاب قرآن اور اس کے انبیاء و اولیا سے اپنا معبود حقیقی سمجھ کر کلمہ توحید زبان پر جاری کیا ہو۔ وہ شخص جس نے اس کی کتاب قرآن اور اس کے انبیاء و اولیاء کے نام و نشان کی بقا کی خاطر دنیاوی ہر قسم کے مصائب کو برداشت کرتے ہوئے زندگی کے لمحات کو خوشیوں، عیاشیوں اور رنگ رلیوں سے الگ رکھا ہو۔ اگر ایسے شخص سے کسی وقت یا بسا اوقات لغزشیں بھی سرزد ہوتی رہی ہوں جو اس کے دین سے بغاوت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی کوتاہیوں کا احساس کرتے ہوئے تو وہ عالم الغیب عادل و حکیم کیسے اس کے خلوص کو نظر انداز فرما کر فروعی لغزشوں کی خاطر اس کو جہنم کے دائمی جیل خانہ میں بھیجے گا۔ ہاں اس کے رحم و کرم اور فضل و عطا سے توقع یہ ہے کہ وہ مومن کی دنیاوی تکالیف کو اس کے گناہوں کا عوضہ قرار دے گا۔ اور آخرت میں اُسے جنت الفردوس میں جگہ دے گا۔ پس تمام اہل ایمان ایسے رحیم و کریم خدا کے سامنے نعمتِ ایمان کا شکر ادا کرتے ہوئے

أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ

وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر اور جو انکار کرے گا اس کا لوگوں میں سے تو جہنم اس کا ٹھکانا ہوگا پس نہ ہو شک

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

میں اس سے تحقیق وہ حق ہے تیرے رب سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے

اپنے گناہوں سے توبہ کی کوشش کریں اور مجھ گنہگار کے لئے بھی دعائے خیر فرماویں۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ۔ وہ دلیل و برہان جو حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کردے وہ بیّنہ ہے ہمزۂ استفہام سوال کے لئے نہیں بلکہ تقریر کے لئے اور بات کو پکا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مَن موصولہ ہے اور کَان اس کا صلہ ہے۔ اور يَتْلُو کا عطف کَان پر ہوگا اگر اس کو کَان تامہ قرار دیا جائے ورنہ عَلٰى بَيِّنَةٍ کے متعلق پر ہوگا۔ اور اس کے بعد کتاب کا عطف شاہد پر ہوگا یعنی يَتْلُوْهُ كِتَابُ مُوْسٰى۔ اور اِمَامًا وَّرَحْمَةً دونوں حال ہیں اور ان کا ذوالحال کتاب موسٰی ہوگا۔ پس موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مبتدا ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَعَلَى الْاَوْصَافِ الْمَذْكُوْرَةِ كَمَنْ لَيْسَ عَلٰى بَيِّنَةٍ۔ یعنی جو شخص ایک واضح برہان پر ہو۔ یعنی قرآن مجید جیسی کتاب اس کے پاس ہو۔ اور اس کے پیچھے خود اسی سے اس کا شاہد بھی موجود ہو۔ اور اس سے پہلے موسٰی کی کتاب تورات بھی شہادت دے چکی ہو جو لائق اقتدا اور باعث رحمت تھی اور یہ اس پر ایمان رکھتے ہوں تو یہ ان کی مثل قرار دئے جاسکتے ہیں۔ جن کے پاس کوئی برہان و دلیل نہ ہو اور نہ کوئی ان کا شاہد ہو۔

يَتْلُوْهُ۔ میں اگر ضمیر غائب کا مرجع مَن ہو تو معنی یہ ہوگا کہ صاحب برہان کے پیچھے اس کا شاہد اُسی سے موجود ہے۔ برہان و بینہ سے مراد قرآن مجید اور صاحب بیّنہ حضرت محمد مصطفےٰؐ ہوں گے اور اگر ضمیر غائب کا مرجع بینہ کو قرار دیا جائے۔ اس لحاظ سے کہ بیّنہ کو برہان کی تاویل میں لیا جائے تاکہ ضمیر و مرجع میں مطابقت پیدا ہوجائے تو معنی یہ ہوگا کہ محمد مصطفےٰؐ بینہ و برہان پر ہیں جو قرآن ہے اور اس کی تلاوت کرتا ہے جو اس کا شاہد اُسی سے ہے۔

حضرت علیؑ رسول کا شاہد ہے

شَاهِدٌ مِّنْهُ۔ یعنی وہ شاہد جو صاحب بیّنہ میں سے ہو تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السّلام اور امام علی رضا علیہ السّلام سے منقول ہے کہ اس آیت میں شاہد سے مراد حضرت علی ہیں اور علامہ حلّی نے ذکر کیا ہے کہ جمہور نے یعنی اہل سنّت نے بھی اس مقام پر شاہد سے مراد حضرت علی کو لیا ہے۔ لہٰذا یہ آیت مجیدہ حضرت علی علیہ السّلام کی خلافت پر نص ہے اور فضل بن رُوزبہان نے اہل سنّت کی تفسیروں میں اس حوالہ کا موجود ہونا تسلیم نہیں کیا لیکن دلائل الصدق ج ۲ صفحہ میں اسے تفاسیر اہل سنّت سے ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ کہ فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں شاہد کے معنی کے متعلق چند وجوہ ذکر کئے ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ بیان کی کہ اس سے مراد حضرت علیؑ

ہیں۔ اور ضمیرِ غائب کا مرجع بیّنہ بتاویل برہان ہے) اور وہ اس بیّنہ کی تلاوت کرتے ہیں (اور منہ میں ضمیر غائب کا مرجع مَن ہے) یعنی وہ شاہد محمد سے ہے اور اس کی جز ہے اور اس میں شاہد کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ وہ محمد کی جزو ہے۔ اور سیوطی نے درِ منثور میں حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کوئی قریشی ایسا نہیں جس کے حق میں قرآن کا کچھ حصہ نہ اترا ہو تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ حضور آپ کے حق میں بھی کچھ اترا ہے ؟ تو آپ نے فرمایا تو نے سورہ ہود کی یہ آیت نہیں پڑھی۔ اَفَمَنْ كَانَ الاٰیۃ۔ جناب رسالت مآب بیّنہ پر تھے۔ اور میں اس کا شاہد ہوں۔ اور اسی طرح طبری سے بھی منقول ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ آیت چار وجوہ کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر دلالت کرتی ہے۔

(۱) آیت مجیدہ میں حضرت علی کو شاہد کہا گیا ہے اور شاہد سے مراد ہے اُمت پر شاہد ہونا اس قرینہ سے کہ آپ رسول کے تالی ہیں جس طرح حضور کو ایک مقام پر شاہد کہا گیا ہے (اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا) اور باقی انبیاء کے متعلق کہا گیا ہے (وَجَعَلْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ) یعنی ہم نے ہر اُمت کا شہید ان کے نفسوں سے بنایا اور تجھے ان لوگوں پر شہید بنایا۔ اور اس سے لوگوں کے اُمور میں ولایت و حکومت شرعی ثابت ہوتی ہے لہذا حضرت علی کو شاہد کہنا لوگوں کے اُمور پر اس کی ولایت کو ثابت کرتا ہے اور یہی خلافت کا مفہوم ہے (۲) آیت مجیدہ میں علی کو رسول کا بعض کہا گیا کہ وہ شاہد اُس سے ہے جیسے خود پیغمبر نے بھی اس کی تائید اپنے الفاظ میں یوں فرمائی (عَلِيٌّ مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْهُ) اور یہ چیز عصمت فضل اور تمام صفاتِ حمیدہ میں رسول کے ساتھ علی کی مشارکت کو ثابت کرتی ہے۔ پس علی ہی رسول کی خلافت کے حقدار ثابت ہوتے ہیں۔ (۳) آیت مجیدہ میں علی کو رسول کا "تالی" کہا گیا ہے جیسے کہ ضمیر مذکر کا مرجع کے ساتھ تطابق کا تقاضا ہے اور تالی ہونے سے مراد بلافصل پیچھے چلنا ہے اور اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ۱۔ یہ کہ ان کے قائم مقام ہوں (۲) یہ کہ اس کی طرح یہ بھی بیّنہ پر ہوں ۳۔ یہ کہ اس کی دعوت میں یہ ان کے معاون و مددگار رہوں۔ جیسے حضورؐ نے خود فرمایا کہ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ میری کمر کو مضبوط کرے علی کی مدد سے اور علی کو میرا شریکِ کار بنائے اور خدا نے ان کی دعا کو مستجاب فرمایا۔ پس علی کی مثال نبی سے ایسی ہے جیسی ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ پس پہلی صورت میں خلافت ثابت ہو گئی۔ اور دوسری صورت میں جب علی رسول کی طرح بیّنہ پر ہیں تو اس کا لازمی مطلب اور نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بعد ان کے قائم مقام بھی یہی ہوں گے۔ اور تیسری صورت میں جب نص قرآن سے علی ہی رسول کے مشن میں ان کے ناصر و معاون ہیں جیسے موسےٰ کے لئے ہارون تھے تو دوسرے صفت میں اولیٰ ثابت ہو گئے (۴) اگر یہ کہا جائے کہ ضمیر کا مرجع بیّنہ ہے جیسے گذر چکا ہے تو مقصد یہ ہو گا کہ علی ہی وہ ذات ہے جو حضرت محمد مصطفےٰ کی شہادت قرآن مجید کی تلاوت سے فرماتے تھے تو ان کو جناب رسالت مآب کا دوسرا معجزہ قرار دیا گیا کہ ان کا پہلا معجزہ ہے بیّنہ اور دوسرا معجزہ ہے وہ شاہد جو بیّنہ کی تلاوت کرتا ہے۔ پس حضرت علی علیہ السلام کی تمام صحابہ سے افضل ہونے کی یہ دلیل ہے لہذا وہ ہی خلافت کے اہل و سزاوار ہو سکتے ہیں (دلائل الصدق)

اِمَامًا وَّرَحْمَةً ان کو کتاب موسےٰ سے حال قرار دیا گیا ہے اور معنی یہ کہ کتاب موسےٰ امام و رحمت تھی اور ممکن ہے کہ موسیٰ

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی

اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افترا باندھے اللہ پر جھوٹا ایسے لوگ پیش کئے جائیں گے اپنے

رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ

رب پر اور کہیں گے گواہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جھٹلایا اپنے رب کو خبردار اللہ کی

اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ

لعنت ہے ظالموں پر جو روکتے ہیں راہِ خدا سے اور کج بحثی کرتے ہیں اس میں

سے حال ہوں اور معنی یہ ہو کہ حضرت موسٰے اپنی اُمّت کے لئے امام اور باعثِ رحمت تھے۔ اور حضرت علی کی شہادت کے بعد تورات کی شہادت کو تائید کے لئے پیش کیا گیا۔ یعنی رسول کے شاہد ہونے میں حضرت علیؑ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور حضرت موسٰے کی کتاب کی شہادت کو تائید کے لئے پیش کیا گیا۔ یعنی رسول اللہؐ کے صادق و برحق ہونیکے شاہد تورات کے وہ بیانات ہیں جن میں حضرت موسیٰ کو حضورؐ کی آمد کی خبر دی گئی تھی اور موسیٰ نے اُمّت کو پیشین گوئی کی تھی۔ چنانچہ جن یہودیوں نے اسلام کو قبول کیا تھا اس کی زیادہ تر وجہ تورات کی پیشین گوئیاں تھیں جن میں حضرت رسالت مآبؐ کے اوصاف تک درج تھے۔

اَلْاَحْزَابِ [۱۱] ۔ اس جگہ احزاب سے مراد مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ حضور نے فرمایا تھا کہ لوگوں میں سے جس کے کانوں میں میری دعوت پہنچے گی۔ اور وہ ایمان نہ لائے گا خواہ یہودی ہو یا نصرانی تو وہ اصحاب نار سے ہوگا۔ احزاب جمع ہے حزب کی۔

فَلَا تَكُ فِیْ مِرْيَةٍ [۱۹] ۔ یہ بھی خطاب حضورؐ کی طرف ہے اور مراد ساری اُمّت ہے۔

تفسیر جامع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام سے مروی ہے کہ خدا نے لوگوں پر پانچ چیزیں واجب کی تھیں۔ انہوں نے چار کو لے لیا اور پانچویں کو چھوڑ دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا وہ کونسی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ لیکن وہ پانچویں جس کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے وہ ہے ولایت علی بن ابی طالب۔ صحابہ نے عرض کی حضور علی کی ولایت خداوند کریم کی جانب سے ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں! اور پھر اس سے اگلی آیت آپ نے تلاوت فرمائی۔ بہرکیف روایات خاصہ و عامہ سے ثابت ہے کہ یہاں شاہد سے مراد حضرت علی ہے پس آیت مجیدہ آپ کی خلافت پر نص ہے۔

يُعْرَضُوْنَ ۔ یعنی اللہ پر افترا باندھنے والوں کو جب پیش کیا جائے گا تو اشہاد کہیں گے۔ یہ یا تو شاہد کی جمع ہے جیسے صاحب کی جمع اصحاب اور یا شہید کی جمع ہے جیسے شریف کی جمع اشراف کہ انہوں نے جھٹلایا تھا اپنے رب کو یعنی اپنے رب کے رسول کو۔ اشہاد سے مراد کراماً کاتبین یا انبیاء لئے گئے ہیں لیکن تفسیر جامع میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ اس سے مراد آئمہ طاہرین ہیں جو اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں پر شاہد ہوں گے

يَبْغُوْنَهَا ۔ یعنی دین حق پر جرح کرکے اور اس میں خواہ مخواہ کے اعتراضات کرکے اس کو لوگوں کی نظروں میں ٹیڑھا اور غلط

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي

اور وہ آخرت سے انکاری ہیں ایسے لوگ نہیں ہمیں عاجز کرنے والے زمین

الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ

میں اور نہیں ہوگا ان کا کوئی اللہ کے سوا مددگار چند در چند کیا جائے گا ان کا عذاب

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

کیونکہ سن سکتے تھے (لیکن نہ سنتے تھے) اور دیکھ سکتے تھے لیکن) نہیں دیکھتے تھے ان لوگوں نے

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ

خسارہ میں ڈالا اپنے آپ کو اور ضائع ہوا اُن سے وہ جو افترا باندھتے تھے لاریب وہی

اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

آخرت میں خسارہ پانے والے ہوں گے تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل نیک

الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

کئے اور جھکے اپنے رب کی طرف وہ لوگ جنتی ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں۔

مُعْجِزِيْنَ ۔ یعنی یہ لوگ ہمیں عاجز نہیں کرسکتے وہ زمین کے جس گوشے میں ہوں گے ہم آخر ان کو گرفتار کریں گے۔

يُضٰعَفُ ۔ یعنی ایک عذاب کفر کا ہوگا اور اس کے اُوپر فروعات میں نافرمانی کا عذاب بھی ان کو ہوگا۔ یا یہ مقصد ہے کہ قسم قسم کا عذاب ان کو دیا جائے گا۔

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۔ اس کا ایک معنی تو یہی ہے جو تحت اللفظ موجود ہے گویا باء جارہ تعلیلیہ محذوف ہے۔ اصل میں تھا بِمَا كَانُوْا الاٰية۔ یا یہ کہ ما کو نافیہ قرار دیا جائے کہ چونکہ وہ ان قوتوں کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ گویا وہ بہرے اور اندھے ہیں یا یہ کہ مادام کے معنے میں ہو اور مقصد یہ کہ وہ معذب رہیں گے ہمیشہ۔ یعنی جب تک سنتے اور دیکھتے رہیں گے۔ یعنی جیتے رہیں گے اور تفسیر جامع میں ان کی تاویل دشمنان آل محمدؐ کے حق میں ہے۔

وَاَخْبَتُوْا ۔ یہ خبت سے ہے جس کا معنی ہے برابر ہونا۔ اور اخبات کا معنی اطمینان کا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی بات سے مطمئن ہوں۔ تفسیر جامع میں زید شحّام سے مروی ہے کہ میں نے حضرت صادق علیہ السّلام کی خدمت میں عرض کی کہ

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ

مثال ان دونوں فریقوں کی مثل اندھے بہرے اور بصیر و سمیع کی سی ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں مثال میں

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾

کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے ؟ اور ہم نے بھیجا نوح کو اپنی قوم کی طرف (اس نے کہا، میں تمہیں (عذاب سے) ٹھیک ڈرانیوالا ہوں

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ

یہ کہ نہ عبادت کرو مگر اللہ کی مجھے تم پر ڈر ہے دردناک دن کے عذاب کا تو کہا

الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ

ان سرداروں نے جو کافر تھے اس کی قوم سے ہم تمہیں نہیں دیکھتے مگر بشر اپنے جیسا اور نہیں تجھے دیکھتے

اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاْىِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا

کہ تیری اتباع کی ہو مگر ان لوگوں نے جو گھٹیا ہیں ظاہر ہیں اور نہیں دیکھتے ہم تمہارے لئے اپنے اوپر کوئی

ہمارے پاس ایک شخص ہے کلیب نامی کہ آپ کی جانب سے جو حدیث بھی وہ سنتا ہے اس کو فوراً تسلیم کر لیتا ہے حتیٰ کہ ہم نے اس کا نام کلیب تسلیم رکھا ہے۔ پس آپ نے اس کے حق میں دعا فرمائی اور پھر پوچھا کہ جانتے ہو تسلیم کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ یہی تراخبات ہے جس کے متعلق خدا قرآن میں فرماتا ہے وَاَخْبَتُوْا - الایۃ۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ ۔ یعنی کافر چونکہ مظاہر قدرت دیکھ کر اور براہین توحید سن کر اثر نہیں قبول کرتے تو ان کو اندھا اور بہرہ کہا گیا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں مومن دیکھ سن کر عقل کی کسوٹی پر رکھتا ہے۔ اور جو چیز واجب القبول ہو اُسے قبول کرتا ہے لہٰذا اس کو بصیر اور سمیع کہا گیا ہے۔

رکوع نمبر ۳ ۔ حضرت نوح کا ذکر اور معیار نبوّت

اس سے قبل سورہ یونس کے تیرھویں رکوع ص۱۲۳ میں اور تفسیر کی چھٹی جلد ص۱۲۲ تا ص۱۳۶ میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اس سورہ میں بھی دعوت عبادت و معرفت کے بعد گذشتہ انبیا کے قصّے بیان کرتے ہوئے پہلے حضرت نوح کا ذکر کیا ہے تاکہ نافرمانوں کے لئے باعث عبرت اور پیغمبر کے لئے باعث تسکین ہو۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا ۔ قرآن مجید میں گذشتہ اُمتوں کے حالات و خیالات سے اس امر کا خوب اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کی دعوت کو کن وجوہ کی بنا پر ٹھکراتے تھے ۔ یہاں تین وجوہ کا ذکر ہے جن کی بنا پر حضرت نوح کی دعوت کو رد کیا گیا۔

(۱) اُنہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ آپ ہماری طرح بشر ہیں اور دلیل کا کبریٰ ان کے نزدیک مسلّم تھا جس کو ذکر کرنے کی ضرورت

مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ

زیادتی بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں کہا اس نے اے قوم کیا جانو ؟ اگر میں ایک برہان

كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ

پر ہوں اپنے رب سے اور آئی ہو میرے پاس رحمت اس کی کہ تم پر

فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿٢٨﴾

مخفی ہو کیا ہم ٹھونس دیں زبردستی تم پر جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو

ہی انہوں نے محسوس نہ کی کہ جو ہماری طرح بشر ہو وہ نبی نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن مجید نے کسی مقام پر بھی ان کی دلیل کے صغریٰ کو چیلنج نہیں کیا۔ یعنی یہ کہ وہ رسول یا نبی کو بشر کہنے میں حق بجانب تھے۔ بلکہ قرآن نے ان کے صغریٰ کو متعدد مقامات پر تسلیم کرتے ہوئے جگہ جگہ ان کی دلیل کے کبریٰ کو رد فرمایا کہ بشر اور رسول میں کوئی منافات نہیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی فرمایا کہ میرے پاس اپنے رب کی جانب سے دلیل موجود ہے اور اس کی رحمت کا میرے اوپر سایہ ہے۔ پس اگر یہ چیزیں تم نہیں دیکھ سکتے تو اس کا کیا علاج ہے۔ یعنی جس کو تم دیکھتے ہو کہ میں بشر ہوں وہ درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے پاس خدا کی جانب سے دلیل و برہان اور علم و ایقان بھی ہے جو نبوت کا لازمہ ہے۔ تمہیں اس کی معرفت حاصل کرنی چاہیئے۔ اور اگر تم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تو دین میں جبراً کسی کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہم اس کو زبردستی تم پر ٹھونسا نہیں چاہتے۔ اور تمہیں پھر بھی سوچنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ غالباً ہر دور میں یہ موضوع محل نظر بنا رہا ہے کہ آیا نبی بشر ہو سکتا ہے یا نہیں بلکہ عموماً بشریت اور نبوت کو ایک دوسرے کا منافی سمجھا جاتا رہا ہے اور تقریباً بلکہ یقیناً نور و بشر کا معرکۃ الآراء مسئلہ بھی اسی ذہنی اضطراب کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ نور کو نبوت کا لازمہ اور بشر کو نور کا ضد جانتے ہوئے نبی کے لئے بشر ہونا ان کی توہین اور تنقیص سمجھی گئی ہے۔ اور یہ بالکل غلط اور بے بنیاد عقیدہ ہے بلکہ انتہائی جہالت ہے جو سابقہ اقوام نے نبوت کے انکار کی آڑ میں اختیار کر رکھی تھی۔ نور کی ضد ظلمت ہے نہ کہ بشریت۔ پس بشر نورانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہ انبیاء و اولیا اور بشر ظلماتی بھی ہوا کرتے ہیں جیسے کفار و مشرکین و منافقین انسانی صفات میں سے جس جس صفت کو دیکھئے اس میں یہ دونوں پہلو کار فرما رہیں گے اور جو پہلو غالب ہو گا۔ انسان اسی کی جانب منسوب ہو گا۔ مثلاً انسان میں علم کے نورانی پہلو کے مقابلہ میں جہالت کا ظلماتی پہلو ہوتا ہے۔ اور کامل عالم وہ ہے جس میں جہل کی ظلمت کا شائبہ تک نہ رہے۔ اسی طرح تمام صفات نیک و بد میں نیکی نورانی پہلو ہے اور اس کے مقابلہ میں برائی ظلمانی و تاریک پہلو ہے اور بے عیب ہونا نورانی پہلو ہے۔ اور عیب دار ہونا ظلماتی پہلو ہے۔ پس صحیح معنوں میں کامل وہی ہو گا جو نقائص عیوب اور برائیوں کے جملہ تاریک پہلوؤں سے پاک ہو۔ اور فضائل و کمالات اور نیکیوں سے آراستہ ہو کر نورانیت اپنے اندر رکھتا ہو اور تمام انسان ان متضاد صفات سے واسطہ رکھتے ہیں اور شاید کوئی انسان ایسا ہو جس میں کوئی نیکی کا پہلو

موجود نہ ہو۔ اسی طرح عام انسانوں میں سے شاید کوئی انسان ایسا ہو جس میں کوئی برائی یا عیب کی تاریکی نہ ہو۔ اسی بنا پر خداوند کریم کا ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۔ الآیۃ (خدا ولی ہے ایمان والوں کا کہ ان کو تاریکی (ظلمت) سے نور کی طرف لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اولیاء شیاطین ہیں جو ان کو نور سے نکال کر ظلمت (تاریکی) کی طرف لے جاتے ہیں) پس کفر و نفاق و شرک سب ظلمات اور تاریکیاں ہیں اور ان کے مقابلہ میں اسلام و ایمان و ایقان کی منازل نور کی منزلیں ہیں پھر ایمان لانے کے بعد ہر گناہ ظلمت ہے اور ہر ایک نیکی نورانی بلندی کی ایک منزل ہوتی ہے اور جس کو نیک کہا جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کا نورانی پہلو ظلمانی پر غالب ہے اور جسے بد کہا جاتا ہے اس کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ اس کا ظلمانی پہلو نورانی پر غالب ہے۔

پس خدا کی جانب سے نمائندہ نبی یا امام وہی ہو سکتا ہے جس میں اعمال و کردار و افعال و اطوار کے لحاظ سے دیگر صفات بشریہ میں سے ظلمانی پہلو موجود نہ ہوں اور اسی کا دوسرا نام عصمت ہے۔ پس نبی کے نور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان ظلمات سے پاکیزہ و منزّہ ہے جن سے دوسروں کو نکالنے کے لئے دعوتِ اسلام لے کر آیا ہے ورنہ اگر خود ظلمات میں ڈوبا ہوا ہو تو وہ دوسروں کو نکالنے سے پہلے خود اپنی نجات کے لئے کسی دوسرے کا محتاج ہوگا۔ پس نبی کے لئے ضروری ہے کہ خود نور ہو۔ اور دوسروں کو نور کی طرف بلائے اور اس لحاظ سے نور کی بشر سے کوئی منافات نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا بہانہ جو کفار کی جانب سے کسی نبی کی دعوت کو ٹھکرانے کے لئے پیش کیا جاتا تھا وہ یہ کہ اپنی چودھراہٹ اور برتری کو برقرار رکھنے کے لئے غرباء و مساکین کے پاس بیٹھنے سے نفرت کا اظہار کرتے تھے چونکہ اسلام مساوات کی دعوت دیتا ہے اور یہاں عزّت و ذلّت کا معیار ہے تقویٰ و عمل صالح پس جو متقی ہوگا وہ عزت دار ہوگا خواہ قوم میں پست اور دولت کے لحاظ سے ذلیل ہی کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔ اور جو تقویٰ نہ رکھتا ہو وہ اللہ کے نزدیک ذلیل ہوگا خواہ قومیت بلند اور دولت وافر ہی رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ دنیا کے غرور میں مبتلا ریاست و امارت اور مال و دولت کے بل بوتے پہ نخوت و تکبّر کے خوگر عزت و ذلّت کے اس معیار کو اپنی ظاہری وجاہت و جاہ و جلال پر ضرب کاری خیال کرتے تھے لہذا دعوتِ نبوی کو ٹھکرانے کے لئے وہ یہ بہانہ ساتھ پیش کرتے تھے کہ آپ کی اتباع تو غریب و کمزور لوگ ہی کرتے ہیں۔ اگر اس جماعت میں امرا ہوتے تو ہم بھی آجاتے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السّلام کو بھی یہ جواب دیا گیا۔ گویا مال و دولت، کبر و غرور اور جاہ و اقتدار کے نشے میں وہ لوگ عقل کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بس دولت اور عیش و عشرت ہی حق ہے اور جو بھی نظریہ اس سے ٹکرائے وہ باطل ہے اور نوح علیہ السّلام نے اس کا جواب بھی وہی دیا کہ ہمارے پاس دلیل و برہان اور رحمتِ پروردگار ہے۔ اور تم لوگوں کے لئے بھی حق و باطل کا معیار دلیل و برہان ہونا چاہیئے نہ کہ ظاہری اقتدار گویا دلیل کا صغریٰ مسلّم ہے اور کبریٰ کو ردّ کیا ہے۔

۳۔ ما نریٰ ۔ یعنی تم میں ہمارے اُوپر کوئی برتری یا فضیلت نہیں ہے جس کی بنا پہ ہم آپ کو نبی مان لیں اور آپ کی اتباع کریں گویا دلیل کا صغریٰ یہ ہوا کہ تمہاری ہمارے اُوپر کوئی برتری یا فضیلت ثابت نہیں اور کبریٰ جو مسلّمات میں سے تھا ۔ جس

کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی کہ جس کی فضیلت ثابت نہ ہو۔ اس کی اتباع نہیں کرنی چاہیئے۔ اس مقام پر بھی جواب وہی ایک ہے جو پہلے دونوں بہانوں کے لئے دیا گیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے دونو مقامات پر یہ جواب ان کی دلیلوں کے کبریٰ کو باطل کرتا تھا اور یہاں یہی جواب ان کی دلیل کے صغریٰ کو باطل کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ کبریٰ ان کا مسلّمہ ہے۔ یعنی جو افضل نہیں ہے واجب الاتباع نہیں ہوگا لیکن صغریٰ دلیل کا درست نہیں کہ آپ ہم سے افضل نہیں ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کے داعی ان کے پاس دو چیزیں تھیں۔ اور وہ اُوپر والے دو عذر۔ ایک یہ کہ آپ بشر ہیں اور ہم جیسے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ آپ کے اتباع غرباء طبقہ میں سے ہیں۔ یعنی ظاہری بشریت اور غربت، سے اُنہوں نے نبی کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور آپ کی افضلیت کا انکار کرنے لگے تو حضرت نوح نے وہی جواب دیا کہ میں اپنے پروردگار کی جانب سے دلیل و برہان اور اس کی رحمت کا سایہ رکھتا ہوں۔ یعنی فضیلت کا معیار مال و دولت یا ملک ہونا نہیں بلکہ اس کا معیار دلیل و برہان اور علم و یقین ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام یا دیگر انبیاء کے واقعات نیز گذشتہ اقوام کی انبیاء سابقین سے آویزش کے تذکرے صرف قصہ خوانی سے لطف اندوزی کے لئے نہیں بلکہ سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے اور غور و فکر کی راہیں ہموار کرنے کے اساسی دستور ہیں۔ اسی لئے تو ایک مقام پر فرمانا ہے کہ جو ایمان کو قبول کرے تو دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر کرے اور جو کفر کی طرف جائے تو وہ بھی سوچ سمجھ کر ایسا کرے تو یہاں ذرا قوم نوح کے ہر سہ نظریوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیے۔

- صغریٰ۔ آپ بشر ہیں ـــــ کبریٰ۔ جو بشر ہو وہ نبی نہیں ہو سکتا ـــــ نتیجہ۔ آپ نبی نہیں ہو سکتے۔
- صغریٰ۔ آپ کے اتباع غریب لوگ ہیں ـــ کبریٰ۔ جس کے اتباع غریب لوگ ہوں وہ قابل اتباع نہیں۔ نتیجہ آپ قابل اتباع نہیں
- صغریٰ۔ آپ ہم سے افضل نہیں ـــ کبریٰ۔ جو افضل نہ ہو اس کی اطاعت ناجائز ہے۔ نتیجہ آپ کی اطاعت ناجائز ہے۔

پس تین اعتراضوں کے بعد انہوں نے آپ کی دعوت کو ٹھکراتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ آپ کی دعوت جھوٹی ہے۔ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِيْنَ (یعنی ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں)۔

حضرت نوح نے فرمایا میں رب کی طرف سے اپنی حقانیت پر دلیل و برہان رکھتا ہوں۔ اور اللہ کی رحمت میرے سر پر ہے پس پہلی اور دوسری دلیل کا کبریٰ باطل اور جواب اس طرح ہوا۔

- میں بیشک بشر ہوں۔ اور جو بشر نبوت کے لئے بیّنہ و برہان رکھتا ہو وہ نبی ہو سکتا ہے۔ نتیجہ۔ لہٰذا میں برحق نبی ہوں۔
- میری اتباع غریب کرتے ہیں ـــــ نبی برحق کی اطاعت کرنے والے حق پر ہیں خواہ امیر ہوں خواہ غریب۔ نتیجہ۔ پس میری اطاعت کرنے والے غریب حق پر ہیں۔

اور تیسری ان کی دلیل کا کبریٰ درست ہے لیکن صغریٰ غلط اور جواب اس طرح ہوگا۔

- میں صاحب برہان نبی ہوں اور تم سے افضل ہوں۔ افضل کی اطاعت واجب ہے نتیجہ۔ پس میری اطاعت واجب ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ افضل کی اطاعت کرنے کا نظریہ عقلی و فطری نظریہ ہے جس کو کافر بھی تسلیم کرتے ہیں تو جیف صدحیف

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ

اور اے قوم میں نہیں مانگتا تم سے بدلہ میں مال مجھے اللہ ہی اجر دے گا اور نہیں ہوں میں بھگانے والا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

ان کو جو ایمان لائے کیونکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کرنے والے ہیں لیکن میں تو تمہیں جاہل قوم سمجھتا ہوں

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور اے قوم کون میری مدد کرے گا اللہ سے اگر میں نے ان کو بھگا دیا کیا تم نہیں سوچتے

ہے ان عقل و دانش کے اندھے انسانوں پر جو مسلمان کہلاتے ہوئے افضل کو مفضول کی اطاعت پر مجبور کرنا دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور حضرت علی کو افضل جاننے کے بعد ان کی خلافت بلافصل سے روگردانی اسی کوربا طنی کا نتیجہ ہے۔

وَيٰقَوْمِ - حضرت نوحؑ کی قوم نے تین اعتراض کرکے آخر میں کہہ دیا کہ تم جھوٹے ہو۔ لہذا ہم تمہاری کوئی بات نہیں مانتے تو آپ نہایت حوصلہ اور متانت سے پھر ان کو سمجھاتے ہیں کہ تم نے میری بشریت کے پیش نظر میری نبوت کا انکار کیا۔ پھر اسی بنا پر غربت و افلاس کو ساتھ ملحوظ رکھتے ہوئے میری فضیلت کا انکار کیا تو چلو ایک معقول بات سن لینے میں تمہیں حرج کیا ہے کہ طیش میں آتے ہو۔ اور میں تم سے کوئی فیس تو وصول نہیں کرتا کہ تم گھبرا جاؤ میں تو تمہیں جو کچھ سناتا ہوں، مفت سناتا ہوں۔ کم از کم سن تو لو مجھے اس کا اجر خدا خود ہی دے گا۔ باقی رہی یہ بات کہ میری بات ماننے والے تمہاری نظروں میں حقیر اور ذلیل لوگ ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے بے ایمان دولت مند سے ایمان دار غریب اچھا ہے۔ لہذا تمہارے کہنے سے ان کو الگ کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔

افکار و رموز

(۱) انہوں نے شریف و رذیل کا معیار مال و زر کو بنا رکھا تھا اور آیت کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے یہ کہا ہوگا کہ ان کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم ایمان لائیں گے۔ کیونکہ ان کے پاس بیٹھنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں تو اس کا جواب دیا گیا ہے کہ تم نے شریف و رذیل کا جو معیار بنا رکھا ہے وہ غلط ہے بلکہ یہ لوگ تو اللہ سے ملاقات کرنے والے ہیں یعنی عزت اور شرافت کا معیار ہے۔ خوشنودئ خدا اور رذالت کا معیار ہے دشمنی خدا۔ پس وہ لوگ اگرچہ غریب ہیں لیکن ایمان کی وجہ سے اللہ کے نزدیک عزت دار ہیں۔

(۲) یہ اندازِ بیان اور طریق تبلیغ اُسی کی ذات کے ہی شایانِ شان ہے۔ ان کے ہر سہ اعتراضات کا پہلا جواب یہ تھا۔ کہ میرے پاس نبوت کی دلیل و برہان ہے اور پھر فرمایا کہ اگر تم نہیں مانتے تو ایک معقول بات کے سننے میں غصہ کیوں کرتے ہو میں تم سے کچھ مانگتا تو نہیں ہوں۔

اب ذرا تیز لہجہ میں تیسرا جواب یہ ہے کہ تمہارے ہر سہ اعتراضات جہالت پر مبنی تھے۔ کیونکہ بشر اور نبی میں کوئی منافات نہیں بلکہ وہ نبی ہے جو اللہ کی جانب سے نبوت کی سند و برہان رکھتا ہو۔ اسی طرح مال و دولت نہ رکھنے والا ارذل نہیں ہوتا۔ بلکہ

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ

اور میں نہیں کہتا تمہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ

مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ

ہوں اور نہ کہتا ہوں ان کے متعلق جن کو تمہاری آنکھیں ذلیل سمجھتی ہیں کہ نہ دیگا ان کو خدا اچھا بدلہ اللہ

اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا

جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے (اگر میں ایسا کہوں) تو ظالموں سے ہو جاؤں گا کہنے لگے اے نوح تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا

ایمان کی دولت سے جو محروم ہو وہ رذیل ہوتا ہے اور فضیلت کا معیار دولت نہیں بلکہ علم و عرفان اور دلیل و برہان ہے۔ پس اپنے غلط نظریوں کی بنا پر ہمیں جھوٹا کہنا تمہاری جہالت کی دلیل ہے۔

(۳) نصرت اور شفاعت میں فرق جاننا ضروری ہے۔ حضرت نوح فرما رہے ہیں کہ اگر ان ایمان صفت غریب طبقہ کو میں اپنے پاس سے دور کر دوں تو میری اللہ سے نصرت کون کرے گا۔ تو جو لوگ شفاعت کے منکر ہیں وہ اس آیت سے سہارا لیتے ہیں کہ حضرت نوح صاف کہہ رہے ہیں کہ میری اللہ سے نصرت کر کے چھڑانے والا کوئی نہ ہوگا اور شفاعت بھی ایک قسم کی نصرت ہے جب نوح کی غلطی پر اس کی شفاعت نہیں ہو سکتی تو کسی دوسرے کی کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اس کا جواب یہ ہے۔ نصرت اور شفاعت دو مفہوم ہیں۔ جن کے معنی میں تضاد ہے۔ نصرت کہتے ہیں۔ کسی کو اس کے مدمقابل پر غلبہ دلانے کے لئے اس کی امداد کرنا اور حضرت نوح اسی معنی کی نفی کر رہے ہیں کہ غریب طبقہ کو بھگا دینا اللہ سے جنگ کرنے کے مترادف ہے اور ایسی صورت میں پھر کون ہوگا جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کر کے مجھے غالب کر سکے گا اور شفاعت کا معنی یہ ہے کہ منت و سماجت سے کسی کی جان چھڑا لینا، اور حضرت نوح اس معنی کا انکار نہیں کر رہے تھے۔

(۴) تفکر اور تذکر میں بعضوں نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ تذکر اس بات کو سوچنا جو پہلے ذہن میں موجود ہو۔ اور تفکر ایسے مطالب کا سوچنا جو پہلے ذہن میں نہ ہوں۔

خَزَآئِنُ اللّٰهِ۔ پھر ان کے انہی سوالوں کی مزید تردید کے لئے جداگانہ رنگ اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ تم جو مجھے بشر ہونے کا طعنہ دیتے ہو۔ میں نے کب کہا ہے کہ میں خدا کی خدائی اور اس کے خزانوں کا مالک ہوں کہ جو کچھ مانگو گے دیتا جاؤں گا۔ میں نے تمہیں اللہ کے سامنے جھکنے کو کہا ہے جو انسانیت کا مقتضا ہے۔ اور بشر کی شان ہے یعنی تم مجھے بشر ہونا تو تب بتلاؤ جب اس سے بڑھ کر مذکورہ بالا دعویٰ کروں۔ نیز تم میری اتباع کرنے والوں کو جو رذیل کہتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے نزدیک یہی عزت دار ہوں۔ لہذا ایسی بے تکی باتیں کرنے کا مجھے حق نہیں اور نہ تمہیں اس کا کوئی حق پہنچتا ہے یا یہ کہ اگر تم ان کو اس لئے رذیل کہتے ہو کہ یہ لوگ صرف زبانی زبانی میرے ساتھ ہیں اور دل سے مومن نہیں ہیں لہذا انکو بھگا دو۔ تو یہ کہنا درست نہیں کیونکہ میں تو ظاہر کا مکلف ہوں۔ اور وہ ظاہر میں

فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

اور بڑا جھگڑا کیا تم نے پس وہ لاؤ جو وعدہ کرتے ہو اگر ہو تم سچے

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا

فرمایا ضرور وہ بھی لائے گا تم پر اللہ اگر چاہے گا اور تم اس کو عاجز نہیں کر سکو گے اور نہ

يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ

نفع دے گی تمہیں میری نصیحت اگر میں چاہوں کہ تمہیں نصیحت کروں اگر اللہ چاہتا ہو تمہیں عذاب دینا

يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ

وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ افترا باندھا ہے کہہ دو اگر میں

اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

نے افترا باندھا ہے تو اس کا جرم مجھ پر ہے اور میں بری ہوں اس سے جو تم جرم کرو

ایمان لا چکے ہیں ان کی دل کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ اور میں غیب نہیں جانتا کہ اس معاملہ میں تمہاری تصدیق کروں۔ اسی طرح تم نے کہا ہے کہ تجھے ہم پر کوئی فوقیت نہیں ہے تو میں نے کب ملک (فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے)

لِلَّذِیْنَ۔ یعنی جن لوگوں کو تم حقیر سمجھتے ہو اور کہتے ہو کہ ان کا کوئی اچھا صلہ نہیں ملے گا۔ میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ خدا خود ہی ان کے دلوں کو جانتا ہے اگر وہ خالص مومن ہوں گے تو دنیا میں جس طرح ان کو دولتِ ایمان سے مالا مال کیا ہے۔ آخرت میں بھی ان کو جنّت کا انعام دے گا۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ۔ ہمیشہ جھوٹے اور ہٹ دھرم لوگوں کا یہ دستور ہے کہ دلیل و برہان میں مغلوب ہو جائیں تو یہ بات کہہ کر اپنی جان چھڑاتے ہیں کہ تم جھگڑالو اور باتونی قسم کے آدمی ہو۔ چنانچہ حضرت نوح ؑ نے جب چار معقول جوابوں سے ان کے منہ میں لگام دے دی کہ پہلے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی کہ میں کیا ہوں۔

ثانیاً ان کے خدشات کو دور کیا اور معقول کی طرف توجہ دینے کی دعوت دی۔

ثالثاً۔ ان کو ان کی جہالت پر متنبہ کر کے دعوتِ فکر دی۔ اور رابعاً ان کو غلط فہمی کے وجوہ بتلائے۔ اور نہایت سکون و اطمینان سے ان کو راہِ حق کی طرف قدم اٹھانے کا شوق دلایا۔ پس جب ان کا ناطقہ بند ہوا تو اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر کہنے لگے کہ تیرے جھگڑے کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے پس وہ عذاب لے آؤ جس کا وعدہ کرتے ہو۔

یَاْتِیْکُمْ۔ اس میں بھی حضرت نوح نے اپنے مامور من اللہ ہونے کا ثبوت دیا جب کہ انہوں نے کہا کہ عذاب لے آؤ۔ آپ

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا

اور وحی کی گئی نوح کو کہ تحقیق نہیں مومن ہوگا تیری قوم سے مگر وہی جو ایمان لا چکے ہیں پس رنجیدہ

تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

نہ ہو اس سے جو وہ کرتے ہیں اور تیار کر کشتی ہمارے سامنے اور ہماری وحی سے

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ

اور نہ خطاب کرنا مجھ سے ان کے متعلق جو ظالم ہیں (کیونکہ) وہ ضرور غرق ہوں گے وہ کشتی بنا رہے تھے

نے فرمایا عذاب لانا میرا کام نہیں بلکہ میرا کام تبلیغ کرنا ہے مانو نہ مانو تمہاری مرضی اور عذاب لائے یا نہ لائے وہ اللہ کا کام ہے اگر چاہے گا تو لے آئے گا اور پھر اُس کو نہ عاجز کر سکو گے اور نہ اس کے عذاب کو اپنے سروں سے ٹال سکو گے۔

خدا کی مشیت کا حوالہ دے کر حضرت نوح نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ خدا اپنے نبیوں کا محتاج نہیں ہے وہ عذاب کے لانے یا نہ لانے میں اپنی مشیت پر عمل کرتا ہے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ یعنی اگر تم پر بوجہ اپنی سرکشیوں کے عذاب محتوم ہو چکا ہے تو میں جتنی نصیحت کروں گا تم نہ مانو گے۔

رکوع نمبر ۴

تفسیر جامع میں ابوالصلت ہروی سے منقول ہے میں نے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا کہ زمانہ نوح میں خداوند کریم نے ساری دنیا کو کیوں غرق کر دیا حالانکہ ان میں بچے معصوم بھی ہوں گے تو آپ نے فرمایا کہ جب ان پر عذاب حتمی ہو گیا تو وقتِ عذاب سے چالیس برس قبل خدا نے ان کی عورتوں کو عقیم بنا دیا۔ پس کوئی بچہ اس دوران میں ان کے ہاں پیدا نہ ہوا۔ پس وہ جو حضرت نوح کی تکذیب نہ کرتے بلکہ انہوں نے حضرت نوح کو دیکھا بھی نہ تھا لیکن وہ ان کافروں کے افعالِ بد سے خوش اور راضی تھے پس ان دونوں جماعتوں کو غرق کر دیا گیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ پہلے تین سو برس تبلیغ کی اور جب ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ تو ان پر بددعا کرنے لگے لیکن زمین کے ملائکہ میں سے بارہ ہزار فرشتوں نے درخواست کی کہ آپ فی الحال درگذر فرمائیں اور مزید ایک دفعہ مرفعہ دیں۔ چنانچہ پھر تین سو برس گذار دئے پھر نفرین کا ارادہ کیا تو پھر فرشتوں کی دوبارہ استدعا سے مہلت بڑھا دی گئی اور جب پورے نو سو گذرے تو عرض کی اے پروردگار میں نے شب و روز محنت کر کے ان کو تیرا پیغام پہنچایا لیکن وہ بالکل مانتے ہی نہیں تو خدا کی طرف سے ان کو اطلاع ملی کہ تیری قوم سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا بس وہی مومن ہوں گے جو پہلے سے ایمان لا چکے ہیں پس آپ نے بددعا کی تو ارشادِ خداوندی ہوا کہ غم نہ کر اور کشتی بناؤ۔

بِاَعْيُنِنَا۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ میرے سامنے بناؤ۔ مقصد یہ ہے کہ ہماری حفاظت اور امان میں بناؤ کہ اس سلسلہ میں کوئی تمہیں گزند نہیں پہنچا سکے گا یا یہ کہ اعین سے مراد ملائکہ ہوں۔ یعنی ہمارے فرشتوں کے سامنے بناؤ۔ یعنی وہ تمہاری ہر طرح

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا

توجب بھی اس کی قوم کے سرداروں کی کوئی ٹولی وہاں سے گذرتی تھی تو اس سے مسخری کرتے تھے فرمایا اگر تم ہم سے مسخری کرتے ہو تو ہم بھی

نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ

تم سے مسخری کرلیں گے جس طرح تم کرتے ہو عنقریب جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب رسوا کرنے والا

وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿۳۹﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ

اور آتا ہے عذاب دائمی یہاں تک کہ جب پہنچا ہمارا حکم اور جوش مارا تنور نے تو ہم نے کہا کہ سوار کرلے

نگہبانی کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کشتی کھلے میدان میں بناؤ تاکہ آنے جانے والے سب دیکھیں جو عبرت حاصل کرنا چاہیں انہیں مزید سوچنے کا موقعہ مل جائے اور جو عنادی ہیں ان پر مزید حجت تمام ہو جائے پس اس مقصد کو مجازاً باعیننا سے تعبیر کیا گیا۔

بِوَحْيِنَا۔ اس سے قبل کشتی بنانے کے متعلق تو وحی ہو چکی تھی۔ اب یہ کہ ہماری وحی سے بناؤ یعنی اس کا طول وعرض و بلندی اور کیفیت یہ سب کچھ بھی ہماری ہدایت کے ماتحت ہوگا یعنی اس کے معاملہ میں تمہیں اختیار نہیں بلکہ ہم جو بتائیں گے تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا۔

وَكُلَّمَا مَرَّ۔ آیت مجیدہ میں ہے کہ جب بھی کشتی بنانے کے دوران میں سرداران قوم پاس سے گذرتے تھے تو حضرت نوح پر مسخری کرتے تھے۔ کوئی ازراہ مزاح کہتا تھا کہ کیا آپ کو نبوت کے بعد درکھان ہونے کا عہدہ ملا ہے؟ کوئی کہتا تھا کہ یہ لمبی چوڑی کشتی پانی کی بجائے خشکی پر چلاؤ گے؟ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں تو حضرت نوحؑ ان کو جواب میں ارشاد فرماتے تھے کہ اب تم مسخری کرلو پھر جب ہمارا موقعہ آیا تو ہم بھی تمہیں دیکھ لیں گے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ہم بھی تم سے مسخری کریں گے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس مسخری کا انہیں مزا چکھائیں گے۔

کشتی نوحؑ کا حلیہ

کشتی کے طول وعرض کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ ۱۲ سو ذراع لمبی اور ۳ سو ذراع چوڑی تھی اور بعض نے تین سو ذراع لمبی اور پچاس ذراع چوڑی اور تیس ذراع اونچی کا ذکر کیا ہے۔ اور ابن عباس سے منقول ہے کہ اس میں تین منزلیں تھیں۔ نچلی منزل وحوش وحشرات الارض کے لئے درمیانی منزل چوپاؤں کے لئے اور تیسری آخری منزل انسانوں کے لئے تھی اور یہ ساگوان کی لکڑی سے بنائی گئی تھی (مجمع البیان) اور تفسیر جامع کی روایت میں کشتی کا طول ۱۲ سو ذراع عرض آٹھ سو ذراع اور بلندی اسی ذراع منقول ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ کشتی کے تیار ہو جانے کے بعد حضرت نوح نے سریانی زبان میں آواز دی اور آپ کی آواز پر تمام حیوانات اکٹھے ہو گئے۔ پس آپ نے ہر جنس کا جوڑا جوڑا کشتی پر سوار کرلیا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب گندگی پاخانہ کی شکایت پیدا ہوئی تو بامر خدا ہاتھی کی چھینک سے سور پیدا ہوا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ جب گھوڑوں کی لید وغیرہ اور گندگی زیادہ بڑھی تو خنزیر کی چھینک سے خدا نے چوہے کو پیدا کیا اور جب چوہے کثرت سے

فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ

اس پر ہر جنس سے جوڑا جوڑا اور اپنی اہل کو سوائے ان کے جن پر حتمی ہوچکا ہے وعدہ (عذاب) اور

مَنْ آمَنَ ۚ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾ وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ

مومنوں کو اور نہ ایمان لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے اور کہا کہ سوار ہو جاؤ اس میں اللہ کا نام لے کر

مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٤١﴾ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ

بوقت روانگی اور بوقت ٹھہراؤ تحقیق میرا رب بخشنے والا مہربان ہے اور وہ چلتی تھی ان کے ساتھ موجوں میں

ہو گئے تو بامر خدا شیر کی چھینک سے بلّی پیدا ہو گئی۔

تفسیر جامع کی روایت کے مطابق جب نوحؑ کی قوم پر عذاب محتوم ہوا تو حضرت نوح کو درخت لگانے کا حکم ہوا۔ چنانچہ جب آپ نے درخت بویا تو قوم کے لوگوں نے مسخری کرتے ہوئے کہا کہ نو سو برس کی عمر پا کر اب درخت لگانے کا حرص پیدا ہو گیا ہے۔ جب بحکم خدا پچاس برس کے بعد درخت کو کاٹا تو پھر طعنہ دیا کہ جب درخت سے فائدہ حاصل کرنے کا وقت آیا تو اسے کاٹ رہا ہے۔ جب کشتی کے تختے بنانے اور تراشنے کا وقت آیا تو نوحؑ نے ناصر کی خواہش کی تو خدا کا حکم ہوا۔ لوگوں کو کہو۔ مدد کریں اور اس کے بدلہ میں ان کے لئے لکڑی کے ریزوں کو سونا بنا دوں گا۔ پس وہ لوگ خود اپنے ہاتھوں اپنے عذاب کا سامان تیار کرنے لگے۔ مسخری بھی کرتے تھے اور سونے کے طمع میں کشتی بنانے میں مدد بھی دیتے تھے۔ اور کشتی اسی جگہ بنائی گئی تھی جہاں اب مسجد کوفہ موجود ہے۔ مروی ہے کہ حضرت نوحؑ کی ایک بیوی روٹی پکا رہی تھی کہ تنور سے پانی کا فوارہ نکلا تو وہ چیخنے لگی پس حضرت نوحؑ نے مٹی سے اس سوراخ کو بند کیا اور حیوانوں کو مع ان کے گھاس کے انتظام کے کشتی میں سوار کیا۔ جب سب کام مکمل کر لیا تو جا کر تنور کے اس سوراخ سے مٹی کو ہٹا دیا۔ پس سوراخ کا کھلنا تھا کہ پانی زور سے نکلنا شروع ہوا اور آسمان سے پانی بغیر بادل کے برسنا شروع ہوا۔ نیز زمین پھوٹ پھوٹ کر اپنے پانی کو اوپر نکالنے لگی۔ پس آن کی آن میں زمین کے اوپر سب پانی ہی پانی ہو گیا حتیٰ کہ بلند ترین پہاڑوں سے بھی اس کی سطح ۱۵ یا ۳۰ یا ۴۰ ذراع باختلاف روایات بلند تھی۔

وَ اَهْلَكَ۔ حضرت نوح کو حکم ہوا کہ کشتی میں اپنے اہل کو سوار کر لو۔ اور ہم نے تفسیر کی چھٹی جلد صفحہ ۶ تا صفحہ ۸ میں آل کی تحقیق کے ذیل میں ذکر کیا ہے کہ اہل میں انسان کے وہ معتمدین داخل ہوتے ہیں جو اس کے مشن میں اس کے ساتھ برابر کے شریک ہوں۔ خواہ وہ مشن دنیاوی ہو یا دینی اور حضرت نوح کے دنیاوی مشن اور گھریلو معاملات میں چونکہ بیوی بچے سب اہل تھے اور البتہ دینی معاملہ میں جو حضرت نوحؑ کا نبوتی و رسالتی مشن تھا اس میں ایک لڑکا اور ایک بیوی ان کے مخالف تھے اور چونکہ عذاب خداوندی کفار اور دشمنان دین کے لئے تھا تو ارشاد باری ہوا کہ عذاب سے بچانے کے لئے کشتی میں اپنے اہل کو سوار کر لو۔ اور پھر ان افراد کے استثناء کا حکم دیا جو دینی معاملہ میں آپ کے ہمنوا نہ تھے۔ یعنی گھریلو معاملات میں ان کا شمار اہل میں تھا لیکن دینی لحاظ سے وہ آپ

كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا

جو پہاڑوں کی مانند تھیں اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو کہ وہ الگ تھا اے بیٹا سوار ہو جا ہمارے ساتھ اور نہ ہو

تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا

ساتھ کافروں کے تو کہنے لگا میں پناہ لوں گا طرف پہاڑ کے بچا لے گا مجھے پانی سے تو کہا کہ نہیں

عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا

بچانے والا آج کوئی عذاب خدا سے مگر جس پر رحم کرے اور حائل ہو گئی ان کے درمیان

الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

موج اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا

کے دشمن تھے تو جب مطلق اہل کے سوار کرنے کا حکم ہوا تو اس کے عموم میں تمام اہل داخل تھے۔ خواہ دینی لحاظ سے ہوں یا دنیاوی سے تو استثناء کے ذریعہ سے ان کو نکال دیا جو دینی معاملہ میں ہمنوا نہ تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اہل کے سوار کرنے کے ساتھ یہ حکم ہوا کہ مَنْ اٰمَنَ (ایمان والوں کو) سوار کیجئے تو وہاں استثناء کی ضرورت نہ ہوئی۔

تمام تفسیروں میں ہے کہ جب بیٹے کو غرق ہونے دیکھا تو اسے اپنی کشتی پر سوار ہو جانے کے لئے بلایا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور آخر کار غرق ہو گیا۔ حضرت نوحؑ کو معلوم تھا کہ کافر ضرور غرق ہوں گے اور خدا نے بھی فرمایا تھا کہ اب ظالم لوگوں پر عذاب حتمی طور پر نازل ہو گا۔ لہٰذا ظالموں کے متعلق سفارش نہ کرنا۔ پھر ان تمام تصریحات کے باوجود حضرت نوحؑ نے خدا سے بھی دعا مانگ لی کہ میرے بیٹے کو بچا لے حالانکہ خدا کی نہی کے بعد بیٹے کے لئے یا کسی کے لئے سفارش کا کوئی محل ہی نہ تھا تو یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا حل اس طرح ہے کہ خداوند کریم نے حضرت نوح کی اہل کو بچانے کا وعدہ فرمایا تھا اور اہل کا معنی چونکہ مخلصین و معتقدین ہوا کرتے ہیں اور حضرت نوح کا یہ لڑکا کنعان نامی بھی ظاہراً باپ کا فرماں بردار تھا۔ اور باپ کے سامنے اپنا مخلص مومن ہونا بھی ظاہر کرتا تھا۔ جس طرح کہ حضرت رسالت مآبؐ کے زمانہ میں بہت سے منافقین اپنے تئیں مومن ظاہر کر کے جناب رسالت مآبؐ سے رعایات حاصل کرتے تھے اور ان کی جان و مال محفوظ تھے۔ پس اسی بنا پر حضرت نوح نے اس کو مومن سمجھتے تھے اظہار محبت کیا اور خدا سے اس کی نجات کی دعا مانگی اور اس کے منافق ہونے کی قلعی اس وقت کھلی جب اس نے باپ کی اعلانیہ نافرمانی کرتے ہوئے کشتی پر سوار ہونے سے انکار کر لیا اور دعا کے جواب میں جب زبانِ قدرت سے جواب ملا کہ انہ لیس من اھلک۔ تو مزید تسلی ہو گئی کہ وہ منافق تھا لہٰذا اس کے بعد میں کوئی جزع و فزع یا غم و اندوہ ان کو لاحق نہ ہوا۔

تفسیر جواہر طنطاوی میں صاف مذکور ہے کہ وہ منافق تھا اور اس کے ظاہری ایمان کی وجہ سے نوح نے اس کے لئے دعا

کی تھی۔ اور نوح کے بیٹے کو اہل سے نکالنے کا مقصد یہ ہے کہ نبی کے اہل سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ظاہر و باطن میں ایمان کے زیور سے آراستہ ہوں اور ایسوں ہی کے ساتھ نجات کا وعدہ تھا اور حضرت نوح کا صرف بیٹے کے لئے نجات کا سوال کرنا اور بیوی کو نظر انداز کرنا اسی امر کا کاشف ہے کہ بیوی اعلانیہ کافر تھی لہٰذا ان کے لئے دعا کرنے کا جواز ہی نہ تھا اور بیٹا چونکہ ظاہراً مومن تھا اور دل میں منافق تھا۔ پس اس کے لئے ظاہری ایمان کی وجہ سے دعا مانگی۔ حضرت نوح کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کافرہ جس کا نام واعلہ تھا اور اس کا بیٹا کنعان جو منافق تھا ظاہراً باپ کی خوشامد کے طور پر مسلمان تھا اور اندرونی طور پر اپنی ماں کے ساتھ ہم خیال تھا۔ ان دونوں کا انجام ہلاکت ہوا۔ اور دوسری بیوی مومنہ تھی جس کے تین بیٹے تھے۔ سام۔ حام۔ یافث۔ اس مقام پر حضرت نوح کے غرق ہونے والے بیٹے کنعان کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ان کا صلبی بیٹا تھا لیکن کفر و نفاق کی وجہ سے اہل سے خارج ہو گیا۔ جس طرح کہ اس کے برعکس ایمان کی بدولت حضرت سلمان کو حضورؐ نے اپنی اہل میں داخل فرما لیا۔ چنانچہ تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ خدا نے نوح کو اس لئے فرمایا کہ وہ تیری اہل سے نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے مخالف تھا اور جنہوں نے اس کی اطاعت کی ان کو اہل قرار دے دیا۔ اور بعد والے لفظ بتلاتے ہیں کہ وہ اہل سے کیوں کٹ گیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت نوح کا صلبی بیٹا نہ تھا بلکہ اس کی زوجہ کا پچھلے گھر سے لڑکا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ حرام زادہ تھا لیکن مذہب شیعہ کے اصول کے مطابق یہ غلط ہے کیونکہ نبی کی بیویاں بدچلن نہیں ہوا کرتیں۔ اور قرآن مجید میں جہاں حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کے متعلق یہ ہے کہ انہوں نے خیانت کی تھی اس کا مقصد صرف امور دینیہ میں مخالفت کرنا ہے۔ پس حضرت نوح کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ حضرت نوح کو مجنون و دیوانہ کہا کرتی تھی۔ اور حضرت لوطؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی، کہ وہ حضرت لوطؑ کے ہاں آنے والے مہمانوں کی اطلاع قوم کو دیتی تھی[۱] اور رازداری میں خیانت کرتی تھی۔ پس کسی بھی نبی کی زوجات کے متعلق بدچلنی کا الزام انبیاء کی ناقدر شناسی ہے اور خداوند کریم نبیوں کی ناموس کا خود محافظ ہوا کرتا ہے۔ ہم ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے بیزار ہیں جو انبیاء کی بیویوں کے متعلق بہتان و الزام عائد کریں۔ ہاں ہم حضرت نوح و حضرت لوط کی بیویوں کو مومن نہیں سمجھتے اور اس کے قائل ہیں کہ نبی کی نبوت اس کی بیوی کی نجات کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ پس عذاب خداوندی سے کسی نبی کی عورت کو شوہر کی نبوت نہیں بچا سکتی۔ پس عذاب سے بچانے والی چیز ہے نبی کی اطاعت و فرمانبرداری ساتھ ایمان کے۔ بہر حال ان تین اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے اور قرآن کا ظاہر بھی اس سے موافقت رکھتا ہے۔

مسجد کوفہ کے فضائل

نکاتِ علمیّہ (۱) فار ۲۱۱ فار یفور سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے۔ اُبلنا۔ کھولنا۔ جوش مارنا اور فار التنور کا معنی ہوا کہ جوش مارا تنور نے لیکن تنور کے معنی میں اختلاف ہے بعض مفسرین نے روٹیاں پکانے والا تنور مراد لیا ہے۔ چنانچہ اس معنی کی مؤید ایک روایت بھی گذر چکی ہے اور تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ یہ تنور حضرت آدم علیہ السّلام کا تھا اور اس سے پانی کا اُبلنا حضرت نوح کے لئے علامت مقرر تھا کہ جب مقام غیر معروف سے پانی اُبلنے لگے تو جان لینا کہ عذاب کا وقت آگیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مقام عین الوردۃ علاقہ شام میں

[۱] تفسیر کی جلد ۱۴ سورہ تحریم میں بھی خیانت سے یہی معنی مراد ہے۔

حضرت نوح علیہ السّلام کے گھر میں تھا اور بروایت مفضل بن عمرو امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ مسجد کوفہ کے پاس ایک بڑھیا کے گھر میں تھا جو مومنہ تھی۔ اور اس سے پانی کا نکلنا حضرت نوح کی قوم کے لئے ایک نشانی تھی پھر اس کے بعد اُوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور دریائے فرات میں یکبار طغیانی آگئی اور زمین کے چشمے پھوٹ پڑے پس روئے زمین پر پانی ہی پانی ہوگیا۔ پس نوح اور اس کے ہمراہ کشتی میں سوار ہونے والوں کے علاوہ سب غرق ہوگئے اور ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ حضرت نوح سات شبانہ روز کشتی میں ٹھہرے تھے۔ جب مسجد کوفہ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ مسجد کوفہ بہت پرانی ہے۔ اور یہ انبیاء کی عبادت گاہ ہے۔ شب معراج حضرت رسالت مآبؐ بھی یہاں نماز پڑھی تھی۔ اور جبریل نے بتایا تھا کہ یہ آدم اور دیگر انبیاء کی عبادت گاہ ہے۔ اس کے بعد پھر آسمان کی طرف عروج فرمایا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ پورے پانچ ماہ کشتی پانی کی سطح پہ رہی۔ ابوعبیدہ حذاءؒ نے امام محمد باقر علیہ السّلام سے روایت کی ہے کہ مسجد کوفہ کا وسط جنّت کے باغات میں سے ایک باغیچہ ہے۔ اس میں ایک نماز ستر نمازوں کے برابر ہوتی ہے اور اس میں ایک ہزار ستر نبیوں نے نماز ادا کی ہے۔ یہیں سے تنور اُبلا تھا۔ اور اسی جگہ سے کشتی روانہ ہوئی تھی۔ اور یہی انبیاء کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ تنور کے متعلق دوسرا قول یہ ہے کہ مطلق زمین کی سطح کو تنور کہتے ہیں اور معنی یہ ہوگا کہ زمین سے پانی اُبلنے لگا۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ تنور کا معنی صبح ہے یعنی ادھر صبح نمودار ہوئی اور ادھر عذاب خداوندی نازل ہوا۔ اور یہ حضرت علی علیہ السّلام سے روایت کی گئی ہے۔ اور چوتھا قول اس میں ہے کہ تنور کا معنی بلند مقام یعنی زمین کی بلندیوں سے پانی پھوٹ پڑا۔

تنبیہ۔ بعض روایات میں مسجد کوفہ میں ایک نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر بھی منقول ہے۔ اور یہاں ایک نماز ستر کے برابر بتلائی گئی ہے تو ان روایات میں تنافی نہیں ہے کیونکہ یہ کثرت اور مبالغہ کی الگ الگ تعبیریں ہیں۔ جس طرح کسی کو مبالغہ آمیز لہجہ میں تنبیہ کرنا ہو تو کہا جاتا ہے میں نے تمہیں ہزار بار سمجھایا۔ لاکھ مرتبہ بتایا۔ سو دفعہ کہا پچاس دفعہ کہا۔ بیسیوں بار سمجھایا وغیرہ تو ایک ہی مقصد کے لئے اتنے جملے متضاد نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کا اور ان جیسے دیگر جملوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ میں نے تم کو اس قدر سمجھایا اور بتایا کہ تجھے بعد میں عذر کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ پس یہاں ثواب کے متعلق بعض بعض مقامات پہ اس قسم کی مختلف تعبیریں صرف کثرت ثواب کو ظاہر کرنے کے لئے ہیں اور مقام کی اہمیّت کو واضح کرنے کی غرض سے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس میں اس قدر ثواب اور رضا مندئ پروردگار ہے جس کا تم اندازہ ہی نہیں کرسکتے۔ مسجد کوفہ کی فضیلت اسی جلد کے صـ۲۴ و صـ۲۵ پہ گذر چکی ہے

ثانیاً۔ تنور کے متعلق جس قدر معانی بیان کئے گئے ہیں وہ بھی سب کے سب مراد ہوسکتے ہیں۔ لہذا ان میں ظاہراً کوئی منافات نہیں ہے۔

(۲) کشتی پر سوار ہونے والوں کی تعداد میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ ۸۔ ۱۰۔ ۷۲۔ ۷۸۔ ۸۰ کے اقوال ہیں۔ بہر صورت ان میں حضرت نوح کے تین بیٹے۔ سام۔ حام اور یافث اور ان کی تین بیویاں بھی تھیں۔ اور مجمع البیان میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السّلام نے حضرت آدم علیہ السّلام کی میّت کو بھی کشتی میں رکھ لیا تھا۔ اور حضرت نوح کے اپنے کنبہ کے علاوہ دوسرے مومن بھی کشتی پر سوار

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ

اور کہا گیا اے زمین نگل جا اپنے پانی کو اور اے آسمان رُک لے اور خشک ہوا پانی اور معاملہ ختم ہوا

تھے۔ جن کی غربت کا کافر لوگ طعنہ دیتے تھے۔ اگرچہ ان کی تعداد کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور قرآن میں من اٰمن کا جملہ اس پر شاہد ہے۔

(۳) بِسْمِ اللّٰهِ مجریھا و مرسھا۔ یہ فیہا میں ضمیر غائب مجرورھا سے حال واقع ہے اور کلام میں حذف کافی ہے یعنی جب تنور اُبلا اور حضرت نوح علیہ السّلام کو عذاب کی آمد کی خبر ہوئی تو اُنہوں نے کشتی میں ہر ایک کو سوار کیا اور فرمایا اِرْكَبُوا فیھا۔ الخ۔ کہ سوار ہو جاؤ اس میں درحالیکہ خدا کے نام کے ساتھ اس کی روانگی اور قیام ہوگا۔ یعنی مجری و مرسا دونو مصدر میمی ہوں گے اس صورت میں بسم اللہ ظرف ہے جو ایک فعل کے معنی کو متضمن ہے اور مجری اس ظرف کا فاعل اور محلاً مرفوع ہے یعنی ثبت بسم اللہ مجریھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ خبر مقدم ہو۔ اور مجریھا مبتدا موخر ہو۔ بہرکیف ان ہر دو ترکیب کے لحاظ سے معنی وہی ہوگا جو ابھی گذر چکا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب کشتی کو چلانا چاہتے تھے تو بسم اللہ مجریھا پڑھتے تھے۔ اور وہ چل پڑتی تھی۔ اور جب روکنا اور ٹھہرانا چاہتے تھے تو بسم اللہ مرساھا پڑھتے تھے اور وہ رک جاتی تھی۔

اس جملہ کی دوسری ترکیب یوں بھی ہو سکتی ہے کہ بسم اللہ الخ حال ہو۔ ارکبوا کے فاعل سے جو ضمیر جمع مخاطب ہے۔ یعنی اِرْكَبُوا فِيهَا مُتَبَرِّكِينَ بِسْمِ اللّٰهِ۔ اور اس صورت میں مجریھا و مرساھا دونو مصدر میمی نہ ہوں گے بلکہ ظرف کے صیغے ہوں گے اور ارکبوا ان کا عامل نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ معنی نہیں ہے کہ سوار ہو جاؤ بوقت روانگی اور بوقتِ قیام بلکہ ان دونو کا عامل اور متعلق وہی فعل ہوگا جس کو بسم اللہ متضمن ہے یعنی تبرک۔ پس اس صورت میں پورے جملے کا معنی یہ ہوگا کہ حضرت نوح نے فرمایا۔ سوار ہو جاؤ اس میں تبرک حاصل کرتے ہوئے اللہ کے نام سے بوقت روانگی اور بوقتِ قیام جیسا کہ تحت اللفظ مذکور ہے۔

(۴) لَا عَاصِمَ۔ مبنی علی الفتح ہے۔ کیونکہ معنی حرفی کو متضمن ہے گویا سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا کوئی ہے بچانے والا عذاب خدا سے تو جواب دیا گیا کہ لَا عَاصِمَ یعنی لیس من عاصم پس لاعاصم کو ایک اسم بنا کر معنی من کا اس کو متضمن کر دیا گیا اور اس کے بعد استثناء واقع ہے۔ اِلَّا من رحم اور اس میں تین قول ہیں (۱) مستثنا منقطع ہے۔ یعنی کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہ جس پر اللہ رحم کرے گا تو وہ تو بچ جائے گا۔ پس مستثنٰی منہ تھا بچانے والا اور مستثنٰی ہوا بچنے والا۔ اور مستثنٰی منقطع اسی کو کہتے ہیں کہ مستثنٰی منہ میں داخل نہ ہو (۲) مستثنٰی متصل ہے اور من رحم کا معنی راحم (خدا) ہے (۳) عاصم کا معنی معصوم ہو۔ اور من رحم کا معنی پہلی صورت کی طرح مَنْ رَحِمَہٗ ہو۔ یعنی کوئی نہ بچے گا مگر وہ جس کو اللہ بچا لے۔

(۵) تفسیر مجمع البیان میں ہے عرب روم اور ایران سام کی اولاد سے ہیں۔ اور حبشی حام کی اولاد ہیں اور ترک و چین وغیرہ یافث کی اولاد ہیں۔ واللہ الاعلم۔

یَا اَرْض۔ یعنی عذاب خدا آیا اور کفار غرق ہو گئے اور زمین نے پانی کو چوس لیا۔ جس طرح کسی کو کہا جائے کہ چوس لے۔ پس

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٥﴾ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ

اور ٹھہر گئی جودی پر اور کہا گیا کہ ہلاکت ہے ظالم لوگوں کے لئے اور پکارا نوح نے اپنے رب کو

فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٦﴾

اے رب تحقیق میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ حق ہے تحقیق تو محکم حکم کرنے والا ہے

قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ

(اللہ نے) فرمایا اے نوح تحقیق وہ نہیں تھا تیرے اہل سے تحقیق اس کا عمل نادرست تھا پس نہ مانگ مجھ سے وہ جو نہیں

اس نے چوس لیا ہو گویا یہ امر تکوینی ہے جو زمین کی فوری اطاعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے بارش بند ہو گئی جس طرح کہ اس کو کہا گیا ہو کہ بارش کو روک لے پس اُس نے روک دی ہو۔ اور یہ بھی امر تکوینی ہے کیونکہ آسمان کی اطاعت بھی اطاعت تکوینی ہے کہ وہ جب کسی شے کے متعلق ارادہ کرے کہ ہو جا، تو وہ ہو جایا کرتی ہے۔ اس مقام پر زمین و آسمان کا تقابل اور اقلعی اور ابلعی کے معانی کا تقابل اور لفظی حسن ایسے اُمور ہیں جو غیر اللہ سے قطعاً نہیں صادر ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ قریشیوں نے قرآن کے مقابلہ کے لئے تیاری کی تھی۔ اور چالیس دن تک دماغ کے لئے طاقتور غذاؤں کا استعمال جاری رکھا تھا۔ پس جب مقابلہ کا ارادہ کیا تو یہ آیت اُتری۔ پس قریش کے حوصلے پست ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ کلام انسانی طاقت سے بلند ہے۔

الْجُودِيِّ۔ مروی ہے کہ خدا نے پہاڑوں پر وحی کی کہ نوح کی کشتی کو میں کسی پہاڑ پر ٹھہراؤں گا تو سب پہاڑوں نے سر بلند کئے اور کوہ جودی نے تواضع اختیار کیا۔ پس نوح کی کشتی نے کوہ جودی پر قرار پکڑا۔ غالباً یہ بھی امر تکوینی ملحوظ ہے۔ اور کبر کی بُرائی اور تواضع کی محبوبیت کے اظہار کا انداز ہے کوہ جودی کے متعلق مروی ہے کہ وہ موصل کے علاقہ میں ایک پہاڑی ہے۔ اور ہم نے اگرچہ کسی کتاب میں نہیں دیکھا لیکن نجف اشرف کے قیام کے دوران میں عموماً یہی سُنا کرتے تھے کہ کوہ جودی یہی پہاڑی ہے جس کے دامن میں نجف کا شہر واقع ہے۔ اور وہ بارگاہِ شاہ ولایت کے جانب قبلہ میں واقع ہے۔ واللہ اعلم۔

فَقَالَ۔ حضرت نوح علیہ السّلام کی یہ درخواست اس بنا پر تھی کہ ان کا بیٹا منافق تھا۔ اور ظاہراً مومنوں میں داخل تھا اور خدا کا وعدہ بھی تھا کہ مومنوں کو نجات دوں گا۔ اسی بنا پر تو حضرت نوحؑ نے خدا کو اپنا وعدہ بھی جتلایا کہ تیرا وعدہ سچا ہے۔ پس جب خدائے عالم الغیب نے یہ خبر دی کہ اس کے عمل غیر صالح تھے جن کی بنا پر وہ باوجود تیرے بیٹے ہونے کے تیری اہل سے کٹ چکا ہے لہٰذا ایسی بات کا سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے تو اس کے بعد حضرت نوح نے خاموشی اختیار کر لی اور بیٹے کے غرق ہونے کی پرواہ نہ کی بلکہ اپنی طرف سے معذرت پیش کی جیسا کہ اگلی آیت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

إِنَّهُ عَمَلٌ۔ یہ انّ پہلے انّ سے بدل ہے اور مقولہ قول ہے۔ اور ھا ضمیر غائب کے مرجع کے متعلق اختلاف ہے۔ جو لوگ انبیاء میں عصمت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ھا ضمیر غائب کا مرجع وہ سوال ہے جو پچھلی آیت میں حضرت نوح کی بیٹے

لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ

مجھے اس کا علم تحقیق میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ مت ہو ظالموں میں سے کہا اے رب تحقیق پناہ لیتا

اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ

ہوں تیری کہ مانگوں تجھ سے وہ جس کا مجھے علم نہیں اور اگر نہ بخشے تو مجھے اور نہ رحم کرے مجھ پر تو

مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾ قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ

ہونگا میں خسارہ پانیوالوں میں سے کہا گیا اے نوح اتر جا ساتھ سلامتی کے ہم سے اور برکتوں کے جو تم پر ہیں اور

کے حق میں دعا کو متضمن ہے۔ اب اس فقرہ کا معنی یہ ہوگا کہ تحقیق وہ تیرے اہل سے نہیں ہے اور تحقیق تیرا اس کے حق میں نجات کا سوال کرنا عمل غیر صالح ہے۔ پس حضرت نوح کو دھمکی دی گئی کہ ایسے سوال مت کیا کرو۔ پس حضرت نوح نے معذرت پیش کی اور معافی بھی مانگ لی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عقلی و نقلی دلیلوں سے ثابت ہے کہ خدا کے فرستادہ نبی و رسول معصوم ہوتے ہیں اور ہم نے اس موضوع پر تفسیر کے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے۔ لہٰذا یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پس جب عصمت انبیاء مسلمات میں سے ہے تو ہر وہ مقام جہاں ظاہر میں عصمت انبیاء سے ٹکراؤ لازم آئے وہاں روایت ہو یا آیت ہو۔ اس کی تاویل ضروری ہوا کرتی ہے لیکن وہ مقام جہاں آیت کے دو یا کئی معانی نکل سکیں اور ان میں سے کوئی عصمت انبیاء سے متصادم ہو تو ایسی صورت میں عصمت انبیاء سے ٹکرانے والے معنی کو رد کیا جائے گا۔ اور اس معنی کا اختیار کرنا واجب ہوگا جو عصمت انبیاء سے تصادم یا منافات نہ رکھتا ہو۔ پس اس مقام پر ضمیر غائب کا مرجع سوال نوح بھی بن سکتا ہے اور فرزند نوح بھی بن سکتا ہے لیکن پہلی صورت میں عصمت نوح سے منافات لاتی ہے۔ لہٰذا دوسری صورت کا اختیار کرنا واجب ہے۔ پس معنی اس طرح ہوگا کہ تحقیق وہ تیری اہل سے نہیں ہے اور تحقیق اس کے عمل ناشائستہ ہیں۔ باقی رہا یہ کہ بعد میں دھمکی کیوں دی گئی اور نوح نے معافی کیوں مانگی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی برے فعل سے روکنے کا موثر طریقہ یہ ہے کہ کسی بڑے کی طرف کلام کا رخ کر دیا جاتا ہے اور چھوٹوں کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ حقیقۃً مقصود بڑے نہیں ہوا کرتے بلکہ چھوٹے ہی مقصود ہوا کرتے ہیں جس طرح نبی علیہ السّلام کی طرف خطاب کرکے کہا گیا ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو تیرے اعمال باطل ہو جائیں گے۔ یہ خطاب اگرچہ نبی کو ہے لیکن مراد اس سے مشرکین مکہ ہیں۔ اور خطاب کو زیادہ سے زیادہ موثر کرنے کے لئے یہ طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے پس اس مقام پر نوح کی معذرت و معافی اسی مقصد کو اور زیادہ واضح اور مضبوط کرنے کا ایک محکم دستور ہے اور عملٌ کا مضاف محذوف ہے اور یہ اس کے قائم مقام ہے۔

قِیْلَ۔ طوفان کے ختم ہونے اور پانی کے خشک ہونے کے بعد حکم ہوا کہ اب برکت و سلامتی سے اتر جاؤ اور ممکن ہے کہ حالات

عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ

ان لوگوں پر جو تیرے ہمراہ ہیں اور کئی جماعتیں جن کو ہم دنیاوی نفع دیں گے پھر پہنچے گا ان کو ہم سے دردناک

اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ

عذاب یہ غیب کی خبروں میں سے جو وحی کرتے ہیں ہم تیری طرف ان کو تو نہ جانتا تھا اور نہ

وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع

تیری قوم اس سے پہلے پس صبر کر تحقیق انجام خیر متقی لوگوں کے لئے ہے

حاضرہ کے اعتبار سے زبانِ حال کی ترجمانی ہو۔ اور مقدر یہ ہو کہ طوفان کے بعد وہ امن و سلامتی سے اتر گئے۔

وَ اُمَمٌ۔ یعنی ان نجات پانے والوں کی نسل سے ہونے والی اُمتوں کو ہم ایک وقت تک دنیاوی منافع سے بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ دیں گے۔ اور وہ جب بے شکری اور نافرمانی کو اپنا شیوہ بنائیں گے تو ان کو بھی دردناک عذاب میں گرفتار کر لیا جائے گا اور اسی طرح زمانہ گذرتا رہے گا۔

علم غیب تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ۔ تمام انبیاء کے قرآنی واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء کے لئے علم غیب ضروری نہیں۔ اور خدا پر واجب نہیں کہ جس کو نبی بنائے اُسے علمِ غیب بھی عطا کر دے تاکہ یہ نتیجہ نکالا جائے کہ جو غیب کو نہ جانتا ہو وہ نبی نہیں ہو سکتا۔ اور اسی بنا پر خود جناب رسالتمآبؐ نے اپنے متعلق متعدد بار ارشاد فرمایا کہ میں غیب نہیں جانتا اور قرآن مجید میں اس کی حکایت موجود ہے اور اس آیت مجیدہ میں بھی خداوند کریم صاف ارشاد فرماتا ہے کہ یہ غیب کی باتیں ہیں ہم بذریعہ وحی آپ کو اطلاع دے رہے ہیں ورنہ اس سے قبل نہ آپ ان کو جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم کو ان کا پتہ تھا۔

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شیعہ اپنے ائمہ کو عالم الغیب کہتے ہیں وہ محض مذہب شیعہ کو بدنام کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں ورنہ مذہب شیعہ کا اس عقیدہ فاسدہ سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ ہے اور انبیاء و ائمہ صرف اتنا جانتے ہیں جتنا خدا ان کو علم دے۔ البتہ تمام انبیاء سے حضرت رسالتمآبؐ علم میں زیادہ تھے اور خدا نے ان کو اس قدر دیا کہ اور کسی کو نہ دیا اور باوجود علم کثیر ہونے کے یہ بفرمانِ خدا دعا مانگتے تھے رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ یعنی اے پروردگار مجھے زیادہ علم عطا فرما اور حضورؐ کے بعد آپ کے اوصیاء طاہرین ائمہ معصومین علیؑ سے لے کر مہدی علیہ السلام تک ان کے علم کے صحیح وارث ہیں اور کوئی نبی یا وصی ان کے پایہ علمی تک نہیں پہنچ سکتا۔

الحاصل:۔ وہ مسائل جن کا اصلاح معاشرۂ انسانی سے تعلق ہو۔ خواہ وہ تدبیر نفس سے مرتبط ہوں یا تدبیر منزل و سیاست ملکیہ سے وابستہ ہوں ان میں وہ علم کلی کے مالک تھے اور علاوہ ازیں تاریخی مسائل یا ماکان و مایکون کے حوادث و واقعات ضروری حد تک جانتے تھے حتیٰ کہ کسی سائل کے جواب میں وہ عاجز نہیں آسکتے تھے اور خداوندکریم حسب مصلحت ان کے

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ

اور بھیجا قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو تو اس نے کہا اے قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں تمہارا کوئی معبود سوائے اس کے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا

نہیں ہو تم مگر افترا کرنے والے اے قوم میں نہیں مانگتا تم سے اس کی اُجرت مجھے اُجرت وہ دے گا

عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا

جس نے مجھے پیدا کیا کیا تم نہیں سمجھتے اور اے قوم معافی مانگو اپنے رب سے پھر اس کی طرف رجوع

اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا

کرو وہ بھیجے گا بارش تم پر متواتر اور بڑھائے گا تمہاری طاقت پر اور طاقت اور نہ

تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ

منہ پھیرو مجرم بن کر کہنے لگے اے ہود تُو کوئی معجزہ نہیں لایا اور ہم نہیں چھوڑیں گے اپنے

اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ

خداؤں کو تیری باتوں سے اور نہ ہم تجھ پر ایمان لاتے ہیں ہم اور کچھ نہیں کہتے مگر صرف یہ کہ

علم میں اضافہ فرماتا رہتا ہے اور بعض مقامات پر وقتی طور پر کسی امر کی طرف ان کا متوجہ نہ ہونا ان کے نقص کی دلیل نہیں بن سکتا بلکہ یہ ان کا تقاضائے بشری ہے اور اس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا علم اللہ کا عطیہ ہے کہ وہ جب چاہے جس قدر چاہے ان کو امورِ غیر معلومہ کا حسبِ ضرورت علم عطا فرماتا ہے اور یہ اپنے علم بلکہ جملہ صفاتِ کمالیہ میں اپنے پروردگار کے فیوض کے محتاج ہیں اور اس کی عنایات پر شاکر ہیں

رکوع نمبر ۵ ، حضرت ہود کا ذکر

اَخَاهُمْ ۔ نسب میں شریک ہونے کی وجہ سے ان کو ان کا بھائی کہا گیا اور کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ یمن میں آباد تھا۔ آپ نے ان کو توحید کی دعوت دی اور اغیار کی خدائی کو باطل اور ان کا افترا قرار دیا اور پھر معاوضہ لینے کے احتمال کی نفی کی۔ اور خوشنودئ خدا کا طریقہ یہ بتایا کہ پہلے سابقہ گناہوں کی معافی طلب کرو اور پھر تعلیماتِ اسلامیہ پر ثابت قدم ہو جاؤ اور استغفار اور توبہ کا یہی مطلب ہے اور ممکن ہے کہ یہاں ثُمَّ صرف عطف کے لئے ہو۔ اور دونو کا مقصد ایک ہی ہو۔ پس استغفار کے بعد توبہ کا ذکر صرف تاکید کے لئے ہو۔

اَلسَّمَآءَ ۔ یہاں سماء سے مراد بارش ہے کیونکہ وہ اسی جانب سے آتی ہے پس مجازاً اس پر سماء کا اطلاق کیا گیا ۔ کہتے ہیں ۔ کہ

بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا

پکڑ لیا ہے تجھے ہمارے کسی خدا نے بُری طرح تو آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اس سے بیزار ہوں جس

تُشۡرِكُوۡنَ ۙ﴿۵۴﴾ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِیۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾

کا تم شرک کرتے ہو اس کے علاوہ پس مکر کرو میرے ساتھ سب پھر مجھے مہلت نہ دو

اِنِّیۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیۡ وَرَبِّكُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ

تحقیق میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے کوئی جاندار نہیں مگر یہ کہ وہ اس کا مالک ہے

اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ

تحقیق میرا پروردگار صراط مستقیم پر ہے پس اگر تم نہ مانو تو میں پہنچا چکا وہ جس کے ساتھ میں

بِهٖۤ اِلَيۡكُمۡ ؕ وَيَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۚ وَلَا تَضُرُّوۡنَهٗ شَيۡـــًٔا ؕ اِنَّ

بھیجا گیا اور پیچھے لائے گا میرا رب تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اور تم اس کو نقصان نہ دے سکو گے تحقیق

رَبِّیۡ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ حَفِيۡظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا هُوۡدًا وَّالَّذِيۡنَ

میرا رب ہر شے کا نگہبان ہے اور جب آیا ہمارا عذاب تو ہم نے نجات دی ہود کو اور ان کو

اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿۵۸﴾ وَ

جو ایمان لائے اس پر ساتھ اپنی رحمت کے اور ان کو ہم نے نجات دی زبردست عذاب سے اور

وہ قحط میں مبتلا تھے۔ پس حضرت ہود نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ایمان لائیں اور تائب ہو جائیں تو خدا بارش بھیج کر ان کو رزق فراوانی سے عطا فرمائے گا۔

مَا جِئۡتَنَا۔ آیات و معجزات کو دیکھ کر انکار کر دیا کہ تو کوئی دلیل و معجزہ نہیں لایا کیونکہ جو چیز حضرت ہود پیش کرتے تھے وہ اس میں شبہ و شک پیدا کر کے انکار کر دیتے تھے۔

اِعۡتَرٰىكَ۔ یعنی تو چونکہ ہمارے خداؤں کا انکار کرتا ہے لہذا ہمارے کسی خدا کی گرفت میں آگیا ہے پس بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

فَكِيۡدُوۡنِیۡ۔ یعنی تم اپنی ہر تجویز و فریب کو استعمال کرو میں کلمۂ حق کو تمہارے پھندے میں آکر ہرگز ترک نہ کروں گا۔ اور انبیاء کے معجزوں میں سے یہ معجزہ سب سے اہم اور واضح ہے کہ باوجود یکا و تنہا ہونے کے اعلانیہ کہتے تھے کہ تم سب مل کر مجھے تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو اور وہ باوجود کمال دشمنی و عناد کے اور کثرت و اجتماع کے انبیاء کو ضرر دینے پر قادر نہ ہو سکتے تھے

تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ

اس قوم عاد نے انکار کیا اپنے رب کی نشانیوں کا اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی اور اتباع کی ہر سرکش ظالم کے

عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ

حکم کی اور پیچھے لگا دی گئی ان کے اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی آگاہ ہو تحقیق قوم

عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ

عاد نے کفر کیا اپنے رب کا آگاہ ہو ہلاکت ہے ہود کی قوم عاد کے لئے اور بھیجا ثمود کی طرف ان کے بھائی

صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ

صالح کو تو اس نے کہا اے قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں تمہارا کوئی معبود سوائے اس کے اس نے پیدا کیا تمہیں

مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ

زمین سے اور آباد کیا تمہیں اس میں پس معافی مانگو پھر رجوع کرو طرف اس کے تحقیق میرا

رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ

رب قریب ہے قبول کرنے والا ہے کہنے لگے اے صالح تحقیق تو تھا ہم میں اُمید گاہ اس سے پہلے

اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا [۲۲۱] - یہ ملکیت سے کنایہ ہے۔

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ [۲۲۱] - یعنی وہ عادل ہے اور اس کی ہر پُر از حکمت تدبیر ایک سیدھا راستہ ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا [۲۲۱] - یہ اتمام حجّت کے طور پر عذاب کی دھمکی ہے۔

حَفِيْظٌ [۲۲۱] - یعنی بندوں کے اعمال کا نگہبان ہے تاکہ ان کو ان کے مطابق جزا یا سزا دے۔

نَجَّيْنَا - تکرار اس لئے ہے کہ پہلے مقام پر ظاہری دنیاوی عذاب سے نجات دینا مقصود ہے۔ اور دوسری جگہ قیامت کے سخت عذاب سے نجات کا وعدہ ہے۔

رُسُلَهٗ - جمع مضاف استغراق کا فائدہ دیتی ہے گویا وہ تمام رسولوں کی نافرمانی کرنے والے تھے اور اس سے معلوم ہوا کہ ایک نبی کی مخالفت کرنے والے کو تمام انبیاء کا مخالف سمجھا جاتا ہے۔

رکوع نمبر ۶ حضرت صالح کا ذکر

وَاِلٰى ثَمُوْدَ - تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ قوم ثمود کی رہائش وادی قریٰ میں تھی جو مدینہ اور شام کے درمیان ہے اور حضرت صالحؑ ان کی برادری

اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ

کیا تو اب روکتا ہے کہ ہم عبادت کریں ان کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا اور ہم تیری اس دعوت سے گہرے شک میں

مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ

پڑ گئے ہیں فرمایا اے قوم دیکھو اگر میرے پاس اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل ہو اور

اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ

میرے پاس اس کی رحمت آئے تو کون میری مدد کرے گا اللہ سے اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم لوگ نہیں زیادہ کر رہے ہو

غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ

سوائے خسارے کے اور اے قوم یہ اللہ کی ناقہ تمہارے لئے نشانی ہے پس اس کو چھوڑ دو کہ کھائے

فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾

زمین خدا میں اور نہ مس کرو اس کو برائی سے ورنہ پکڑے گا تمہیں عذاب جلدی

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ

پس انہوں نے اس کو زخمی کر ڈالا تو کہا (صالح نے) جی لو اپنے گھروں میں تین دن یہ وعدہ جھوٹا نہیں

میں سے تھے۔ آپ نے اپنی دعوت میں پہلے غیر اللہ کی نفی کر کے توحید کو ثابت کیا پھر اس کے احسانات میں سے احسانِ عظیم یعنی خلعتِ وجود کا عطا کرنا یاد دلایا اور اسلام کا بنیادی اصول یہی ہے کہ انسان اپنے خالق کو پہچانے اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اپنی اُمتوں کو سب سے پہلے اسی طرف توجہ دلائی اور آخر میں پیدا کرنے کے بعد دیگر سہولیاتِ زندگی جو اس نے بیسر فرمائی ہیں، کا تذکرہ فرمایا جس کو واستعمرکم کی جامعیت شامل ہے کیونکہ یہ لفظ عمارت سے یا عمر سے مشتق ہے۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہوگا کہ اس نے تمہارے لئے زمین کی عمارت اور آبادکاری کی سہولتیں بہم پہنچائیں جو تمہاری بود و باش کے لئے ضروری ہیں اور دوسری صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں لمبی لمبی عمریں عطا کی ہیں تاکہ زندگانی دنیادی کی لذتوں سے جی بھر کر فائدہ اٹھاؤ اور کہتے ہیں کہ تین سو سے لے کر ایک ہزار سال تک ان کی عمریں تھیں۔

مَرْجُوًّا - یہ رَجَا یَرْجُوْا کے باب سے اسم مفعول کا صیغہ ہے یعنی وہ کہنے لگے کہ ہمیں آپ سے اچھائی کی توقع اور اُمید تھی لیکن آپ تو خلافِ توقع ہمیں اپنے خداؤں کی عبادت سے روک کر ایک نیا مذہب ایجاد کرنے لگے ہیں جس کی وجہ سے ہم آپ کے متعلق شک میں پڑ گئے ہیں اور مریب آیت میں شک کی صفت ہے۔

مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

ہے — پس جب آیا ہمارا عذاب تو ہم نے نجات دی صالح کو اور ان کو جو ایمان لائے اس پر اپنی

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

رحمت سے (عذاب سے) اور اس دن کی رسوائی سے — تحقیق تیرا رب قوی غالب ہے

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾

اور پکڑ لیا ان کو جو ظالم تھے ایک دھماکے نے تو ہو گئے وہ اپنے گھروں میں چمٹے ہوئے

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

گویا وہ کبھی آباد ہی نہ تھے اس میں آگاہ ہو تحقیق قوم ثمود نے کفر کیا اپنے رب کا آگاہ ہو ہلاکت ہے قوم ثمود کے لئے

وَلَا تَمَسُّوْهَا[۲۲۳] - یعنی ناقہ کو برائی سے مس نہ کرو۔ یہ ناقہ بطور معجزہ حضرت صالح کی دعا سے پتھر سے پیدا ہوئی تھی اور اس کا مفصل واقعہ سورہ اعراف پارہ ۸ میں تفسیر کی چھٹی جلد صہ[۴۹] تا صہ[۵۶] میں مذکور ہو چکا ہے۔

فَعَقَرُوْهَا[۲۲۴] - صیغہ جمع کا ہے۔ اگرچہ حضرت صالح کی ناقہ کو قتل کرنے والا ایک ہی شخص تھا۔ لیکن باقی قوم چونکہ اس کے فعل شنیع پر راضی تھی لہذا سب کو موردِ الزام قرار دے کر ان کی طرف اس فعل کی نسبت دی گئی اور عذاب میں سب کے سب ہی گرفتار کر لئے گئے۔ پس مجرموں کو پناہ دینے والے یا غلط کاروں کے افعالِ قبیحہ پر خوش ہونے والے اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور احادیث کا مسلّمہ ہے کہ مَنْ رَضِیَ بِفِعْلِ قَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ - یعنی جو شخص کسی قوم کے فعل سے راضی ہو تو گویا وہ خود کرنے والوں میں سے ہی شمار ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قائم آلِ محمدؑ تشریف لائیں گے تو دشمنانِ آلِ محمدؐ سے انتقام لیں گے کیونکہ یہ لوگ آلِ محمدؐ پر ظلم کرنے والوں کے افعال پر راضی تھے۔

اِنَّ ثَمُوْدَا۟ - بعض نے یہاں ثمود کو منصرف قرار دے کر تنوین دی ہے اور آخر میں غیر منصرف قرار دیا گیا ہے۔

تحقیق انیق

جو نام قبیلہ یا حی کے لئے استعمال ہوتے ہیں ان کی چند قسمیں ہیں (۱) وہ جو صرف حی کے لئے استعمال ہوں۔ اور وہ وہ ہیں جن کے ساتھ بنو یا بنی نہ لگ سکے جیسے قریش کیونکہ بنو قریش نہیں کہا جاتا (۲) وہ جو صرف قبیلہ کے لئے استعمال ہوں جیسے تمیم، قیس اور تغلب وغیرہ اور اسم قبیلہ ہونے کی وجہ سے تمیم بنت مر قیس ابنۃ غیلان اور تغلب ابنۃ وائل کہا جاتا ہے (۳) وہ جو کبھی باپ اور حی کے لئے مستعمل ہوں اور کبھی قبیلہ کے لئے بولے جائیں جیسے ثمود۔ پس قبیلہ کے اطلاق کے لحاظ سے نکرہ اور منصرف ہوں گے اور باپ یا حی کا علم ہونے کی حیثیت سے غیر منصرف ہوں گے۔ لہذا اس قسم کے ناموں کا منصرف یا غیر منصرف پڑھنا دونوں جائز ہیں اور قرآن میں جس طرح منقول ہے اسی طرح ہی پڑھنا چاہیئے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ

اور تحقیق پہنچے ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر انہوں نے سلام کیا تو آپ نے جواب سلام کہا اور بلا توقف

اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ

گائے بچے کا بھونا ہوا گوشت ان کے سامنے رکھا لیکن جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے اس کی طرف تو گھبرا گئے اور ان سے

وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾

ڈر محسوس کرنے لگے انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم بھیجے گئے ہیں طرف قوم لوط

وَامْرَاَتُهٗ قَاۗىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَاۗءِ اِسْحٰقَ

اور اس کی عورت کھڑی تھی پس وہ ہنسی تو ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد

يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ ھٰذَا

یعقوب کی کہنے لگی ہائے ہیں جنوں گی حالانکہ بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے تحقیق یہ

رکوع نمبر ۷ حضرت ابراہیم کا ذکر

رُسُلُنَا۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آنے والے فرشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کسی نے تین بیان کئے ہیں۔ یعنی جبریل۔ میکائیل اور اسرافیل، اور کسی نے چار ذکر کئے ہیں اور چوتھے کا نام کروبیل لکھا ہے۔ نیز نو اور گیارہ کے اقوال بھی ہیں اور مروی ہے کہ یہ فرشتے لڑکوں کی شکل میں تھے۔

بِالْبُشْرٰی۔ یہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔ اور اس میں تین قول ہیں (۱) حضرت اسحٰقؑ کی ولادت اور اس کی نبوت اور اس کی صلب سے حضرت یعقوب کے تولد کی بشارت تھی (۲) بروایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ہاجرہ کے شکم سے حضرت اسمٰعیل کے تولد کی بشارت تھی (۳) بعض نے کہا ہے حضرت لوط کے لئے عذاب کی خوشخبری تھی۔ مجمع البیان

عِجْلٍ حَنِيْذٍ۔ عجل گائے کے بچے کو کہا جاتا ہے اور حنیذ کا معنی ہے بھونا ہوا اور آیت مجیدہ سے مہمان کی ضیافت میں عجلت کرنے کا درس ملتا ہے۔

اَوْجَسَ۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے کھانا ان کے سامنے رکھا اور انہوں نے تناول کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیمؑ نے سمجھا کہ یہ کوئی خطرناک آدمی ہیں کیونکہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق اگر کوئی کسی کے ہاں جاتا اور اس کے ہاں ضیافت کو قبول نہ کرتا تو اس سے اس نووارد کا ڈاکو۔ چور یا راہزن ہونا سمجھا جاتا تھا لہذا اشراف طبقہ اگر ان کی مقاومت سے عاجز ہوتا تو ان کا خوفزدہ ہونا ایک فطری امر ہوتا تھا بنا بریں حضرت ابراہیمؑ ان سے خوفزدہ ہوئے اور ان کی وضاحت کے بعد مطمئن ہو گئے۔

لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ

عجیب بات ہے انہوں نے کہا کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے کام پر اللہ کی رحمت اور

بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَہَبَ

اس کی برکتیں تم پر ہیں اے گھر والے تحقیق وہ حمید و مجید ہے پس جب ختم ہوا ابراہیم

عَنۡ اِبۡرٰہِیۡمَ الرَّوۡعُ وَ جَآءَتۡہُ الۡبُشۡرٰی یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۴﴾

کا ڈر اور اسے خوشخبری بھی مل گئی تو جھگڑنے لگے ہم سے قوم لوط کے متعلق

اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیۡبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ

تحقیق ابراہیم حلیم آہ کرنے والے اور توکل کرنے والے تھے اے ابراہیم چھوڑو اس بات کو

ہٰذَا ۚ اِنَّہٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ ۚ وَ اِنَّہُمۡ اٰتِیۡہِمۡ عَذَابٌ غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾

تحقیق تیرے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آنے والا ہے

وَامۡرَاَتُہٗ ۔ ان کی عورت یعنی سارہ بنت ہاران تھی جو نسبت میں آپ کی چچا زاد تھی اور بعض نے خالہ زاد لکھی ہے ۔ یہ وہاں پس پردہ مہمان نوازی کے فریضہ کو انجام دینے کے لئے کھڑی تھی جب خلافِ توقع اُمور کو دیکھا تو ازراہِ تعجب ہنس پڑیں خواہ اس کی وجہ ملائکہ کا کھانے سے رکنا ہو یا حضرت لوط کی قوم کے عذاب کی خبر ہو یا تولد اسحٰق کی پیشین گوئی ہو ۔ اور آخری بات زیادہ واضح معلوم ہے کیونکہ اس وقت اس کی عمر ۹۸ یا ۹۹ برس تک پہنچ چکی تھی اور حضرت ابراہیم بھی سو برس کے لگ بھگ عمر رکھتے تھے اور ایک قول کے مطابق ایک سو بیس برس کے تھے ۔ بنا بریں تعجب اور ضحک کا صدور خلافِ توقع نہیں تھا ۔

اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ۔ لفظ اہل کی وضاحت اس سے قبل اسی جلد ص۱۱۱ میں اور جلد ششم ص۵۸ میں ہو چکی ہے ۔ مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے اور اس تحقیق کے پیش نظر حضرت سارہ کو اہل بیت کے خطاب سے یاد کرنا مطلق زوجہ کے اہل بیت ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی ۔ اس مقام پر رحمۃ اللہ الخ کا جملہ انکارِ تعجب کی علت ہے ۔ یعنی تعجب تو اس فعل پر کیا جاتا ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو لیکن جس کا سبب معلوم ہو ۔ اس پر تعجب نہیں ہوا کرتا یہاں سبب معلوم ہے اور وہ یہ کہ خدا ہر شئی پر قادر ہے اور اس کی رحمتیں اور برکتیں ہر وقت تم پر نازل ہوتی رہتی ہیں ۔ لہٰذا تعجب کرنے کا مقام نہیں ہے اور ممکن ہے یہ جملہ دعائیہ ہو کہ اے ابراہیم کے گھر والے تم پر خدا کی رحمت و برکت نازل ہو تعجب نہ کرو ۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ اس استعجاب کو رفع کرنے اور مزید تسکین قلب حاصل کرنے کی غرض سے سارہ نے حضرت جبرئیل سے نشانی طلب کی تو اس نے ایک خشک لکڑی کو ہاتھ میں لے کر دبایا پس وہ ہری ہو گئی اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بقدرتِ خدا ایک خشک لکڑی ہری ہو سکتی ہے

اسی طرح بوڑھا انسان بھی قدرتِ خداوندی سے حالت شباب کی طرف پلٹ کر قابلِ اولاد ہوسکتا ہے۔

یُجَادِلُنَا ۔ یعنی جب ابراہیمؑ سے خوف ٹل گیا اور لڑکے کی خوشخبری بھی مل گئی تو ہم سے یعنی ہمارے ملائکہ سے قوم لوط کے عذاب کے متعلق جھگڑنے لگ گئے۔ بات یہ تھی کہ جب اُنہوں نے قوم لوط کے عذاب کی خبر سنائی تو حضرت ابراہیم نے دریافت کیا کہ اگر ان میں پچاس مومن ہوں تو وہ بھی مبتلائے عذاب ہوجائیں گے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس حضرت ابراہیمؑ تعداد کو کم کرتے گئے کہ اگر ان میں چالیس تیس بیس حتیٰ کہ ایک مومن ہو تو وہ مبتلائے عذاب ہوگا تو فرشتے ہر سوال کے جواب میں نہیں کہتے رہے۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے حضرت لوط کے متعلق پوچھا تو فرشتوں نے جواب دیا کہ ہمیں اس بات کا پتہ ہے اور ہم اس کو بچالیں گے۔

یہ خیال رہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف جھگڑے کی نسبت دینا ان کے بار بار سوال کرنے کی بنا پر ہے۔ اگر فیصلہ خداوندی کے انکار و ردّ کی بنا پر ہوتا تو ان کو حلیم اور منیب کے گرانقدر خطابات سے نوازا نہ جاتا۔ آیت مجیدہ کا طرزِ بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ملائکہ سے سوال محبوبِ پروردگار تھا۔ چنانچہ حلم خوفِ خدا اور انابت کا ثمرہ اسے قرار دے کر مدحیہ رنگ میں بیان کیا۔ پس بنا بریں جدال کی نسبت بھی لُطفِ خداوندی اور عنایت الٰہیہ کے اظہار کی ایک تعبیر ہے جبھی تو بعد میں ارشاد ہوا۔ یَا اِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۔ اے ابراہیم اس بات کو چھوڑیئے عذاب تو ان پر ضرور آئے گا۔ اور وہ کسی صورت میں ٹل نہیں سکتا۔ اور اربابِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس لہجہ میں پیار و محبت کی کس قدر چاشنی ہے۔

انوارِ لطیفہ

(۱) سلام کا استعمال چار معانی کے لئے ہوا کرتا ہے (۱) سَلِمَ يَسْلَمُ کا مصدر جس طرح کہا جاتا ہے۔ سَلِمْتُ سَلَامًا (۲) ایک درخت کا نام ہے۔ چنانچہ ایک عرب شاعر نے سلام کو حرمل پر معطوف استعمال کیا ہے (۳) سلامت کی جمع سلام ہوتا ہے (۴) اللہ کا نام ہے۔ پس جنت کو دارالسّلام کہنا اس لئے ہے کہ وہ ہر رنج و غم سے سلامتی کا گھر ہے اور یا اللہ کی طرف نسبت ہے جو اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

(۲) آیت مجیدہ میں قَالُوْا سَلَامًا فرشتوں کے قول کی حکایت نہیں ہے کہ اُنہوں نے سلامًا کہا۔ کیونکہ یہ سلام کے مروّج استعمال کے خلاف ہے بلکہ یہاں فرشتوں کے مقولہ کی نقل بالمعنی ہے۔ جس طرح کوئی شخص مروج سلام کرتے ہوئے کہے السّلام علیکم تو کہا جاتا ہے کہ اُس نے سلام کہا۔ پس اسی بنا پر فرشتوں کے مقولہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے سلام کہا۔ اور سلامًا کی نصب قالوا کے مفعول ہونے کی بنا پر ہے۔ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا میں بھی یہی توجیہ انسب ہے۔

(۳) قَالَ سَلَامٌ ۔ میں سلام پر نصب نہیں ہے کیونکہ اس کا اعراب حکائی ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام کے جواب کی حکایت ہے اور اس کے مرفوع ہونے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں یا تو مبتدا ہے اور اس کی خبر علیکم محذوف ہے اور یا خبر ہے۔ اور اس کا مبتدا امری یا شانی محذوف ہے۔

(۴) سلام کی تین تعبیریں ہیں (۱) نکرہ تنوین کے ساتھ یعنی سلامٌ علیکم اور قرآن مجید میں اس کا استعمال بکثرت موجود ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ بِسَلَامٌ عَلٰی نُوْحٍ ۔ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہٖ وغیرہ (۲) الف ولام کے ساتھ معرفہ کرکے السلام علیکم اور قرآن مجید میں اس کا استعمال بھی موجود ہے۔ جیسے السّلام علیّ (۳) سلامُ علیکم۔ یعنی نکرہ بغیر تنوین کے گویا کثرت استعمال کی وجہ سے تنوین کو حذف کر دیا گیا ہے پس ان میں سے افضل پہلی صورت ہے پھر دوسری۔

(۵) اکثر نحویوں کا نظریہ یہ ہے کہ نکرہ بغیر تخصیص کے مبتدا واقع نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ سلام کو مبتدا بنانے کی صورت میں اس کی تخصیص کا بہانہ یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ اس کی متکلّم کی طرف نسبت ہے۔ لہذا اس میں جہت اختصاص موجود ہے لیکن محققین کے نزدیک اس قسم کے بہانے فضول ہیں۔ اور ان کے نزدیک ہر وہ اسم خواہ نکرہ ہو یا معرفہ مبتدا بن سکتا ہے۔ جس کے مبتدا ہونے میں افادیت کا پہلو ہو۔ پس اگر نکرہ کے مبتدا ہونے میں افادیت موجود ہے تو اس کا مبتدا ہونا درست ہے اور بخلاف اس کے اگر معرفہ کے مبتدا ہونے میں افادیت نہیں تو اس کا مبتدا قرار دینا ناجائز ہے۔ سلام علیکم میں متکلّم کی طرف نسبت کا بہانہ اس لئے بھی غلط ہے کہ یہ جملہ دعائیہ ہوا کرتا ہے اور اس میں مخاطب کے لئے سلامتی کی دعا ملحوظ ہوتی ہے۔ پس افادیت کے پیش نظر اس کا مبتدا ہونا درست ہے اور یہی موقف بلا شک وشبہ قابل قبول ہے۔

(۶) ضحک اگر ضاد کا کسرہ ہو تو اس کا معنی ہے ہنسنا اور اگر ضحک ضاد کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے حیض۔ اور آیت مجیدہ میں ضَحِکَتْ کے معنی میں دونوں تاویلیں کی گئی ہیں۔ اور دوسری تاویل کی رو سے معنی یہ ہوگا کہ فوراً ان کا بڑھاپا جوانی سے بدل گیا

(۷) یعقوب پر بعضوں نے ضمہ اور اکثر نے فتحہ پڑھا ہے۔ ضمہ پڑھنے والے اس کو مرفوع قرار دیتے ہیں کہ یہ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یا ظرف من وراء اسحٰق کا فاعل ہے اور جو لوگ فتحہ پڑھتے ہیں وہ اس کی تین توجیہات کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسحٰق پر عطف ہے اور غیر منصرف ہونے کی وجہ سے اس کی جَر فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ توجیہ اس لئے ناقابل قبول ہے کہ با حرفِ جر عامل اور یعقوب مجرورِ معمول کے درمیان من وراء اسحٰق کا ناقابلِ برداشت فاصلہ ہے اور سیبویہ نے اس قسم کے عطف کو قبیح قرار دیا ہے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ عطف علی المحل ہو۔ یعنی یعقوب کا اسحٰق کے محل پر عطف ہو۔ اور اسحٰق چونکہ محلاً منصوب ہے لہذا یعقوب بھی منصوب ہے۔ اور یہ توجیہ بھی سابق بیان کی روشنی میں ضعیف ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی فاصلہ ناقابل برداشت اور قبیح ہے اور اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ یعقوب منصوب ہے اور اس کا عامل فعل محذوف ہے یعنی وَھَبْنَالَہٗ یَعْقُوْبَ اور یہی توجیہ بہتر ہے۔

حضرت لوطؑ کا ذکر

قصہ یہ ہے کہ وہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر حضرت لوطؑ کے پاس حسین وجمیل لڑکوں کی شکلوں میں پہنچے جب کہ وہ شہر کے باہر اپنی کھیتی میں موجود تھے اور انہوں نے آتے ہی ان کے ہاں مہمان رہنے کی خواہش ظاہر کی اور حضرت لوطؑ اپنی قوم کے کردار سے واقف تھے اور انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ فرشتے ہیں۔ پس گھبرا گئے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا

اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس تو اس کو برا لگا اور ان کی وجہ سے وہ تنگدل ہوا اور کہنے لگا کہ یہ

يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا

دن سخت ہے اور اس کی قوم اس کے پاس دوڑتی ہوئی آگئی اور پہلے سے ہی وہ

يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

عادی تھے برائی کے تو فرمایا کہ اے قوم یہ میری بیٹیاں زیادہ موزوں ہیں تمہارے لئے پس اللہ سے ڈرو

وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ

اور مجھے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی شریف آدمی نہیں ہے؟ کہنے لگے تو جانتا ہے کہ

مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ

ہمیں لڑکیوں کی خواہش نہیں ہے اور تجھے پتہ ہے جو ہم چاہتے ہیں فرمایا کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ

سِيْٓءَ بِهِمْ۔ سوءٌ مصدر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ یعنی ان کی وجہ سے کوفت میں مبتلا ہوا۔

يُهْرَعُوْنَ۔ اس کا مصدر اہراع باب افعال ہے۔ اس کا معنی ہے دوڑانا۔ یعنی دوڑائے جا رہے تھے مقصد یہ ہے کہ ان کے اندر بے حیائی اور غلط کاری کا جذبہ اس قدر تیز تھا کہ وہ ان کو فوراً دوڑائے ہوئے آ رہا تھا اور ہم نے اس کا مرادی ترجمہ کر دیا ہے کہ وہ دوڑتے ہوئے آئے۔

وَمِنْ قَبْلُ۔ آیت مجیدہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ کی بعثت سے پہلے وہ اس فعل بد کے عادی ہو چکے تھے۔

بَنَاتِيْ۔ اس جگہ قوم کی لڑکیاں مراد ہیں کیونکہ نبی اپنی اُمت کا باپ ہوا کرتا ہے۔ پس جس طرح اُمت کے لئے نبی کی ازواج مائیں ہوا کرتی ہیں اسی طرح اُمت کی لڑکیاں نبی کی لڑکیاں کہی جا سکتی ہیں۔ اور اس جگہ مقصد یہ ہے کہ حضرت لوطؑ نے بطور نصیحت کے اپنی قوم کی صحیح فعل کی طرف رہنمائی کی۔ اور لواطہ سے باز رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اس کا نعم البدل عورتوں سے شادی کر کے ان سے مجامعت کرنے کی رغبت دلائی۔ پس بَنَاتِيْ سے حضرت لوطؑ کی صلبی بیٹیاں مراد لینا اور یہ کہنا کہ اس زمانہ میں مسلمان لڑکی کا کافر سے رشتہ جائز تھا یا یہ کہ نبی زادی کافر سے شادی کر سکتی تھی۔ سراسر غلط بلکہ انبیاءؑ کی توہین کے مترادف ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت لوطؑ کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ زعوراء اور ریثاء اور یہ ناممکن ہے کہ اپنی پوری اُمت کے مردوں کو صرف اپنی دو لڑکیوں سے شادی کرنے کی پیش کش کر رہے ہوں معاذ اللہ۔ پس معلوم ہوا کہ اُمت کے مردوں کو اُمت کی لڑکیوں سے جائز طور پر نکاح کرنے کی دعوت تھی۔

قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ

کی طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا (فرشتے) بولے اے لوط ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں یہ ہرگز تیرے قریب

يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ

نہ آسکیں گے پس چلے جاؤ اپنے اہل کو لے کر رات کے حصہ میں اور تم میں کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے تیری

اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ

بیوی کے کہ اس کو پہنچے گا وہ عذاب جو ان کو پہنچے گا تحقیق عذاب کا مقررہ وقت صبح ہے کیا صبح

الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا

قریب نہیں ہے ؟ تو جب آیا ہمارا امر ہم نے کر دیا ان کے اوپر کو نیچے (یعنی ان کی زمین کو الٹ دیا) اور ان پر

مِنْ حَقٍّ۔ چونکہ انسان کی یہ عادت ہے کہ جس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے اُس کی طرف رغبت کرتا ہے۔ اور اس کا عکس یہ ہے کہ جس شے کی طرف رغبت کرتا ہے وہ اُس کا حق ہوتا ہے۔ اور عکسِ نقیض اس طرح ہوگا کہ جس میں اس کی رغبت نہیں وہ اس کا حق ہی نہیں اور چونکہ وہ لڑکیوں کی طرف رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا ان میں کوئی حق نہیں ہے اور مقصد یہ ہے کہ ہماری رغبت چونکہ لڑکوں میں ہے۔ اور تو بھی اس بات کو جانتا ہے لہٰذا لڑکوں کا مطالبہ ہمارا حق ہے اور اس کو ہم ہرگز نہ چھوڑیں گے تو جب حضرت لوطؑ نے ان کے اس چیلنج کا جائزہ لیا تو بے بس انسانوں کی طرح یہ فقرے زبان سے جاری کئے کہ کاش آج میرے پاس تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی تو میں تمہیں اس جرأت کا مزہ چکھاتا اتنے میں فرشتے بول اُٹھے کہ اے لوط تمہیں غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہم فرشتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے عذاب کا حکم لے کر آئے ہیں۔ یہ لوگ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ پس راتوں رات اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ اس طرف جبریل نے انگلی کا اشارہ کیا کہ وہ سب اندھے ہو گئے۔

لَا يَلْتَفِتْ۔ اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں۔ یہ کہ پیچھے مڑ کر کوئی نہ دیکھے یا یہ کہ اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے مال ومتاع کا خیال دل میں کوئی نہ لائے یا یہ کہ پیچھے کوئی نہ رہ جائے یا یہ کہ دھماکہ سننے سے پیچھے کی کوئی پرواہ نہ کرے۔

اِلَّا امْرَاَتَكَ۔ یعنی تمہاری بیوی اس حکم کی خلاف ورزی کرے گی۔ اور اپنی قوم کے ساتھ شریک عذاب ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اہل سے استثنا ہو یعنی یہ کہ سب گھر والوں کو ساتھ لے کر نکل جاؤ سوائے اپنی بیوی کے اور اہل کے معنی کی تحقیق گذر چکی ہے ص۲۱

اِنَّ مَوْعِدَهُمْ۔ جب حضرت لوطؑ نے اپنی بدکار قوم کے معذب ہونے کی خبر سنی تو دریافت کیا کہ کب عذاب آئے گا تو جبریل نے جواب دیا کہ ان کے عذاب کا مقررہ وقت صبح ہے تو مروی ہے کہ حضرت لوطؑ نے جلدی کی خواہش کی تو فرشتوں نے جواب

عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۖ وَمَا هِيَ مِنَ

برسائے پتھر اوپر سے پے در پے جو اللہ کے نزدیک معین تھے اور یہ عذاب

الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ﴿٨٣﴾ وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا

ظالموں سے دور نہیں ہے اور بھیجا قوم مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو انہوں نے کہا اے قوم عبادت کرو

اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ

اللہ کی کہ نہیں تمہارا کوئی معبود اس کے سوا اور نہ کم کرو ناپ اور تول کو تحقیق میں تم کو اچھی حالت پر دیکھ رہا ہوں

دیا کہ صبح بھی تو قریب ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عذاب خداوندی اپنے مقرر کردہ وقت پر ہی آتا ہے۔ خواہ کوئی اس کی تاخیر سے دل تنگ ہی کیوں نہ ہو۔

جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا۔ مروی ہے کہ جبرئیل نے اپنے پَر سے اُن کی زمین کے طبقہ کو اس قدر بلند کیا کہ اُن کے مرغوں اور کتوں کی آوازیں اہل آسمان سُنتے تھے۔ پس وہاں سے اُس کو الٹا کر کے پھینک دیا اور اُن پر پتھر بھی برسائے گئے۔ اور یہ چار بستیاں تھیں جن کو موتفکات بھی کہا گیا ہے۔ سدوم۔ عامراہ۔ دوما اور صبوائیم۔ اور ان کا بڑا شہر سدوم تھا۔ اور حضرت لوط کی رہائش اسی میں تھی۔

سِجِّيلٍ۔ بعض نے کہا ہے یہ لفظ فارسی سے عربی میں منتقل ہوا ہے۔ پس سنگ سے سجیل بنا لیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سجیل سے مراد آسمان اول ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خدا نے ان کے سروں پر ایک بادل بھیج دیا جس سے اولوں کی طرح ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ اور منضود پے درپے کے معنی میں ہے۔ یعنی پتھروں کی موسلا دھار بارش ان پر برسائی گئی اور مُّسَوَّمَةً کا معنی ہے علامت دار۔ اور اس کی کئی تاویلیں کی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر ایک پتھر پر اس آدمی کا نام لکھا ہوا تھا جس کے لئے وہ معین تھا۔

وَمَا هِيَ۔ اس لفظ سے تمام اُمتِ اسلامیہ کو بھی سرزنش اور تنبیہ کر دی گئی ہے کہ ہر ظلم کرنے والے کو اگر خدا چاہے تو اس عذاب سے معذب کر سکتا ہے۔ لہٰذا ظالموں کو خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہونا چاہیئے۔

مروی ہے۔ کہ قوم لوط کا ایک آدمی ان دنوں حرم کی حدود میں داخل تھا۔ لہٰذا اس کے نام کا پتھر آسمان اور زمین کے درمیان معلق رہا جب وہ حرم سے باہر آیا تو پتھر گرا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اور مروی ہے کہ عذاب میں گرفتار ہونے والوں کی کل تعداد چالیس لاکھ تھی (مجمع البیان) اور مروی ہے کہ حضرت لوط پر ایمان لانے والی صرف اس کی دو بیٹیاں ہی تھیں (مجمع)

چونکہ قوم لوط پر دو قسم کے عذاب آئے ایک یہ کہ ان کے طبقہ زمین کو اُلٹا یا گیا۔ اور دوسرا یہ کہ پتھر برسائے گئے۔ پس ممکن ہے کہ پہلے ان پر سنگباری ہوئی ہو اور پھر زمین کو اُلٹایا گیا ہو۔ یا یہ کہ ان کے دو گروہ کر دئے گئے ہوں۔ ایک گروہ کو ایک عذاب

وَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ﴿۸۴﴾ وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ

اور مجھے تم پر کسی سخت دن کے عذاب کا ڈر ہے اور اے قوم پورا کرو ناپ اور تول کو

بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۸۵﴾

انصاف سے اور نہ کم دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فسادی بن کر

بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۸۶﴾

اللہ کی عنایت تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو اور میں تمہارا پاسبان نہیں ہوں

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ

کہنے لگے اے شعیب کیا تیری نماز تجھے کہتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں اس کو جس کو ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے یا چھوڑ دیں

فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ یٰقَوْمِ

وہ جو اپنے مالوں میں ہم اپنی مرضی سے کرتے ہیں بس تو ہی دانا اور سمجھدار ہے فرمایا اے قوم کیا

اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْہُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ

دیکھتے ہو کہ اگر میں اپنے رب سے دلیل پر قائم ہوں اور عطا کرے وہ اپنی جانب سے مجھے اچھی عطا (تو اُسے چھوڑ دوں)

دیا گیا ہو۔ اور دوسرے کو دوسرا عذاب دیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔ خداوند کریم تمام مومنین کو ایسے جرائم سے محفوظ و مصئون رکھے۔

رکوع نمبر ۸ ما حضرت شعیبؑ کا ذکر

وَاِلٰی مَدْیَنَ - کہتے ہیں کہ مدین حضرت ابراہیم کا فرزند تھا اور یہ لوگ اس کی اولاد سے تھے۔ اور حضرت شعیب ان کی برادری میں سے تھے۔ لہذا ان کو ان کا بھائی کہا گیا ہے۔ یہ لوگ تول اور ناپ میں دھوکہ کرتے تھے کہ دینے میں کم اور لینے میں زیادہ کر لیتے تھے پس حضرت شعیبؑ نے ان کو اس فعلِ بد سے روکا۔ اور فرمایا کہ خدا کی طرف سے تم پر نعمتوں کی فراوانی ہے۔ اور تم اچھی حالت میں ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا یہ کردار موجب عذاب ہو کر زوالِ نعمت کا باعث بن جائے۔ پس اللہ کی عبادت کرو اور تول ناپ پورا رکھو۔ اور لوگوں کے ساتھ دھوکا نہ کرو۔ پس تول و ناپ کے منصفانہ فعل سے جو جائز نفع تمہیں ملے گا اُسی میں برکت زیادہ ہوگی۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ایسا کرو۔ ورنہ میں تمہارا چوکیدار نہیں ہوں۔

اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ - تاویل مصدر میں ہو کر اس کا عطف ما پر ہے۔ یعنی کیا تجھے نماز کہتی ہے کہ ہم ماں باپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اور اپنے اموال میں جو اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں اس کو ترک کر دیں۔

ا حضرت شعیب حضرت ابراہیم کے فرزند مدین کی اولاد میں سے تھے۔ طبری جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ مروج الذہب ج ۱ ص ۶۴

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ
اور میں خود بھی اس چیز کی مخالفت نہیں کرنا جس سے تم کو روکتا ہوں میں تو صرف اصلاح ہی چاہتا ہوں جس قدر

مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾
کر سکتا ہوں اور نہیں میری توفیق مگر اللہ سے اسی پر میری توکل ہے اور اسی کی طرف ہی بازگشت ہے

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ
اور اے قوم نہ حقدار بنائے تمہیں میری مخالفت کہ پہنچے تمہیں (عذاب) جس طرح قوم نوح

اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا
اور قوم ہود اور قوم صالح کو پہنچا اور لوط کی قوم بھی تم سے دور نہیں اپنے رب سے بخشش

رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ
طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو تحقیق میرا رب رحیم اور ودود ہے کہنے لگے اے شعیب

اِنَّكَ ؔ ۲۳۱ یہ جملہ تہکم اور استہزاء کے طور پر ہے یعنی کیا تو ہی ہم میں ایک دانا ہے اور باقی سب پاگل ہیں ؟ یعنی ایسا نہیں ہے اور مروی ہے کہ حضرت شعیبؑ نماز زیادہ پڑھتے تھے۔ اسی لئے اس کی قوم نے اس کو نماز کا طعنہ دیا۔ اور آج کل بھی لوگ نمازیوں کو بالعموم نماز کا ہی طعنہ دیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو گذشتہ اقوام کے انجام سے باخبر ہو کر عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

اِنْ كُنْتُ ۔ یعنی اللہ کی جانب سے میرے پاس برہان بھی ہو۔ اور اس کی نعمت نبوّت بھی مجھ کو ملی ہو تو کیا ان کی پرواہ نہ کروں اور تمہارے جذبات کے تابع ہو کر ہدایت سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ یہاں جزائے شرط محذوف ہے۔

وَمَآ اُرِيْدُ ۔ یعنی میں ایسا نہیں ہوں کہ تم کو ایک بُری چیز سے روکوں اور خود اُس کو بجا لاؤں۔ یعنی میں تمہارے لئے وہ چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور اسی کا نام خیرخواہی اور اصلاح ہے۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ ۔ مقصد یہ ہے کہ تمہارا میری مخالفت کرنا میرے لئے نقصان دہ نہیں بلکہ تمہارے اپنے لئے مضر ہے پس سوچ لو کہ کہیں میری عداوت تمہیں عذاب خداوندی کی طرف نہ کھینچ لے جائے۔ جیسا کہ سابقہ اقوام کی تاریخ تم جانتے ہو۔

اسْتَغْفِرُوْا ۔ یعنی پہلے سابقہ گناہوں کی بخشش طلب کرو۔ اور پھر ساتھ ہی آیندہ کے لئے اس کی اطاعت کا عزم کرو۔ اور اسی ذات کی طرف رجوع کرو۔ وہ اب بھی تم پر رحم کرنے کو تیار ہے کیونکہ وہ رحیم ہے اور اپنے بندوں سے محبّت کرتا ہے۔

مَا نَفْقَهُ ؔ ۲۳۲ ۔ فقہ لغت کے لحاظ سے سمجھ لینے کو کہتے ہیں۔ اگرچہ اصطلاح فقہاء میں مسائل شرعیہ فرعیہ کو ادلہ تفصیلیہ سے جاننے کا نام ہے۔ اس مقام پر قوم شعیب کا مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ لوگ آپ کی مدلّل و مبرہن گفتگو کے جواب سے

مَا نَفۡقَهُ كَثِيۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ وَاِنَّا لَنَرٰٮكَ فِيۡنَا ضَعِيۡفًا‌ ۚ وَلَوۡلَا رَهۡطُكَ

ہم نہیں سمجھتے بہت کچھ جو تم کہتے ہو اور ہم تم کو اپنے میں کمزور سمجھتے ہیں اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو

لَرَجَمۡنٰكَ‌ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡنَا بِعَزِيۡزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِىۡۤ اَعَزُّ

ہم تم کو مار ڈالتے ورنہ تمہاری ہمیں کوئی پاس نہیں ہے فرمایا اے قوم کیا میرا قبیلہ زیادہ عزت دار ہے

عَلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِيًّا‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ بِمَا

تمہارے نزدیک اللہ سے اور اس کو تم نے اپنی پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا ہے تحقیق میرا رب احاطہ کرنے

تَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ‌ ؕ

والا ہے اس کا جو تم عمل کرتے ہو اے قوم تم اپنی جگہ کام کرو اور میں اپنا کام کرتا ہوں ۔ عنقریب

سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَمَنۡ هُوَ كَاذِبٌ‌ ؕ وَارۡتَقِبُوۡۤا

جانو گے کہ کس پر آتا ہے رسوا کن عذاب اور کون جھوٹا ہے اور انتظار کرو

اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا شُعَيۡبًا وَّالَّذِيۡنَ

میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں اور جب ہمارا امر آیا تو ہم نے شعیب کو نجات دی اور ان کو جو

عاجز ہوئے تو کہنے لگے ہمیں آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور ہر جھوٹے اور ضدی کا جواب ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے اور خدا اس کو عبرت کے لئے ذکر فرما رہا ہے۔

لَنَرٰٮكَ ۔ ان کے اس جواب میں دھمکی بھی ہے اور تکبر کا اظہار بھی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ کا دستور رہا ہے کہ جھوٹا طبقہ چونکہ معقول بات سے عاجز ہوتا ہے ۔ لہذا اپنی ہٹ دھرمی پر برقرار رہنے کے لئے یا تو مخاطب سے کہتا ہے کہ مجھے تیری بات سمجھ میں نہیں آتی اور یا قوت بازو پر سہارا لے کر اس کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔

ظِهۡرِيًّا ۔ کسی شے کو پیٹھ کے پیچھے ڈالنے اور اس سے لاپرواہی برتنے کو انہی الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ حضرت شعیب علیہ السّلام کا مفصل قصہ تفسیر ہذا کی چھٹی جلد ص۵۸ میں مذکور ہو چکا ہے ۔ لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں ۔

امام علی رضا علیہ السّلام سے منقول ہے ۔ صبر کے ساتھ ۔ فرج کا انتظار کرنا بہتر ہے ۔ جیسا کہ حضرت شعیبؑ کا قول ہے ۔ وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ ۔

رکوع نمبر ۹ ۔ حضرت موسےٰؑ کا ذکر | اٰيٰتِنَا ص۲۳۵ یہ آیت کی جمع ہے ۔ یہاں مراد ہیں وہ نشانیاں جو غلبہ

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا

ایمان لائے اس پر اپنی رحمت سے اور پکڑ لیا ظالموں کو سخت آواز نے پس ہو گئے

فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا

گھروں میں چپٹے ہوئے گویا کہ کبھی آباد ہی نہیں تھے آگاہ ہو ہلاک ہوئے مدین جیسے

بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾

ہلاک ہوئے ثمود اور تحقیق ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور غلبہ ظاہری دے کر

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

فرعون اور اس کی قوم کی طرف تو وہ پیچھے چلے حکم فرعون کے اور فرعون کا حکم ہدایت نہیں تھا

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۗ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

وہ آگے چلے گا اپنی قوم کے بروز قیامت، اور ان کو وارد کرے گا دوزخ میں اور وہ وارد ہونیکا برا گھاٹ ہے

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

اور ان کے پیچھے لگائی گئی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی اور یہ بُری مہمانی ہے

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾

یہ گذشتہ بستیوں کی باتیں ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں ان میں سے کچھ باقی ہیں اور کچھ ختم ہو چکی ہیں

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو نہ فائدہ دیا ان کو ان کے خداؤں نے جن کو وہ

کی موجب نہیں۔ اور سلطان سے مراد ظاہری قوت وطاقت ہے جو غلبہ کی موجب ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو الگ ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یہ عطف خاص علی العام ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا ذکر اسی جلد میں ص۱۷۵ تا ص۱۸۲ مفصل بیان ہو چکا ہے۔

فَاَوْرَدَهُمْ۔ چونکہ فرعون کا بمعہ اتباع کے جہنم میں جانا یقینی ہے اسی لئے صیغہ ماضی سے اس کی تعبیر کی گئی ہے کہ گویا یہ واقعہ بھی ہو چکا ہے۔

قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ۔ یعنی کچھ آباد اور کچھ برباد ہیں یا بعض کے نشان موجود اور بعض بالکل معدوم ہیں یا بعض کی مکانیت موجود اور

يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوهُمْ

پکارا کرتے تھے خدا کے علاوہ کچھ بھی جب آیا تیرے رب کا عذاب اور نہ ان کو کچھ انہوں نے

غَيْرَ تَتْبِيبٍ ﴿١٠١﴾ وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ

دیا سوائے ہلاکت کے اور اسی طرح گرفت ہے تیرے رب کی جب گرفت کرے بستیوں کو کہ وہ ظالم

ظَالِمَةٌ ؕ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ

ظالم ہوں تحقیق اس کی گرفت سخت دردناک ہے تحقیق اس میں نشانی ہے اس کے لئے جو

عَذَابَ الْآخِرَةِ ؕ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ

عذاب آخرت سے ڈرے وہ دن جس میں جمع کیا جائے گا سب لوگوں کو اور وہ دن حاضری کا ہوگا

﴿١٠٣﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ

اور ہم اس کو نہیں ٹال رہے مگر ایک مقررہ وقت تک جب آئے گا تو نہ بات کریگا کوئی نفس

إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ

سوائے اسکی اجازت کے کچھ لوگ شقی اور سعید ہوں گے جو شقی ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے

لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ

کہ ان کی وہاں چیخ و پکار ہوگی ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان و

ساکن ہلاک ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ نہ مکان باقی رہے اور نہ مکین باقی رہے۔

أَخَذَ الْقُرَىٰ۔ مضاف محذوف ہے یعنی اہل قریٰ۔ مقصد یہ ہے کہ اہل قریہ جب ظالم ہوتے ہیں تو خدا ان کو پکڑ لیتا ہے اور جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہے کہ خدا ظالم کو مہلت دیتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو سخت پکڑتا ہے۔

لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ۔ یعنی قیامت ایک معین وقت تک مؤخر کی گئی ہے۔ اور اس کے وقوع کی تاریخ کا سوائے پروردگار کے کسی کو علم نہیں ہے۔

إِلَّا بِإِذْنِهِ۔ اس جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اذن پروردگار سے بات کرنے والے بات کرسکیں گے۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ يَوْمَ لَا يَنطِقُونَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ۔ یعنی وہ ایسا دن ہوگا کہ لوگ بول نہ سکیں گے اور ان کو اذن بھی نہ دیا جائے گا کہ عذر خواہی کرسکیں۔ پس ان دو نو آیتوں میں تناقض لازم آتا ہے لیکن اس کا جواب

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۰۸﴾ وَ

زمین باقی ہیں مگر جب خدا چاہے تحقیق تیرا خدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور

اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

جو سعید ہوں گے وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ ؕ عَطَاۤءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۹﴾ فَلَا تَكُ فِیْ

باقی ہیں مگر جو خدا چاہے ان کے انعام و اکرام کی کوئی حد نہ ہوگی پس نہ شک میں پڑو

یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کی حاضری کے مواقف بہت ہوں گے۔ پس بعض موقف وہ ہوں گے۔ جن میں بولنے کی قطعاً کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ اور بعض موقف ایسے بھی ہوں گے کہ باذن پروردگار بولا جا سکے گا۔ اسی طرح ایک اور جگہ بھی دو آیتوں میں ظاہراً تناقص بتایا ہے کہ ایک میں فرماتا ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ کہ کسی جن و انسان سے اس کے گناہ کے متعلق نہ پوچھا جائے گا کیونکہ اللہ کو سب کچھ معلوم ہے۔ اور اُسے مزید تحقیق کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور دُوسری میں فرماتا ہے۔ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ۔ ان کو روکو کہ ان سے پوچھا جانا ہے۔ ان دونو آیتوں میں اگرچہ ظاہراً تناقص ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جاننے کے لئے نہ پوچھا جائے گا۔ بلکہ سرزنش کے طور پر پوچھا جائے گا۔ پس دونو باتیں پوچھنا اور نہ پوچھنا درست ہیں۔

مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ۔ عرب لوگ چونکہ کسی شے کا دوام اسی انداز سے بیان کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے محاورہ کے پیش نظر یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے ورنہ آسمان و زمین کی بقا کا زمانہ بطور تحدید کے نہیں ہے تاکہ سمجھا جائے کہ جب تک آسمان و زمین باقی رہیں گے۔ دوزخی دوزخ میں رہیں گے۔ اور جب آسمان و زمین فنا ہوں گے۔ تو دوزخی بھی دوزخ سے نکل جائیں گے۔ بہر کیف عرب محاورہ کے مطابق دوام کے معنی کو اس تعبیر سے ادا کیا گیا ہے نہ کہ تحدید ہے کیونکہ تحدید اور خلود میں منافرت ہے۔

اِلَّا مَا شَاۤءَ۔ جنتیوں اور دوزخیوں کے دوام سے استثناء ہے۔ یعنی جنّت یا دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے مگر جب خدا چاہے۔ تو علماء نے اس مقام کو مشکلاتِ قرآن سے قرار دیا ہے کیونکہ اپنے مقام پر مسلّم ہے کہ کافر ہمیشہ بلا استثناء جہنم میں رہے گا اور مومن ہمیشہ بلا استثناء جنّت میں رہے گا۔ پس اس جگہ مشیت پروردگار کا استثناء اس عقیدہ سے متصادم ہے تو علمائے اعلام نے اس مقام کو حل کرنے کے لئے کافی توجیہات بیان کی ہیں لیکن ہیں ان میں سے انسب توجیہ یہ سمجھتا ہوں کہ آیت مجیدہ میں سعادت و شقاوت اُصولی نہیں بلکہ فرعی ہے۔ یعنی جن لوگوں کے اصول و عقائد درست ہونگے اور اعمال میں کمزوری ہوگی تو اپنے اعمالِ بد کی سزا کے طور پر وہ جہنم میں جائیں گے۔ پس شقی ہوں گے۔ اور اعمال کی سزا بھگتنے کے بعد داخلِ جنّت ہوں گے۔ پس سعید بن جائیں گے۔ پس ایسے شقی شقاوتِ عملی کی بنا پر جہنم میں جائیں گے۔ اور انہیں

مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ

اس سے جو پوجتے ہیں یہ لوگ یہ نہیں پوجا کرتے مگر جس طرح پوجا کرتے تھے ان کے باپ دادا پہلے سے

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ

اور تحقیق ان کو ہم پورا حق دیں گے بلا کم و کاست اور تحقیق ہم نے موسٰی کو کتاب دی

چونکہ اس سزا کے میعادی ہونے کا علم نہ ہوگا لہٰذا وہ اپنے مقام پر دائمی سزا سمجھیں گے۔ اس بنا پر اس کو دوام وخلود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جب مشیّتِ پروردگار سے ان کو معافی دے کر جہنم سے نکالا جائے گا تو وہ نیک بخت وسعید ہو جائیں گے پس دوزخیوں کے لئے مشیت کا استثناء اس بنا پر ہے کہ دوزخ میں اپنے زعم کے لحاظ سے ہمیشہ رہیں گے مگر جب خدا چاہے گا تو نکل آئیں گے۔ اور جنّتیوں کے لئے اس طرح درست ہوگا کہ وہ جنّت میں ہمیشہ رہیں گے مگر وہ عرصہ جو جنّت میں پہنچنے سے قبل بطور سزا کے جہنّم میں گذاریں گے۔ اور بعض روایات سے اسی توجیہ کے شواہد بھی موجود ہیں جن کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور ظاہراً یہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو عقائد صحیح رکھتے ہوں لیکن گنہ گار ہوں اور مرنے سے قبل توبہ نہ کر سکے ہوں ورنہ توبہ سے تو گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ پس یہاں سعید وشقی دو گروہ نہیں بلکہ ایک ہی گروہ ہے، جو ایک زمانہ میں شقی اور دوسرے زمانہ میں سعید ہوگا۔ اور منھم شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ کا یہی مطلب ہے کہ اہلِ محشر میں ایک گروہ ہوگا جو دو وقتوں کے لحاظ سے شقی وسعید ہوگا۔ واللہ اعلم

رکوع نمبر ۱

اَلْكِتٰبَ۔ یہاں کتاب سے مُراد تورات ہے اور اس میں اختلاف کا مقصد یہ ہے کہ یہودیوں کے پاس جب حضرت موسٰےؑ کتاب لائے تھے تو اُن میں سے بعض مان گئے تھے۔ اور بعضوں نے انکار کر دیا تھا اور حضرت موسٰےؑ سے ان کا اختلاف کرنا قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے۔ اور ممکن ہے کہ حضرت موسٰےؑ کے بعد اس کی صداقت اور صحت کے متعلّق اتفاق نہ رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تحریف کے متعلّق اشارہ ہو یا اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختلاف مُراد ہو کہ بعضوں نے عمل کیا۔ اور بعضوں نے نہ کیا۔ پس اس اختلاف کو معرضِ ذکر میں لا کر حضرت رسالتمآبؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کی قوم کا آپ سے اختلاف کرنا اور قرآن کو تسلیم نہ کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اس سے قبل انبیاء سے ان کی قوموں کا یہی سلوک رہا ہے۔ چنانچہ حضرت موسٰےؑ جب کتاب لائے تھے تو ان کی قوم بھی بگڑ گئی تھی۔

وَلَوْلَا۔ یعنی علم پروردگار میں قیامت کے ایک مقررہ وقت پر وقوع کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور مصلحت اسی میں ہے کہ جزا اور سزا کا وہی ایک دن ہو۔ ورنہ اگر اس تاخیر میں مصلحت نہ ہوتی تو مومنوں کو فوراً جزا دی جاتی اور کافروں کو فوراً سزا دی جاتی جیسے کہ انسانی جذبات کا تقاضا ہے۔

اِنْ كُلًّا لَّمَّا۔ اس فقرہ کو چار طرح پڑھا گیا ہے۔ (۱) اِنَّ كُلًّا لَّمَا (۲) اِنْ كُلًّا لَّمَا (۳) اِنَّ كُلًّا لَّمَّا (۴) اِنْ كُلًّا لَّمَّا

فَاخْتُلِفَ فِيهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ

تو اس میں اختلاف پڑ گیا اور اگر پہلے بات نہ ہو چکی ہوتی تیرے رب سے تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا اور تحقیق یہ لوگ

لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ

بڑے گہرے شک میں پڑے ہیں اور تحقیق ہر ایک کو پوری دے گا تیرا رب جزا اعمال کی

إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ

تحقیق وہ ساتھ اس کے جو کرتے ہیں آگاہ ہے پس ثابت رہو جس طرح تم کو حکم دیا گیا اور وہ جو تائب ہو کر آپ کے ہمراہ ہیں

پہلی قرأت کی رو سے ترکیب صاف ہے کہ کُلًّا اسم منصوب ہے اور خبر پر لام تاکید داخل ہے۔ یعنی لَمَا لیکن اس کے بعد فعل پر بھی لام داخل کیا گیا ۔ لَيُوَفِّيَنَّهُمْ تو چونکہ ایک جگہ دو لام تاکید اکٹھے ہو گئے لہذا فاصلہ کے لئے درمیان میں ما زائدہ کو داخل لَمَا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ۔

دوسری قرأت میں اِنْ اِنَّ کا مخفف ہے اور اس کو عمل دیا گیا ہے باقی ترکیب وہی ہے۔

تیسری قرأت میں اِنَّ کے اسم اور خبر کے درمیان لَمَّا کو داخل کرنا جو اِلَّا کے معنی میں اشکال کا موجب ہے۔ اور چوتھی قرأت میں اِنْ اِنَّ کا مخفف ہے اور اس کے اسم و خبر کے درمیان لمّا کا داخلہ بھی اشکال سے خالی نہیں ہے۔

فَاسْتَقِمْ۔ استقامت سے امر کا صیغہ ہے۔ اور اس کا معنی ہے مامور بہ کا ادا کرنا اور منہی عنہ سے رکنا۔ اس مقام پر پروردگار عالم کی طرف سے حضورؐ کو خطاب ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اپنی ڈیوٹی پر ثابت رہو کہ خود بھی عمل کرو اور لوگوں کو بھی عمل کی تبلیغ کرتے رہو۔ اور آپؐ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو بھی اس خطاب میں شریک قرار دیا گیا ہے کہ آپؐ اور آپ کے ساتھ رہنے والے سب استقامت پر ہیں یعنی آپ ادائے رسالت کریں اور وہ قبول کرنے کا فریضہ ادا کریں اور استقامت کے حکم کے بعد فوراً فرمایا کہ سرکشی نہ کرو اور میری فرمائشات سے ذرّہ بھر بھی ادھر اُدھر نہ ہونا اور پھر سرزنش کے طور پر یہ بھی فرما دیا کہ میں غافل نہیں ہوں بلکہ تمہاری ہر بات سے آگاہ و خبردار ہوں۔

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ قرآن کی تمام فرمائشات میں سے یہ فرمائش حضورؐ پر نہایت سخت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ کے بال کیوں جلد سفید ہو گئے تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ شَيَّبَتْنِي الْهُودُ وَالْوَاقِعَةُ۔ یعنی مجھے سورہ ہود اور واقعہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوا ۔ یعنی ظالموں کی طرف میلان نہ کرو۔ اور چونکہ بارشاد قرآن شرک ایک بڑا ظلم ہے تو مقصد یہ ہوا کہ مشرکوں سے محبت کا رشتہ نہ رکھو۔ اور عام ظالموں سے محبت رکھنے کی ممانعت اس آیت کا صریحی فیصلہ ہے۔ اسی بنا پر ظالم و جابر حکومت کی ملازمت میں اشکال کیا جاتا ہے۔ جب تک کہ مصلحت مفسدہ پر غالب نہ ہو۔ کیونکہ ظالم حکومت کا ہر ظالمانہ فیصلہ

وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا

اور نہ سرکشی کرو تحقیق وہ جو تم کرتے ہو جاننے والا ہے اور نہ جھکو طرف ان کے جنہوں نے ظلم کیا ورنہ

فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿١١٣﴾

چھوئے گی تم کو آگ اور نہیں تمہارا اللہ کے علاوہ کوئی مددگار پھر تم مدد نہ کئے جاؤ گے

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ

اور قائم کرو نماز کو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کی ابتدا میں تحقیق نیکیاں ختم کرتی ہیں

السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ

گناہوں کو یہ نصیحت ہے قبول کرنے والوں کے لئے اور صبر کر کہ تحقیق اللہ نہیں ضائع کرتا

ملازمین کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ پس وہ ان کے ظلم میں شریک ہو جائیں گے۔ اور جس طرح ظلم میں شریک ہونا ظلم ہے۔ اسی طرح ظلم پر راضی ہونا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اور رکون کا معنی ہے محبت خیر خواہی اور اطاعت۔ اور اسی آیت کی رُو سے جن لوگوں نے آلِ محمدؐ پر مظالم کا دروازہ کھولا ان کی طرف رکون و میلان بھی ظلم ہے۔ پس ان سے محبت رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ پس یہ آیت قیامت تک کے لئے ظالموں اور ظالموں کے ساتھیوں سے بچنے کا حکم دے رہی ہے۔

نماز کے اوقات

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ۔ آیت مجیدہ میں خداوند کریم نے نماز کے صرف تین وقت تبلائے ہیں کہ قائم کرو نماز کو دن کے دونوں کناروں میں (اور اس سے مراد صبح اور زوال کے بعد کے دو وقت ہیں) اور رات کے پہلے حصہ میں۔ پس دن کے پہلے کنارہ میں نماز صبح اور دوسرے کنارہ میں دو نمازیں ظہر و عصر اور رات کے پہلے حصہ میں دو نمازیں مغرب و عشا ہیں۔ گویا ان تین وقتوں میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ یہاں بھی تین وقت ہیں۔ دلوک الشمس سے مراد ہے زوال کے بعد۔ اور اس وقت میں دو نمازیں ہیں۔ ظہر و عصر اور غسق اللیل میں دو نمازیں ہیں مغرب اور عشاء اور قرآن فجر سے مراد صبح کی نماز ہے۔ بعض لوگوں نے دن کے دو کنارے صبح اور مغرب قرار دئے ہیں لیکن یہ اس لئے درست نہیں ہے کہ کنارہ شے کا وہ ہوتا ہے جو اس کا آخری حصہ ہو۔ اور مغرب دن کا حصہ نہیں ہے۔ پس دو کنارے صبح اور بعد زوال کے دو وقت مراد ہیں۔ اور زلف جمع ہے زلفۃ کی جس کا معنی ہے منزلت اور ابن عباس سے منقول ہے کہ یہاں زلف سے رات کا ابتدائی حصہ مراد ہے۔

پس قرآن مجید کی ان آیتوں کی رُو سے جب نمازوں کے اوقات تین ثابت ہوئے تو جمع بین الصلواتین کا مسئلہ

خودبخود صاف ہوگیا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ظہر وعصر کے لئے الگ الگ وقت نہیں بلکہ صرف ترتیب کا فرق ہے کہ پہلے ظہر ہو اور بعد میں عصر ہو۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کے درمیان حد نہیں مقرر کی گئی۔ پس ایک وقت میں دو نمازیں رکھی گئی ہیں صرف ترتیب کا فرق ہے کہ پہلے مغرب ہوگی اور بعد میں عشاء ہوگی۔ اور جو لوگ قرآن پر عامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں ان آیات کی روشنی میں جمع بین الصلوٰتین کے جواز کو قبول کر لینا چاہیئے۔ اور احادیث نبویہ میں اس مطلب کی تائید مزید بھی موجود ہے۔ چنانچہ صحاح ستہ میں صاف اور صریح روایات موجود ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے بغیر کسی عذر بیماری یا بارش وغیرہ کے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا۔

نماز کے فضائل

اِنَّ الْحَسَنٰتِ ۔ یہاں حسنات سے مراد نمازیں ہیں۔ یعنی نمازیں درمیان میں واقع ہونے والے گناہوں کو ختم کرتی ہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ نمازیں بھی پڑھتا رہے اور درمیان میں گناہ بھی کرتا رہے۔ پس نمازیں اس کے درمیانی گناہوں کو کھاتی رہیں گی بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس کے دل میں نماز کی اہمیت موجود ہوگی۔ اس کے سامنے خدا کی عظمت کا تصور رہوگا۔ پس درمیانی عرصہ میں گناہ کرنے سے اس کو شرم محسوس ہوگی کہ ابھی خدا کی بارگاہ میں کس منہ سے پیش ہوں گا۔ پس یہ تصور آہستہ آہستہ اس کو گناہوں سے نجات دلا دے گا اور نماز کے فحشا اور منکر سے روکنے کا بھی یہی مقصد ہے۔ اور اسی طرح ایک حدیث ذاکرین وواعظین میں مشہور ہے کہ حُبُّ عَلِیٍّ یاکُلُ الذّنوب کما تاکل النّار الحطب کہ علیؑ کی محبّت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جایا کرتی ہے۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ علی کی محبت رکھنے کے بعد جس قدر چاہے گناہ کرتا پھرے کیونکہ علی کی محبّت ان سب کو کھا جائے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ علی کی محبّت سے پہلے جو گناہ موجود تھے وہ ولائے علی کی بدولت ختم ہو جائیں گے اور بعد میں علیؑ کی محبت کے ہوتے ہوئے نئے گناہ آنہ سکیں گے۔ جس طرح آگ سے پہلے کی لکڑیوں کو آگ جلا دیتی ہے اور بعد میں جب تک آگ رہے وہاں نئی لکڑی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور اس قسم کی تمام احادیث وروایات کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نیکی اور بدی کی محبّت یک جا نہیں ہو سکتی۔ اور علی کی محبت اور گناہوں کی محبّت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی جس طرح لکڑی اور آگ ایک جگہ نہیں رہ سکتیں۔

(۱) بروایت واحدی ابوعثمان سے منقول ہے کہ میں ایک مرتبہ حضرت سلمانؓ کے ہمراہ ایک درخت کے نیچے تھا کہ سلمانؓ نے ایک خشک ٹہنی کو پکڑ کر ہلایا یہاں تک کہ اس کے پتے گر پڑے۔ پھر فرمایا اے عثمان تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ پس میں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو سلمان نے جواب دیا کہ میں ایک مرتبہ حضرت رسالتمآبؐ کے ہمراہ تھا اور ایک درخت کے نیچے انہوں نے بھی ایک خشک ٹہنی کو حرکت دی تھی کہ اس کے پتے گر پڑے تھے اور مجھے فرمایا تھا کہ اے سلمان؛ کیا تم مجھ سے پوچھتے نہیں ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو میں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ پس آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمان جب صحیح وضو کر کے پانچ نمازوں کو ادا کرتا ہے تو اس کے وجود سے گناہ اس طرح گرتے ہیں۔ جس طرح پتے درخت سے گرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہی آیت تلاوت فرمائی تھی۔

(۲) ابوامامہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ مسجد میں تشریف فرما تھے اور ہم بھی بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آکر عرض کی حضورؐ! میں نے ایسا گناہ کیا ہے جس سے میرے اُوپر حد واجب ہے۔ لہٰذا میں حد کی سزا برداشت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کیا تو ہمارے ساتھ نماز میں شریک تھا تو اس نے ہاں میں جواب دیا۔ پس آپ نے فرمایا کہ خدا نے تیرا گناہ معاف کر دیا ہے۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ہم جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ مسجد میں نماز کی انتظار میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کی حضورؐ! مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا ہے تو آپ نے اس کی بات کو ٹال دیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو پھر اُس شخص نے اپنی بات دُہرائی تو آپ نے فرمایا کیا تو نے صحیح وضو کر کے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی۔ تو اُس نے کہا۔ ہاں میں نماز میں آپ کے ساتھ شریک تھا تو آپ نے فرمایا۔ بس تیرے گناہ کا کفارہ ہو گیا۔

(۴) حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے جب کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا تو آپ نے پُوچھا کہاں سے آیا ہے؟ پھر فرمایا کہ ہاں تو یہی جواب دے گا کہ میں فلاں فلاں جگہ سے آیا ہوں نہ طلب معاش کے لئے اور نہ عمل آخرت کے لئے۔ تم اس بات کو ملحوظ رکھا کرو کہ تمہارے شب و روز کس شغل میں بسر ہوتے ہیں۔ اور یقین جانو کہ ایک فرشتہ تم پر موکل ہے جو تمہارے ہر کام کو نوٹ کرتا ہے۔ اور جو جو باتیں تم لوگوں سے چھپاتے ہو وہ ان پر بھی مطلع ہے۔ پس شرم کیا کرو۔ کسی بُرائی کو چھوٹا نہ سمجھو۔ کیونکہ ایک دن اُس کا بُرا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ تمہاری نظروں میں وہ معمولی اور کم اہمیت کی ہو۔ کیونکہ ایک دن وہ تمہیں سرور بخشے گی۔ اور یقین کرو کہ انجام کے لحاظ سے نقصان دہ اور زود پشیمانی کی موجب گناہ سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اور کسی گناہ کے تدارک کے لئے نیکی سے بڑھ کر اور کوئی علاج نہیں ہے۔ اور بے شک نیکی بڑے سے بڑے اور پُرانے بھولے بھلائے ہوئے گناہوں کا بھی تدارک کر لیا کرتی ہے اور اس کو ختم کر دیتی ہے پھر آپ نے قرآن مجید کی یہی آیت پڑھی کہ نیکیاں گناہوں کو بھگا دیتی ہیں۔

(۵) ابوحمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ امام محمد باقر یا امام جعفر صادق علیہما السّلام نے فرمایا ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السّلام نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ قرآن مجید میں وہ کونسی آیت ہے جس میں سب سے زیادہ گنہ گاروں کو بخشش کی اُمید دلائی گئی ہے پس ایک شخص نے کہا وہ آیت یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ الآیۃ یعنی خدا شرک کو نہیں بخشتا۔ اور اس کے علاوہ تمام گناہ بخش دیتا ہے جس کے چاہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے لیکن یہ وہ آیت نہیں جو میں پُوچھتا ہوں۔ پس ایک شخص نے کہا وہ یہ ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ۔ الآیۃ۔ یعنی جو بُرا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر توبہ کرے تو خدا اُس کو بخش دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ ٹھیک ہے لیکن میری مُراد یہ نہیں ہے۔ پھر تیسرے آدمی نے یہ آیت پڑھی۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ یعنی کہہ دیجئے کہ اے وہ لوگ جو اپنے نفسوں پر اسراف کر چکے ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ آپ نے فرمایا خوب ہے۔ لیکن

یہ آیت وہ نہیں ہے۔ پھر چوتھا بولا۔ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً - الاية - یعنی وہ لوگ جو غلط کاری کے بعد پشیمان ہو جائیں تو ان کی لغزشیں معاف کی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ بھی خوب ہے لیکن وہ نہیں جو میں پوچھتا ہوں۔ اس کے بعد کسی میں بولنے کی ہمت نہ رہی تو آپ نے فرمایا اے گروہ مسلمین کیوں خاموش ہوگئے ہو تو عرض کرنے لگے کہ اب ہمیں کچھ معلوم نہیں پس آپ نے فرمایا۔ میں نے اپنے حبیب جناب رسالت مآبؐ سے سنا ہے کہ سب سے زیادہ بخشش کے لئے پُرامید کرنے والی آیت قرآن مجید میں یہ ہے۔ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ - الایۃ - اور آپ نے پُوری آیت پڑھی اور فرمایا۔ اے علیؑ مجھے اُس ذات کی قسم جس نے مجھے برحق بشیر و نذیر کرکے مبعوث فرمایا تم میں سے کوئی آدمی جب وضو کرکے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے اعضا سے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور جب اللہ کی بارگاہ میں شرف یاب ہو کر واپس ہوتا ہے تو اُس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا جیسا کہ شکمِ مادر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر دو نمازوں کے درمیان اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ بھی بخشی جاتی ہے اور پھر پانچوں نمازوں کا ذکر فرمایا پھر فرمایا۔ اے علی: میری اُمت کے لئے پانچ نمازیں اس طرح ہیں جس طرح کسی کے گھر کے دروازہ پر نہر جاری ہو تو جب اُس کے بدن پر کچھ میل موجود ہو۔ اور روزمرّہ اس نہر میں وہ پانچ مرتبہ غسل کرے تو کیا اس کے بدن پر پھر بھی میل رہ سکتی ہے؟ پس بخدا پانچ نمازیں میری اُمت کے لئے ایسی ہی ہیں۔

بہرکیف اس سے بڑھ کر نماز کی اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ بفرمان رسالت یہ مومن کی معراج ہے۔ اس میں انسان اپنے پروردگار سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے اور یہی انبیاء واولیاء کی آخری وصیّت ہے۔ خداوندِ کریم تمام مومنین کو نمازی بننے کی توفیق دے۔

خلاصۃ الکلام

فَلَوْلَا - اس سُورۂ مبارکہ میں خدا نے لوگوں کو عبادت کی دعوت دی اور پھر گذشتہ اُمتوں کی سرکشی اور ان کے گرفتارِ عذاب ہونے کا ذکر فرمایا۔ اور جناب رسالت مآبؐ کو تسلّی دے کر ان کو اپنے طریق کار پر ڈٹے رہنے کی فرمائش کی۔ اس کے بعد پھر لوگوں کو بطور تذکرہ کے ارشاد فرماتا ہے کہ موردِ عذاب ہونے کے بعد قوموں سے جو افراد بچ جاتے ہیں وہ ہلاک ہونے والوں کے انجام سے عبرت پکڑ کر لوگوں کو بُرائی سے روکتے کیوں نہیں اور اُولُوْ بَقِيَّةٍ کا معنی صاحبانِ دین، صاحبانِ برکت اور صاحبانِ تمیز بھی کیا گیا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بُرائیوں سے روکنے والا کوئی نہیں ہوتا تو اکثریت اس میں ملوث ہو جاتی ہے اور پھر وہ گرفتارِ عذاب ہو جاتے ہیں۔ البتہ ان میں سے تھوڑے لوگ (انبیاء یا صالحین) نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں لیکن ان کی ماننا کوئی نہیں کیونکہ ہمیشہ اکثریتی رجحان اقلیتی آواز کو دبائے رکھتا ہے پس اگر اکثریت بُرائی سے متنفر ہوتی تو تھوڑے خود بخود رُک جاتے یا اُن کو روکنا آسان ہوتا لیکن جب اکثریت بُرائی کو پسند کرتی ہو تو اقلیت کی آواز پر کان ہی کوئی نہیں دھرتا۔ اور آج کل جو کچھ ہو رہا ہے وہ عیاں راچہ بیان کا مصداق ہے کہ علمائے حق کو ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنیوالا ہی کوئی نہ ہو۔ اِلَّا قَلِيْلًا - یعنی ان باقی رہنے والوں میں سے تھوڑے نہی عن المنکر بھی کرتے ہیں پس وہ عمومی عذاب سے بچ جاتے

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ

نیکی کرنیوالوں کی جزا کو پس کیوں نہیں گذشتہ امتوں میں سے باقی ماندہ لوگ منع کرتے

يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ

زمین میں فساد کرنے سے سوائے قلیل کے جن کو ہم نے بچا لیا اُن میں سے اور اتباع کی

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ

ظالموں نے اس کی جس میں وہ خوشحال تھے اور تھے وہ جرم کرنے والے اور نہیں تیرا رب

لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ

ہلاک کرتا بستیوں کو ظلم سے جب کہ اُن کے بسنے والے اچھے ہوں اور اگر چاہتا تیرا رب تو کر دیتا

النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۗ

لوگوں کو ایک گروہ اور ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تیرا رب رحم کرے

ہیں۔اور اکثریت مجرمین کی ہوتی ہے اور وہ اس چیز کی اتباع کرتے ہیں جس میں وہ خوش حال ہیں۔یعنی وہ اسباب تعیش کے پیچھے چلتے ہیں۔اور ایسے علماء سوء بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو گناہوں پر ان کو جرأت دلاتے ہیں اور اپنے لقمہ تر کی خاطر ان کی عاقبت کو خراب کرتے ہیں۔

وَمَا كَانَ ۔ اس کے معنی میں تین احتمال ہیں (۱) بِظُلْمٍ جار و مجرور کا متعلق لِيُهْلِكَ ہو۔یعنی خدا ظلم کرتے ہوئے کسی بستی والوں کو ہلاک نہیں کرتا جب کہ بستی والے اچھے ہوں (۲) جار و مجرور محذوف کے متعلق ہو کہ ظرف مستقر بنے اور قریٰ کی صفت ہو۔یعنی خدا نہیں ہلاک کرتا کسی بستی کو جو ظالم ہو۔یعنی مشرک ہو جب کہ اس کے بسنے والے معاشرہ کے لحاظ سے اصلاح پسند ہوں (۳) بائے جارہ تعلیل کے لئے ہو۔یعنی خدا بعض افراد کے ظلم کی وجہ سے بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب کہ ان کی اکثریت نیکی پسند ہو۔

وجہ اختلاف

وَلَوْ شَآءَ ۔ یعنی اگر خدا چاہتا تو لوگ سب کے سب ایک دین پر ہوتے اور ان میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا یعنی خدا مجبور کر کے سب لوگوں کو دیندار کر سکتا ہے لیکن یہ بات اس کی مصلحت سے خارج ہے وہ چاہتا ہے کہ انسان کو عقل کامل عطا کرنے کے بعد اس کو دوزخ اور بہشت کے دونوں راستے دکھا دئے جائیں۔پس جس طرف جائے اپنے اختیار سے جائے تاکہ بہشت میں جائے تو استحقاق پیدا کر کے اور دوزخ میں جائے تو بھی استحقاق پیدا کر کے جائے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ ۔ یعنی انسانوں کو فطرت ہی اس قسم کی عطا کی گئی ہے کہ ان میں اختلاف رہے گا اور عناصر اربعہ جو ایک دوسرے

کی ضد ہیں۔ان کے مجموعہ سے پیدا ہونے والا انسان لازمی طور پر اختلاف کا شکار رہے گا۔کیونکہ عناصر کے اختلاط و امتزاج سے ہی مزاج بنتا ہے۔اس کے بعد عناصر کی اپنے مقام پر انفرادی کیفیت اور اس کے مراتب اور وجہ اختلاط اور باہمی توازن و تناسب کے الگ الگ مدارج وغیرہ کا جائزہ لینے سے مزاجوں کے باہمی اختلاف و تضاد کا سلسلہ ایک لامتناہی حد تک پہنچتا ہے۔اور اسی سے جذبات و خواہشات و رجحانات میں اختلاف و افتراق کا ایک غیر متناہی سلسلہ رونما ہوتا ہے۔کسی میں کسی خلط کی زیادتی تو دوسرے میں کمی اور کسی میں اس کے برعکس۔پس خواص و اثرات کے لحاظ سے انسانی مزاج فطری طور پر ہی اختلاف کا شکار ہو گئے اور نفسانی رجحانات مزاجوں کے دباؤ کے تحت ہوتے ہیں اور ان کا باہمی تضاد نفسانی متضاد صفات کی جڑ ہے۔پس شرافت رذالت حیا بے حیائی خیر پسندی۔شر پسندی اخلاص ریاکاری متانت جدل دیانت سرکشی امانت خیانت۔صبر۔بے صبری۔حوصلہ۔جلد بازی۔تسلیم۔انکار۔عدل ظلم۔انصاف پسندی۔ہٹ دھرمی۔انتقام۔درگذر اور اچھائی و برائی کے رجحانات فطریہ اسی اختلافِ امزجہ کی ہی کاشت ہیں اور دنیا میں امن و اطمینان کے سلب ہونے اور جور و ظلم کے عام ہونے کی ذمہ داری اسی اختلاف پر ہی عائد ہوتی ہے۔پس خداوند کریم نے اپنے فضل و کرم سے انبیاء بھیجے جو انسانوں کو ایسی قابلِ قبول اور مبنی بر انصاف اُصول زندگی کی تعلیم دیں کہ اگر تمام انسان انہی اُصول کے سانچہ میں اپنے جذبات و رجحانات کو ڈھالنے پر موفق ہو جائیں تو دنیا و آخرت کی فلاح کی راہیں ان کے لئے ہموار ہو جائیں۔اور اس کے نتیجہ میں صفحۂ ہستی۔امن و اطمینان کا گہوارہ بن جائے۔اور دنیا خود اپنے مقام پر خطۂ جنت ہو جائے۔پس اس نے آخرت کے لئے دو منزلیں بنائیں۔ایک سرور و انعام جس کو جنت کا نام دیا۔اور دوسری منزل عذاب اور رنج و غم جس کو جہنم کا نام دیا تاکہ انبیاء کی تعلیم کو اپنا کر اپنے جذبات کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے والے جنت میں جائیں۔اور اپنے جذبات میں آوارگی کو پسند کرتے ہوئے انبیاء کی تعلیم کو ٹھکرانے والے جہنم کا ایندھن بنیں۔پس اسی بنا پر ارشاد فرماتا ہے کہ اگر چاہتا تو سب کے سب ایک دین پر ہوتے لیکن مصلحت خداوندی کا تقاضا یہ نہیں تھا۔اور یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی انعام اگر بغیر محنت و کاوش کے اور بغیر کوشش و استحقاق کے کسی کو مل جائے تو اس کی قدر و منزلت نہیں رہتی۔اور نہ انعام پانے والا اپنے اندر کوئی سرور بالخصوص محسوس کرتا ہے۔لیکن بخلاف اس کے اگر محنتِ شاقہ اور کدوکد کے بعد اس کا حصول ہو تو وہ انعام پیارا بھی لگتا ہے۔اور اس کے حصول کے بعد دل ایک طرح کا سرور بھی محسوس کرتا ہے۔اور پھر محنت جس قدر زیادہ ہوگی اس انعام کی قدر و منزلت میں اور دل کے سرور میں اُسی قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔اور جنت چونکہ انتہائی سرور کا گھر ہے۔اگر ہر ایک کو مُفت تقسیم کی جاتی اور استحقاق کا کوئی دخل نہ ہوتا تو اس جنت کا حصول قطعاً موجب سرور نہ ہوتا۔پس مصلحتِ ایزدی اسی میں ہے کہ اپنے اختیار سے انسان استحقاق پیدا کر کے جنت کی نعمت کو حاصل کرے۔اور اسی لئے مجبور کر کے تمام انسانوں کو دین کا پابند کرنا گوارا نہ فرمایا۔

پس اسی بنا پر فرماتا ہے کہ لوگوں میں اختلاف کا باقی رہنا ضروری ہے کیونکہ یہ چیز اختلاط عناصرِ متضادہ کی

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ

اور اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے اور پورا ہوا تیرے رب کا کلمہ کہ پُر کروں گا دوزخ کو جنوں اور

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ

انسانوں سے سب سے اور سب بیان کرتے ہیں ہم تجھ پر رسولوں کی خبریں کہ

فطری پیداوار ہے۔ مگر جن لوگوں پر اللہ کا رحم وکرم ہو۔ اور خدا کی توفیق ان کے شامل حال ہو تو وہ اپنے جذبات ورجحانات پر قابو پالیں گے۔ اور اپنے کردار وعمل کو انبیاء کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال کر دنیوی و اُخروی فلاح حاصل کرکے رہیں گے۔ چنانچہ اسی بنا پر فرمایا اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ۔ یعنی جس پر پروردگار کا رحم ہوگا وہ اس اختلاف فطری کے نتائج بد سے محفوظ رہ سکے گا۔ یہاں پر ایک اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ جب رجحانات ومیلانات کا اختلاف فطری ہے اور اس کے نتیجۂ بد سے وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ رحم وکرم کرے تو گویا جو نہ بچ سکے وہ وہی ہوئے جن پر اللہ نے رحم وکرم نہ کیا۔ پس بات وہیں کی وہیں رہی۔ اختیار اور عدم اختیار کا فرق ہی ختم ہو گیا تو اس شبہ کو خداوندکریم نے خود ہی رد فرما دیا۔ چنانچہ فرمایا وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ کہ میں نے تو تمام انسانوں کو پیدا ہی رحم وکرم کے لئے کیا ہے۔ اسی لئے تو اختلافِ فطری کے بعد ان کو بے مہار اور بے لگام نہیں چھوڑا۔ بلکہ انبیاء ورسل بھیجے۔ کتب وصحائف نازل کئے۔ براہین ومعجزات سے رہنمائی کی۔ اور یہ سب رحم وکرم کے ہی نتائج ہیں۔ پس جن لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی طبائع پر کنٹرول کر لیا تو کامیاب ہو گئے۔ اور جن لوگوں نے اپنی تعیش مزاجی اور آوارگی کو انبیاء کی تعلیمات کتب وصحائف کے نصائح اور معجزات ودلائل کی توضیحات کے بعد بھی کنٹرول کرنے کی بجائے بدلگام اور بے مہار رکھنا پسند کیا وہ مستحق عذابِ ابدی ولعنت دائمی ہوئے۔ گویا اُنہوں نے اللہ کے رحم اور اس کے فضل کو خود ٹھکرایا۔ جس طرح ایک دوا بیماروں کے لئے موجب شفا ہے لیکن بالفعل شفا وہی حاصل کرے گا جو اُس کو استعمال کرے گا۔ لیکن جو بیمار اپنی طبیعت پر کنٹرول نہ کرتے ہوئے دوا کو ضائع کر دے اور شفا حاصل ہونے کی بجائے وہ موت کا شکار ہو جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوا اُس کے لئے رحمت نہ تھی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ دوا رحمت تھی لیکن اس نے اُس کو ٹھکرایا۔ پس موت کا مستحق ہوا۔

سوال۔ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ کا معنی اگر یہ ہو کہ ان کو رحمت کے لئے پیدا کیا ہے تو لذالک کی بجائے لتلک ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ رحمت مونث ہے اور ذالک اشارہ مذکر کے لئے ہوتا ہے۔

جواب۔ رحمت مونث غیر حقیقی ہے اور مذکر ہونے کی صورت میں اس کا معنی تفضل واکرام کا ہوا کرتا ہے اور قرآن میں اس کے مذکر قرار دئے جانے کے شواہد موجود ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ۔ یعنی انبیاء کے قصّے قرآن مجید میں صرف وقت گذارنے اور تاریخی بیان دہرانے کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ

مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى

مضبوط کریں اس سے تیرے دل کو اور آیا ہے تیرے پاس اس میں حق اور وعظ و نصیحت

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ

مومنوں کے لئے کہہ دو ان کو جو نہیں ایمان لاتے تم اپنی جگہ کام کرو اور ہم اپنا

اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ

کام کرتے ہیں اور انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں اور اللہ کے لئے ہے غیب آسمانوں

وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ

اور زمین کا اور اسی کی طرف بازگشت ہے ہر شے کی پس اس کی عبادت کرو اور اس پر توکل کر

عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور تیرا رب تمہارے عمل سے غافل نہیں

حضور کے لئے ان کا فائدہ یہ ہے کہ امور تبلیغ میں بلاجھجک اور بلاخوف تردید آگے بڑھتے جائیں اور ان کا حوصلہ بلند رہے اور اُمت کے لئے فائدہ یہ ہے کہ ان کو نصیحت اور عبرت حاصل ہو۔ اور گذشتہ اُمتوں پر انعامات ان کی نیک اعمالی کے جذبہ کو تیز کر دیں اور اُن کے عذاب کے تذکرے ان کو اعمال زشت سے روکنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

مسئلہ علم غیب لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ۔ آیت مجیدہ کے معنی میں تین احتمال ہیں۔ (۱) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ غائب ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے (۲) آسمانوں اور زمین کے کل خزانے اللہ کی ملکیت ہیں (۳) علم غیب صرف اللہ کے لئے مختص ہے خواہ آسمانوں سے متعلق ہو یا زمین سے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم غیب کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) علم مستفاد۔ (۲) علم ذاتی۔ پس دوسری قسم خدا کے لئے مخصوص ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور جو اس صفت میں اللہ کا کسی کو شریک قرار دے وہ مشرک و کافر ہے لیکن پہلی قسم یعنی علم غیب مستفاد وہ انبیاء آئمہ کے پاس ہوتا ہے۔ جتنا کہ خدا ان کو عطا فرمائے اور عوام بھی اس کو جان سکتے ہیں۔ جتنا کہ نبی و امام ان کو بتائیں۔ جیسے جنت دوزخ اور برزخ وغیرہ کے حالات علامہ طبرسی اعلی اللہ مقامہ نے اس مقام پر ذکر فرمایا ہے کہ بعض متعصب مزاج جس کا شیعہ امامیہ پر طعن و تشنیع شیوہ بن چکا ہے۔ اس نے اس مقام پر شیعہ امامیہ کے پاکدامن پر اپنے بغض و عناد کا کیچڑ اچھالتے ہوئے اسے داغدار کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے وہ کہتا ہے آیت سے صاف ظاہر ہے کہ علم غیب اللہ کا خاصہ ہے اور رافضی لوگ جو آئمہ

کی طرف علم غیب منسوب کرتے ہیں وہ اس آیت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اس قول کے نقل کے بعد علّامہ موصوف نے اس کا جواب تحریر فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ علم غیب سے مُراد یہ ہے کہ ذاتی طور پر جمیع معلُومات کا علم رکھے بغیر علم مستفاد کے اور یہ صرف اللہ کا خاصہ ہے اور مخلوق میں سے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور جو اس صفت میں اللہ کا کسی کو شریک جانے وہ ملّتِ اسلام سے خارج ہے لیکن جو غیب کی خبریں آئمہ سے منقول ہیں وہ سب علم مستفاد ہیں کہ انہوں نے رسالت مآبؐ سے حاصل کیا اور ان کو اللہ نے اطلاع دی۔ اور اس کو علم غیب کہنا درست نہیں ہے۔ پھر انہوں نے آئمہ طاہرینؑ کی بعض پیشین گوئیاں نقل فرمائیں جن کو علمِ غیب سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ علم مستفاد ہیں۔

(۱) حضرت امیر المومنینؑ نے مروان کے متعلّق فرمایا کہ اس کو حکومت ملے گی۔ جس طرح کتا اپنی ناک کو چاٹتا ہے۔ یعنی اُس کی حکومت کی مدّت بہت کم ہوگی۔ اور اُس کے چار بیٹے بھی بادشاہ ہوں گے اور اُمّت کو اس کی اور اس کی اولاد کی بدولت سرخ موت دیکھنی نصیب ہوگی۔

(۲) امام جعفر صادق علیہ السّلام نے عبداللہ بن حسن سے فرمایا تھا کہ حکومت تیرے لئے نہیں اور نہ تیری اولاد اسے پا سکے گی۔ اور فرمایا کہ تیرے دونو فرزند منصور کے ہاتھوں قتل کئے جائیں گے اور اسی طرح ہوا۔ جس طرح آپ نے فرمایا تھا۔

(۳) امام رضا علیہ السّلام نے اپنی دونو انگلیاں کو ملاکر فرمایا تھا کہ میری اور ہارون کی قبریں اس طرح اکٹھی ہوں گی۔

(۴) ابوحبیب نباحی کو جب آپ نے ایک مٹھی خرما کی دی تھی اور اس نے زیادہ کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ اگر میرے نانا جناب رسالت مآبؐ نے زیادہ دی ہوتی تو میں بھی زیادہ دیتا۔ اور اُس شخص کو خواب میں جناب رسالت مآبؐ کی زیارت ہوئی تھی اور آپ نے اُسے ایک مٹھی خرما عطا فرمائی تھی۔ اور امام عالی مقام اُسی طرف اشارہ فرما رہے تھے)

اس قسم کی بہت سی خبریں آئمہ اطہارؑ سے منقول ہیں۔ اور ان کو علم غیب اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ علم جناب رسالت مآبؐ سے مستفاد تھا اور آپ کا علم خداوند کریم کی طرف سے بذریعہ وحی مستفاد تھا۔ پس خدا جس کو جس قدر علم عطا فرمائے وہ عالم الغیب نہیں بن جایا کرتا۔ اور جناب رسالت مآبؐ کو اور اس کے بعد آئمہ طاہرینؑ کو خدا نے تمام مخلوق میں سے زیادہ علم عطا فرمایا اور باوجود اس کے یہ بھی تعلیم ساتھ ساتھ دی کہ دعا مانگا کرو۔ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔ پس محمدؐ و آلِ محمدؐ علم کی زیادتی کی پروردگار سے دُعا مانگتے ہیں تو عالم الغیب کیسے ہوگئے اور ذاتی طور پر عالم الغیب ہونا صرف خدا کا خاصہ ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی شیعہ کا ایمان ہے اور خدا کا عطا کردہ علم محمدؐ و آل محمدؐ سے زیادہ کسی کے پاس نہیں ہے اور اس کے جاننے سے ان کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔

پس سورہ ہود کی تفسیر ختم ہوئی۔ اور یہیں ساتویں جلد کا اختتام ہے اور آٹھویں جلد سُورۂ یوسف سے شروع ہوگی امام بارگاہ ایبٹ آباد میں بروز ہفتہ پونے پانچ بجے شام ۲۸ صفر ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۵ جون ۱۹۶۴ء

دورِ حاضر میں علماء اعلام کے خلاف ہنگامہ

اس گئے گذرے زمانہ میں جب کہ جہالت علم کے لباس میں ظاہر ہوکر دولتِ دانش وخرد پر اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی ہے۔ لادینیت دین بلکہ تقدس کا لباس پہن کر قرآن وحدیث کے مضامین کو اپنے تصرف میں لانے کے لئے بے تاب ہے رذالت نے شرافت کا لبادہ اوڑھ کر ہر شریف کی پگڑی اچھالنا اپنا کمال بلکہ فتح وکامیابی تصور کیا ہوا ہے۔ اور فرعونیت موسوی رنگ میں سادہ لوح انسانوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی معصومیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے۔ غرضیکہ دین ومذہب سے آزادی کا تصور ہمہ گیر طوفان بن کر صفحۂ عالم پر چھایا جا رہا ہے۔ اُدھر مغربیت سے اُٹھتی ہوئی بے غیرتی اور بے حیائی کا منحوس عقاب اپنے پر وبال پھیلائے ہوئے دین ومذہب کے پرستاروں کے سروں پر پھڑپھڑا کر اس کو مرعوب کرنے میں ہمہ تن کوشاں ہے۔

بالخصوص مذہب شیعہ پر یہ دور اس لئے بھی سخت ہے کہ آئے دن کی علماء پر پابندیاں عزاداری کی آزادی میں رخنہ اندازیاں تقریروں اور تحریروں پر بے جا نکتہ چینیاں اور شیعہ مذہب کی مذہبی خصوصیات کو دل آزار کہہ کر تحریروں کی ضبطیاں اور تقریروں پر زبان بندیاں ایسا عام دستور بن گیا ہے کہ اب ان پر آواز اٹھانے کی جرأتیں بھی مسلوب ہوچکی ہیں۔ ادھر مدارس میں شیعہ جداگانہ نصاب دینیات کو معرض التوا میں دیکھ کر شیعہ بچوں کی ذہنیت کی تباہی اور ان کے مستقبل کی تاریکی کا فکر ہر حساس ذہن کے لئے مسئلہ مشکلہ بلکہ عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے۔

پس ایسے روح فرسا اور ہوش ربا حالات میں ان چند مدارس دینیہ کا وجود غنیمت تھا جو انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ اور ان علماء اعلام کا قوم کے سروں پر سایہ پروردگار کی جانب سے ظلّ رحمت تھا (خدا اسے قائم ودائم رکھے) جو ظاہری عیش وعشرت اور رنگ رلیوں سے بے نیاز ہوکر قوم کے بچوں کو معالمِ دینیہ اور مطالبِ فقہیہ مسائل کلامیہ اور حقائق اصولیہ وفروعیہ کی تعلیم دے کر ان کو قعر ضلالت اور نشیبِ جہالت سے نکال کر اوجِ ہدایت اور رفعتِ معرفت سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنی زندگانیاں وقف کئے ہوئے ہیں۔ صرف قوت لایموت پر بسر اوقات کرکے صبر ورضا اور شکرِ پروردگار ان کا دستور زندگی ہے۔ حتیٰ کہ جہاں جاہل ذاکر اور بے علم واعظ منبر پر ادھر اُدھر کی چند بے تکیاں اڑاتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے عوام کی اکثریت کے جذبات سے کھیل کر صرف ایک گھنٹہ یا اس سے کم وبیش مختصر وقت کا اچھا خاصہ معاوضہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا وہاں علوم آلِ محمدؐ اور اس کے مقدمات کی تدریس پر گھٹنے ٹیکے ہوئے اپنے دماغ اور ذہن کا عرق نچوڑ کر قوم کے نونہالوں کو زیور علم ومعرفت سے آراستہ کرکے قوم کی بنیادی اور ٹھوس خدمت کے باوجود یہ علماء ایک پورے مہینے کی خدمت کے بعد اس سے کم معاوضہ پر راضی ہوکر گذر اوقات کرنا فخر محسوس کرتے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ احسان فراموشی اور محسن کشی اور کیا ہوگی کہ قوم کی اکثریت ایسے علماء کے وجود کو بارگراں سمجھنے لگی ہے

اور درحقیقت علم کے لباس میں جہالت کے تاجداروں اور دین کے لباس میں لادینیت کے پرستاروں کی ہنگامہ آرائی کا یہ تلخ نتیجہ ہے
جو جاہل مدتوں سے علم کا لباس پہن کر عوام کو جہالت کی تاریکی میں رکھتے ہوئے صرف زبانی ہاؤ ہو سے ان کو خوش کر کے اور
ان کی بداعمالیوں کے باوجود بخشش خداوندی کا ٹھیکہ دار بن کر ان کو جنت کی سستی ٹکٹیں دے کر پیسے بٹورنے کے عادی تھے اُن کے
لئے اس تاریک خطے میں علم کی روشن قندیلیں خیرہ کن تھیں وہ اس تاریکی کو روشنی کا نام دے کر اور ظلمت کو نور کہہ کر بابے دینی کو دین
کا لبادہ اوڑھا کر جیب تراشی کو ما‌ل زندگی سمجھتے تھے۔ اس لئے مدارسِ دینیہ کا وجود اور حق گو علماء کی آمد ان کے لئے جاء الحق وزہق
الباطل کی پیشین گوئی کا اعلان تھی۔ لہٰذا انہوں نے حرکت مذبوحی کے طور پر ہاتھ پیر مارنے شروع کئے اور اپنے وقار و اقتدار کی حفاظت
کی خاطر دین و مذہب اور قرآن و شریعت کی مضبوط حصاروں کو پھاند کر آپے سے باہر ہو گئے۔ پس علماء اعلام کے ساتھ انہوں نے
علوم آل محمدؐ کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کر دیا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ قوم ہمارے کرتوتوں سے واقف ہے وہ کسی طرح حق کے
مقابلہ میں باطل کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہو گی۔ ہزاروں کھیل کھیلے۔ لاکھوں جتن کئے۔ کبھی کسی مسئلہ پر اشکال کیا۔ کسی وقت کوئی
من گھڑت مقولہ ان کی جانب منسوب کیا۔ کسی وقت ان کے کسی قول یا فعل کو غلط رنگ میں پیش کیا۔ بہرکیف عوام کو علماء کے خلاف
بغاوت کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے بہت حیلے بہانے بنائے لیکن سب کے سب ناکام ثابت ہوئے اب انہوں نے ایک اور مہلک
حربہ تلاش کیا جس کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت ہے لیکن میں اسے بلبلۂ آبی سے زیادہ وقعت نہیں دیتا اور وہ یہ کہ علمائے اعلام
کو وہابی کہا جائے اور عوام کو یہ باور کرا دیا جائے کہ مدارس دینیہ گمراہی کی تربیت گاہیں ہیں۔ اور تدریس کرنے والے علماء شیعیت کے
لباس میں وہابیت کے مروج ہیں۔ اور اس سلسلے میں ایسے کافی عوام منسلک ہو گئے ہیں جو پہلے سے ہی تقلید کو ایک ناقابل برداشت
بوجھ خیال کرتے تھے اور علماء کی توہین و تذلیل ان کا محبوب مشغلہ تھا اور ذاکرین میں سے جن کے دل ایمان و دین کے نقوش سے خالی
تھے ان میں اس تحریک نے کافی حد تک مقبولیت حاصل کر لی کیوں کہ وہ پہلے سے ہی عزاداری میں اصلاح کے علمبرداروں کے دل
سے مخالف تھے وہ چاہتے تھے کہ حسینی منبر پر ہر قسم کی دھاندلی برداشت کی جائے۔ ریش تراشی۔ بھنگ اور شراب نوشی بغناشعاری
اور زناکاری بلکہ شریعت مصطفوی کی ہر لحاظ سے حدود شکنی کے باوجود انہیں کوئی فاسق کہنے والا نہ ہو بلکہ ذاکر حسین سمجھتے ہوئے ان کی ہر
حرکت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے۔ یہ لوگ مومنین کے لئے ان کی عزت و مال بلکہ دین و ایمان کے ڈاکو بنے ہوئے تھے اور
ہمیشہ چور اور ڈاکو کو تاریک فضا محبوب ہوا کرتی ہے وہ روشنی کا دل سے دشمن ہوا کرتا ہے۔ ویسے بھی فطرتاً جی ہاں کرنے والے پیارے
لگتے ہیں اور ٹوکنے والوں کو کوئی نہیں چاہتا۔ انبیاء معصومین انتہائی مخلص و خیرخواہ ہونے کے باوجود عوام کی نظروں میں بدنام صرف اس
لئے ہوا کرتے تھے کہ وہ غلطیوں پر ٹوکتے تھے اور ہمیشہ انبیاء و آئمہ کے دشمن وہی لوگ ہوا کرتے تھے جن کو اپنا ظاہری وقار معرض خطر میں
نظر آتا تھا اور جن کے حلوے مانڈے انبیاء کی دعوت کی مقبولیت کے بعد ختم ہوا چاہتے تھے۔ پس وہ لوگ عوام کو آلۂ کار بنا کر اپنی
مطلب براری کے لئے انبیاء و آئمہ کے خلاف کیچڑ اچھال کر ان کو ہر ممکن طریق سے بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ عوام کے
جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہدایت کے ستونوں کو گرا کر اپنا راستہ ہموار کیا جائے۔ دورِ حاضر بعینہٖ وہی منظر پیش کر رہا ہے کہ

جہالت کی تاریکی میں قوم کی جیب تراشی کے عادی انوار علیہ کی روز افزوں پھیلتی ہوئی اُمید افزا شعاعوں سے گھبرا کر اس قسم کے رذیل ہتھکنڈوں پر اُتر آئے ہیں لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ حق کی آواز اہل باطل کی ہنگامہ آرائیوں سے دبائی نہیں جا سکتی۔ آخر جہالت کا پردہ چاک ہوگا اور علم کا بول بالا ہوگا۔ قوم میں منصف مزاج افراد کی کمی نہیں۔ ایسے لوگ ابھی تک موجود ہیں جو صرف جبہ و دستار سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ حق کی دُور بینیوں سے حقائق کا جائزہ لینا جانتے ہیں۔

علماء کو وہابی کہہ کر منبر حسینی کو کھلونا بنانے کا طریقہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جائے گا اور علماء کو بدنام کر کے سیرتِ آئمہ سے بیگانگی اور مسائل شرعیہ سے سرکشی کا کھیل اب نہیں کھیلا جا سکے گا۔ ہمارے عوام کے دلوں میں ولائے علی کا فانوس روشن ہے وہ تاریک ذہن نہیں رکھتے بلکہ ان میں غور و فکر کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ علمائے اعلام پر کیچڑ اچھالنے والوں نے اب لوگوں کو جگا دیا ہے تاکہ وہ حق و باطل کا جائزہ لینے کے لئے تیار ہو کر غداروں اور مکاروں سے ہوشیار رہ سکیں۔ علماء کا کردار بھی ان کے سامنے ہے۔ اور منبر پر عوام کی ہاں میں ہاں ملانے والے اور ان کو گناہوں پر جرأت دلانے والے بہشت کے ٹھیکیداروں کے کرتوت بھی قوم کے سامنے ہیں۔ انشاء اللہ حق کی آواز صفحۂ ہستی پر گونج کر رہے گی۔

عقائد علمائے شیعہ علماء کو وہابی کہنے والی جماعت جن جن مسائل کو ہوا دے کر عوام کے جذبات سے کھیل رہی ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) حاضر و ناظر ہونا:۔ یہ لوگ عوام کو علما سے بدظن کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ دیکھو علماء مدرسین ائمہ طاہرین کو حاضر و ناظر نہیں مانتے لہٰذا وہ وہابی ہیں۔

اس کا حل یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہونا اللہ سبحانہ کا خاصہ ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس کی شان ہے هو بكل شئ عليم۔ هو بكل شئ محيط۔ لا يعزب عنه مثقال ذرة۔ وہ ہر شئے کو جاننے والا ہر شئی پر احاطہ رکھنے والا اور اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز اوجھل نہیں خواہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں وغیرہ۔

محمدؐ و آل محمدؐ کو جتنے وقت میں جتنے مقامات پر حاضر ہونے کی اللہ طاقت دے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے لیکن اگر ان کو اللہ کی طرح ہر وقت ہر جگہ حاضر و موجود مانا جائے تو تمام اسلامی تاریخ بلکہ مذہب سے بھی دست برداری لازم آئے گی کیونکہ حضرت محمد مصطفٰےؐ کو حاضر و ناظر کے عقیدہ کی رُو سے مکی یا مدنی یا عربی کہنا بے جا ہوگا۔ کیونکہ اس اعتبار سے ہندی، پاکستانی، ایرانی، عراقی، روسی، چینی، امریکی، افریقی و برطانوی وغیرہ سب کچھ ہوں گے کیونکہ حاضر و ناظر کا اختصاص کسی خاص مکان سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر جا ہوا کرتا ہے اسی طرح ائمہ معصومین کے جملہ حالاتِ زندگی جو کسی خاص مکان سے اختصاص کا پہلو رکھتے ہیں غلط ہو جائیں گے پس ہجرت معراج غدیر، خیبر، حج، ترک وطن، قید، مسافرت بلکہ ولادت و شہادت کے تمام واقعات سے ہاتھ دھونا پڑے گا لہٰذا صحیح عقیدہ یہی ہے کہ یہ صفت صرف اللہ کی ہے اور وہ اپنے خاصان کو جتنی جگہوں پر ایک وقت میں حاضر کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

(۲) **خلق و رزق**۔ علماء کو بدنام کرنے کے لئے اس مسئلہ کو بھی کافی حد تک اچھالا جاتا ہے حالانکہ شیعہ عقیدہ اس مسئلہ میں صاف ہے کہ خالق و رازق صرف اللہ ہے اور محمدؐ و آل محمدؐ واسطہ ہیں۔ بایں معنی کہ لولاك لما خلقت الافلاك کے مفہوم کے مطابق اگر یہ نہ

ہوتے تو نہ کوئی مخلوق ہوتا نہ مرزوق اور آئمہ کو خالق و رازق کہنے والوں پر خود ائمہ نے لعنت بھیجی ہے نیز سوچنے کے قابل بات یہ ہے کہ اگر یہ خالق ہوں تو ان کی شہادت سے انکار لازم آئے گا کیونکہ مخلوق اپنے خالق کو کیسے ذبح کر سکتی ہے۔ مرزوق اپنے رازق کا پانی کیسے بند کر سکتے ہیں؟ ہم نے مقدمہ تفسیر کے باب تفویض میں اس کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔

(۱۳) **مسئلہ علم غیب** ۔ علماء کو عوام کی نظروں میں وہابی ثابت کرنے کا یہ بھی ایک حربہ ہے حالانکہ بعض علمائے اعلام کو بدنام کرنیوالوں کا اپنا عقیدہ بھی وہی ہے جو علماء کا ہے کہ علم غیب صرف اللہ کا ہی خاصہ ہے اور جن باتوں کو عوام تک پہنچانے کی ضرورت ہے ان کو آئمہ طاہرینؑ خدا کے ذریعہ سے جانتے ہیں چنانچہ اخبار شہید جولائی ۶۶ء میں علمائے مدرسین پر کیچڑ اچھالنے کے بعد علماء کی توہین کے علمبردار نے آخر میں اپنا عقیدہ بھی اسی قسم کا ظاہر کیا ہے اور عوام کو دھوکا دینے کے لئے ائمہ کے متعلق علم غیب کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنے ایک کتابچے میں جہاں تمام امہات ائمہ کو بتول ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے وہاں حضرت شہربانو کے بیان میں ایک روایت درج کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا تھا میرے حسن وحسین میں سے جس کے گھر ایسی عورت آئے گی جو ہر رات باکرہ ہوگی اُس کی نسل سے امامت تا قیامت رہے گی اور امام حسن علیہ السلام کی کثرت ازواج کی یہی وجہ ہے کہ آپ کو ایسی عورت کی تلاش تھی جو ہر رات باکرہ ہو پس ایک سے شادی کرکے جب اس کو باکرہ نہ پاتے تھے تو اس کو طلاق دے کر دوسری عورت نکاح میں لاتے تھے وعلیٰ ہذا القیاس حتیٰ کہ جب امام حسین کے گھر میں شہربانو آئیں تو انہوں نے اپنے بھائی حسنؑ کو بتایا کہ آپ کوشش ترک کر دیں کیونکہ وہ عورت میرے گھر میں آچکی ہے تب امام حسن کو تسلی ہوئی کہ امامت امام حسین کی اولاد میں منتقل ہوگی۔

اگر اس قسم کی روایت علمائے اعلام میں سے کسی نے ذکر کی ہوتی تو جہلا کی جانب سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ان کو گردن زدنی قرار دیا جاتا اور ان کے وہابی ہونے کے لئے ایک بڑا ثبوت سمجھا جاتا لیکن علماء اعلام کو بدنام کرنے والے جو کچھ کہہ دیں قابل گرفت نہیں۔

ذرہ گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ● امام حسنؑ کا علم غیب کہاں گیا تھا؟ کہ باکرہ عورت کی تلاش میں ہر رات نئی شادی کی خواہش میں رہتے تھے ● رسالتمآبؐ نے اپنے صحابہ کے سامنے جب اپنے بارہ جانشین نام لے کر گنوائے تھے اور صحابہ نے ان کو نام بنام یاد بھی کر لیا تھا حتیٰ کہ جابر نے امام محمد باقر کو حضرت رسالتمآبؐ کا پیغام وسلام بھی دیا تھا کہ امام حسن کو علم غیب تو بجائے خود فرمان رسالت بھی یاد نہ تھا کہ نو امام کس کی اولاد سے ہوں گے۔ حالانکہ جابر جیسے عام آدمیوں کو دیا تھا ● کہ امام حسن کو یہ گوارا نہیں تھا کہ امامت حسینؑ کی اولاد میں جائے۔ ● کیا کثرت طلاق کے لئے یہ روایت باعث جواز بن سکتی ہے؟

عقیدہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس قسم کی روایت کو جس کسی کتاب میں ہے اُسی کی زینت رہنے دیا جائے۔ ایسی باتوں کو قبول کرنے کی عقیدۂ مذہب ہرگز اجازت نہیں دیتا اور بارہ اماموں کی امامت کا اعتقاد رکھنا جب ایمان کی شرط ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس واضح امر کو خود امام نہ جانتا ہو۔ اور روایت ذکر کر کے خاموشی اختیار کرنا اس روایت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوا کرتا ہے خصوصاً جب کہ روایت بھی تائید مطلب کے لئے ذکر کی جا رہی ہو۔ جناب شہربانو کو بتول ثابت کرنے کے شوق میں امام حسن کو امامت کی معرفت سے بیگانہ ثابت کر دیا حالانکہ اس سے اس کے مقصد کو ذرہ بھر بھی تقویت نہیں پہنچی جس کے لئے اس

کو ذکر کیا ہے کیونکہ ہر رات عورت۔ کا باکرہ ہونا اور بتول ہونا نہ ایک دوسرے کے مترادف ہیں نہ لازم و ملزوم اور نہ لزوم میں ایک دوسرے کے شریک بہر کیف برتن سے وہی نکلتا ہے جو اس میں ہوا کرتا ہے

میرا مقصد یہ نہیں کہ کسی پر طعن کروں مجھے تو ایسے لوگوں کی افسوسناک روش پر رونا آتا ہے جو حقائق کو سمجھ کر خواہ مخواہ ایک سیدھی سادی بات کو عوام کی نظروں میں اُلجھا کر علمائے اعلام کے خلاف محاذ تیار کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں اور غالباً یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اہل علم کی مخالف جماعت کو اکثریتی جذبات سے کھیل کر منبر کی اجارہ داری کو برقرار رکھا جائے اور طرہ یہ کہ مشافہانہ گفتگو کے موقعہ پر صاف صاف اعتراف ہوتا ہے کہ یہ بحث صرف لفظی ایر پھیر ہے ورنہ درحقیقت ہمارا وہی عقیدہ ہے جو علماء کا ہے لیکن ایمانی جرأت اتنی نہیں ہے کہ اس بات کا اعلان کیا جائے کیونکہ ڈر ہے کہ کہیں وہابی نہ کہہ دیا جائے ورنہ منبر کی مقبولیت سلب ہو جائے گی لیکن یاد رہے کہ یہ دورُخی چال انشاء اللہ زیادہ دیر تک نہ چلے گی۔ آخر اس کا بھانڈا پھوٹ کر رہے گا۔ اور دنیا سمجھ لے گی کہ علمائے اعلام کی آواز صدائے حق تھی اور ان کے خلاف ہنگامہ آرائی صرف اپنی جہالت دھاندلی اور بے راہروی پر پردہ ڈالنے کا ناپاک بہانہ تھا جن ذاکرین حضرات کے لئے علماء کا وجود پہلے سے ہی خارِ چشم تھا۔ مدعیانِ علم کی یہ چال ان کو خوب بھائی اور من ترا حاجی بگویم کے مقولہ کے پیش نظر بعض تقدس صفت انسان جو گانے والے ذاکرین کا وجود تک نہ برداشت کر سکتے تھے اب وہی علماء کی دشمنی میں اندھے ہو کر انہی کے حق میں قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔

بہرکیف مذہب شیعہ کا عقیدہ یہی ہے کہ علمِ غیب صرف اللہ کے پاس ہے جیسے کہ قرآن مجید کا متعدد آیات میں اعلان موجود ہے اور ائمہ اس قدر جانتے ہیں جس قدر خدا نے ان کو علم عطا فرمایا اور خدا نے ان کو تمام عالمین میں سے علم و فضل میں ممتاز فرمایا ہے ان کے برابر مخلوق میں کوئی عالم نہیں خواہ کوئی نبی ہو یا غیر اور ہم اسی تفسیر کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر اس مسئلے کو پہلے بھی واضح کر چکے ہیں اور آئندہ بھی آیات متعلقہ کے ضمن میں بیان ہوتا رہے گا مایک ظاہری اور عام قابلِ قبول عقلی انداز سے ہم اس کی وضاحت تفسیر کی چوتھی جلد ص۸۵ تا ص۸۹ میں کر چکے ہیں جس پر غور کرنے سے بہت حد تک ذہنی الجھن دُور ہو سکتی ہے۔

(۴) **مسئلہ موت و حیات**۔ شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ خدا مارتا اور جلاتا ہے اور قرآنی فرامین اس پر صریحی دلالت کرتے ہیں خواہ ان فرائض کی انجام دہی ملائکہ کے ذریعے سے ہو یا کسی اور طریقہ سے اور بصورتِ اعجاز ائمہ سے کسی بات کا صدور اُن کے فعل ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ ان کے مقبول بارگاہ کردگار ہونے کی علامت ہے۔

ائمہ کا مقام۔ بعض جہلا بات بات پر یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ فرشتے کر سکتے ہیں تو امام کیوں نہیں کر سکتے۔ ہوا فرشتہ چلاتا ہے۔ بادل فرشتہ چلاتا ہے۔ مینہ پر وہی متعین ہیں وغیرہ تو ائمہ کیوں نہیں کر سکتے؟ یہ ایک بیہودہ خیال ہے جس کا جواب خاموشی بہتر تھی لیکن عوام کو گمراہ کرنے کا چونکہ یہ بھی ایک حربہ ہے لہذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔ فرائض و خدمات ہر انسان کے اپنی اپنی حیثیت سے ہوا کرتے ہیں اور اختیارات کی وسعت فرائض و خدمات کی اہمیت کے پیش نظر ہوا کرتی ہے۔ ایک سپاہی کا فریضہ جتنا ہے اس کا اختیار بھی اتنا ہے اور تھانیدار کا فریضہ جس قدر ہے اس کا اختیار بھی اس اندازہ سے ہے۔ اب ایس۔ پی۔ آئی جی وغیرہ کے فرائض و اختیارات کا جائزہ لیجئے۔ چپڑاسی۔ کلرک اور افسر کے

فرائض واختیارات میں فرق دیکھیئے پھر حکومت کے ہر محکمہ میں ملازمین کی حیثیت مراتب، فرائض واختیارات پر نظر دوڑائیے تو اس مطالعہ سے یہ اندازہ خوب ہوگا کہ علمی عہدہ غیر علمی ڈیوٹی سے بدرجہا افضل ہے اور صاحب کمال کے فرائض واختیارات ناقص کے مقابلہ میں اہم واتم ہوا کرتے ہیں، حکومتوں کے اندر ہزارہا کارخانے الگ الگ قسم کے ہوا کرتے ہیں لیکن حکومت کا سربراہ ہر کارخانہ کے سربراہ یا دیگر عہدہ داروں سے بدرجہا افضل ہوتا ہے اور وہ اقتدار اعلیٰ کی حیثیت سے اختیار اعلیٰ کا حامل ہوا کرتا ہے۔ چونکہ کائنات میں دو نظام رائج ہیں۔ ایک نظام تکوین (سلسلۂ موت وحیات اور خلق ورزق وغیرہ) دوسرا نظام تشریع۔ سرکار محمدؐ وآل محمدؐ نظام تشریع کے سربراہ ہیں۔ اور نظام تکوین میں ہمارے وسیلہ وشفیع اور سبب فیض وجود ہیں۔ پس نظام عالم میں حکومت الٰہیہ کی جانب سے ہزارہا بلکہ کروڑہا قائم کردہ محکمے اور کارخانے مثلاً محکمہ آبپاشی۔ دریا۔ چشمے۔ بادل۔ بارش وغیرہ۔ محکمہ زراعت۔ سبزی۔ پھل پھول اگانا وغیرہ محکمہ بارانی اور محکمہ ضیاباری وغیرہ اپنے اپنے فرائض کی بجاآوری میں مشغول ہیں۔ بادل۔ بارش ہوا روشنی وغیرہ محکمہ جات خداوند عالم کی سربراہی اور محمدؐ وآل محمدؐ کی شفاعت سے برابر جاری ہیں۔ اب یہ کہنا کہ فرشتہ ہوا چلاتا ہے۔ بارش برساتا ہے۔ بادل لاتا ہے اور سبزیاں اگاتا ہے تو ائمہ یہ کام کیوں نہیں انجام دے سکتے انتہائی حماقت ہے اور ائمہ کی ناقدرشناسی ہے کیونکہ جس طرح فرشتے باذن پروردگار یہ اُمور سرانجام دیتے ہیں ائمہ بھی باذن پروردگار یہ کام کرسکتے ہیں لیکن ایسا کرنے میں اُن کی عظمت ووقعت نہیں باقی رہتی۔ غلام کی ڈیوٹی آقا انجام دے سکتا ہے لیکن اس میں اس کا کمال نہیں بلکہ گراوٹ سمجھی جاتی ہے۔ بس ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ محمدؐ وآل محمدؐ سب کائنات میں اللہ کی سب مخلوق سے افضل وبرتر ہیں۔ اور قدرتی نظام چلانے والے ملائکہ سب ان کے غلام ہیں۔ محمدؐ وآل محمدؐ کی نبوت یا ولایت کا رتبہ اجل ہے اس سے کہ وہ علمی عہدہ کے حامل ہوکر جزوی نچی فرائض کو بھی خود انجام دیں

(۵) **معجزہ**۔ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ بھی ایک بہانہ تراشا گیا ہے کہ معجزہ فعل خدا ہے **یا فعل معصوم** اس قسم کی بحثیں بالکل لغو اور فضول ہیں صرف عوام کو آلہ کار بنانے اور ان کو علما سے منحرف کرکے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے منبر کے ٹھیکہ دار گندم نما جو فروش تاجران اسلام نے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر اس کو اچھالا ہے ورنہ اگر سوچا جائے تو ہر دو پہلو معصوم کی عظمت کا نشان ہیں کیونکہ اگر اسے فعل خدا مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ائمہ طاہرین خدا کی بارگاہ میں اس عظمت کے مالک ہیں کہ جب یہ چاہتے ہیں خدا کردیتا ہے یعنی مشیت ایزدی انکی خواہش سے مختلف نہیں اور ان کی خواہش مشیت خداوندی سے الگ نہیں اور اگر ان کا فعل کہا جائے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ خدا نے ان کو وہ زور عطا کیا ہے اور اتنی طاقت دی ہے کہ جب یہ چاہتے ہیں تو خارق عادت چیز منصۂ شہود پر رونما ہو جاتی ہے **وضاحت** نظام کائنات میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک مراتب ومدارج ہیں اور ہر درجہ ورتبہ اپنے مخصوص افعال وخواص کا حامل ہے اور پروردگار عالم نے ادنیٰ واعلیٰ کی سرشت میں افعال ودیعت کر رکھے ہیں جو ان کے ذاتی جوہر کے تابع ہیں مثلاً جماد۔ نبات حیوان اور انسان کے الگ الگ مراتب ہیں۔ نبات کی خوبی جماد میں نہیں اور حیوان کی خصوصیت سے نبات محروم ہے اسی طرح انسانی جوہر سے وہ ہر سہ تہی دست ہیں۔ نبات کا بڑھنا پھلنا اور پھولنا اسکی سرشت میں داخل ہے لیکن یہ معجزہ نہیں ہے بلکہ اس کا چلنا معجزہ ہوگا جو اس کی ذاتی مقتضا سے باہر ہے اور حیوان کا چلنا پھرنا اس کی ذاتی اقتضا ہے لیکن معجزہ نہیں اور انسان کا بولنا اور معقولات کو جاننا ان کی سرشت ہے نہ کہ معجزہ پس معجزہ وہی ہوگا جو کہ ان کی ذاتی اور عادی رفتار سے باہر ہے پرندہ کیلئے اڑنا معجزہ نہیں لیکن انسان کا پرواز کرنا معجزہ ہوگا اسی طرح حاملین روح نبوت وولایت کا

ترتیب کے ماتحت ایک ایسا جوہر اپنے اندر رکھتے ہیں جو عام انسانی سرشت سے بالاتر خصوصیات ومقتضیات کا حامل ہوتا ہے پس جس طرح عام انسان کا بولنا چلنا پھرنا وغیرہ ان کی عادی رفتار ہے کہ اگر حیوان کو شعور دیا جاتا تو وہ انسان کے اس کمال کو معجزہ سے ہی تعبیر کرتا بلکہ بہت سے انسانی کارنامے ایسے ہیں جن کو انسان اپنی عادی رفتار سمجھ کر ملتفت نہیں ہوتا لیکن جو مخلوق اس کمال سے محروم ہے اُنکے لئے یہ معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں پس اسی طرح نبی یا ولی سے بعید نہیں کہ وہ ایک ایسی قوت قدسیہ کے مالک ہوں جس کے ماتحت ان کے بعض افعال عام انسانی روش کے لحاظ سے معجزہ ہوں لیکن ولی یا نبی کے لئے وہ ذاتی وعادی ہوں اسی بنا پر جناب پیغمبرؐ کا پشت کے پیچھے دیکھنا معجزہ نہیں بلکہ ان کا عادی فعل ہے سوتے ہوئے غافل نہ ہونا ان کا معجزہ نہیں بلکہ انکی عادی رفتار ہے پسینہ کا خوشبودار ہونا فضلات کو زمین کا نگل جانا جسم پر مکھی کا نہ بیٹھنا اور بادل کا سایہ وغیرہ یہ سب ان کے عادی افعال ہیں جو ان کے ذاتی مختصات میں سے ہیں۔ ایسے افعال خود ان کے لئے معجزہ نہیں ہیں لیکن عام انسانی عقول کے لئے چونکہ خارق عادت ہیں لہٰذا معجزہ ہیں اور اس کے برخلاف وہ افعال جو نبی یا ولی کی عادی رفتار سے باہر ہیں اور عوام پر ان کے نبی یا ولی ہونے کے ثبوت میں پروردگار نے خارقِ عادت امور کو معرضِ ظہور میں پیش فرمایا ہے وہ معجزہ ہے اور فعل خدا جو نبی یا ولی کے لئے بھی معجزہ اور عوام کیلئے بھی معجزہ کہلاتا ہے مثلاً قرآن مجید یہ کلام مقدس جناب رسالتمآبؐ کا عادی کلام نہیں ہے بلکہ بطور معجزہ پروردگار عالم نے فصحاء وبلغاء عرب سے ان کی نبوت تسلیم کرانے کے لئے ان کو عطا فرمایا ہے پس وہ فعل نبی نہیں بلکہ فعل خدا ہے لہٰذا اس کو کلام نبی کہنا ناجائز ہے اور کلام اللہ کہنا واجب ہے اسی طرح معراج حضرت رسالتمآبؐ کا عادی سفر نہیں بلکہ عالم بالا کی قدسی مخلوق پر ان کی شان واضح کرنے کے لئے خدا نے ان کو بلایا پس وہ خود نہیں گئے بلکہ خدا ان کو لے گیا جیسے ارشاد فرماتا ہے اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ الآیۃ اور ناقہ صالح اور عصائے موسیٰ اسی قسم سے ہیں کہ حضرت صالح کی نبوت کی تصدیق کے لئے خدا نے پتھر سے ناقہ پیدا کی جو ان کا معجزہ کہلایا۔ ادھر حضرت موسےٰ کی تصدیق کے لئے خدا نے ان کے عصا کو سانپ بنا دیا جو معجزہ کہلایا اور یہی وجہ تھی کہ خود حضرت موسیٰ کے دل میں خدا نے خوف ڈال دیا کیونکہ اگر وہ خود خوفزدہ نہ ہوتے تو دنیا والے اس کو فعل موسےٰ کہتے اور معجزہ کی حیثیت ختم ہو جاتی [1]

بہرکیف قوم کے جیب تراش اور دین ودنیا کے لٹیرے ملاؤں نے عوام کو علمائے اعلام کے خلاف ابھارنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی لیکن انشاءاللہ علمائے اعلام سیرت انبیاء وآئمہ کے پیش نظر صبر وضبط سے کام لے کر اپنے کام کو جاری رکھیں گے اور مدارس دینیہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی نصیب ہوگی حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا ہوگا۔ یہ طوفان بدتمیزی حق کی مضبوط چٹانوں سے ٹکرا کر خود ہی ختم ہو جائیگا اور اس کی فضا میں اٹھتی ہوئی لہریں خود بخود نیست ونابود ہو جائیں گی۔

حق کے دوست اور باطل کے دشمن ابھی تک موجود ہیں اللہ کی رحمت حق والوں کے سر پر ہے وہابیت کے نام سے علماء کو خطاب کرنیوالے اور ان کو بدنام کر کے اپنی ہوس کا الّو سیدھا کرنے والے بیشک عوام کے جذبات سے کھیلیں اور علماء کو کوسنے میں ان پر کوئی رحم نہ کریں خدا خود ہی انکا محاسبہ کرے گا اور حق پرست طبقہ علماء اعلام اور ان جیب تراش ایمان فروش ملاؤں کے درمیان نمایاں فرق محسوس کرنے کے بعد خود ہی حق کا ساتھ دیکر ان کے منہ میں لگام دینے میں کامیاب ہوگا جس طرح عام مسلمان شیعہ گروہ کو ایک انتہائی غیر مہذب اور اخلاق سے بیگانہ قوم سمجھے ہوئے تھے کیونکہ ملاؤں نے ان کے سامنے شیعہ عقائد واعمال ایسے بھدے رنگ میں پیش کئے تھے جس سے حیا وشرم سر بگریباں نظر آتا تھا لیکن جوں جوں شیعہ کردار منظر عام پر آنے لگا اور شیعہ معتقدات آل محمد کے وکلا کے ذریعے سے منصۂ شہود پر ظاہر ہونے لگے تو اکثر لوگوں کے اذہان ان غلط فہمیوں سے نکل

[1] مذکورہ بالا بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ نبی یا امام کی کوئی علیحدہ نوع ہے نہیں بلکہ وہ نوع انسانی کے ہی اکمل افراد ہیں جو تفاوت ہم نے ذکر کیا ہے وہ ہر نوع کے افراد میں بھی موجود ہے جیسے عالم کے بعض افعال جاہل کو بظاہر معجزہ معلوم ہوتے ہیں اور بالغ آدمی کے افعال ایک طفل غیر ممیز کو۔ وھکذا

گئے جو ملاؤں کے ذریعہ سے پھیلائی جا چکی تھیں اور رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کے مضمون کے مطابق لوگ جوق در جوق مذہب شیعہ میں داخل ہوتے چلے گئے۔ اس طرح منبر حسینی پر مسلط گروہ نے عوام مومنین کو چونکہ مدت سے اپنی ہوس کا شکار بنایا ہوا تھا اور ہر جائز و ناجائز طریق سے ان کی دولت وایمان پر ان کا پہرہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ عوام کو دین و مذہب سے جس قدر دور رکھا جائیگا وہ اسی قدر زیادہ سے زیادہ خدمت کریں گے اسی لئے انہوں نے گناہوں سے بخشش کے لئے ذہن نشین کر رکھا تھا کہ نماز و روزہ و دیگر اعمال شرعیہ کی کوئی ضرورت نہیں بس علی علی کرو اور سیدھے جنت میں جاؤ۔ یہ نعرہ اس وقت برمحل تھا جب کہ بالعموم لوگ علیؑ سے بیگانہ تھے پس فروع کی تعلیم سے اصول کا درس ان کے لئے اہم اور ضروری تھا جس طرح کہ ابتدائے اسلام میں شرک سے نجات دلانے کے لئے جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا تھا قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہ توحید کا اقرار کرو اور سیدھے جنت میں جاؤ لیکن جب لوگ شرک سے بچ گئے تو ان کی نجات کا ذمہ دار اعمال کو قرار دیا گیا اسی طرح اب جب کہ لوگ ولائے علیؑ کے علم کے نیچے جمع ہو چکے ہیں تو ان کو اعمال کے بنانے کی ضرورت ہے اور وہ شریعت جس کے علیؑ اور اولاد علیؑ پاسبان تھے شیعوں کو اب اس سے روشناس کرانے کا وقت ہے اور شیعیت کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہے۔ بفضل خدا اب علماء کی کثرت ہے جو آل محمدؐ کی تعلیمات کو پھیلانے میں شب و روز محو عمل ہیں اگرچہ چمگادڑ کبھی سورج کے وجود کو پسند نہیں کرتا تاہم سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ افق عالم پر طلوع کر کے روشنی پھیلاتا رہتا ہے۔ اور چمگادڑ کے لئے سوائے جان چھپانے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ پس علوم آل محمدؐ کی نشر گاہیں سورج بن کر چمکتی رہیں گی اور حاسدین اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دم بخود ہوں گے۔ خداوند کریم علماء کا سایہ برقرار رکھے اور عوام کو ان سے مستفید ہونے کی ہمت دے اور ناخدا ترس ملاؤں کی گیدڑ بھبکیوں زہریلے پروپیگنڈوں اور اخلاق سوز ہتھکنڈوں کے سمجھنے کی قوم کو توفیق دے۔

آخر میں میں پوری قوم سے اپیل کرتا ہوں کہ دین فروش علماء سے اجتناب کریں اور علماء اعلام سے پورا پورا تعاون کریں تاکہ آل محمدؐ کے علوم منظر عام پر آئیں اور جہالت کی تاریکیاں بہت جلد ختم ہوں۔ لہذا مدارس دینیہ کی دل کھول کر امداد فرمائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ قوم کے نونہال فیض یاب ہو کر قوم کو مذہب و شعائر مذہب کا صحیح درس دیکر خوشنودئ پروردگار اور رضامندئ محمدؐ و آل محمدؐ کا پروانہ حاصل کریں۔

جامعہ علمیہ باب النجف جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جو گیارہ برس سے علمی خدمات انجام دے رہا ہے اور انتہائی پس ماندہ علاقہ میں واقع ہونے کے باوجود نہایت خوش اسلوبی سے مدارج ترقی طے کرتا جا رہا ہے کسی رئیس یا نواب کی دولت کا سایہ اس کے سر پر نہیں لہذا تمام افراد ملت خصوصاً دینی درد اور مذہبی جوش رکھنے والے مخیر حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس درس گاہ کی دامے درمے قدمے سخنے امداد فرما کر اس کی پریشانیوں کو دور فرما دیں اور اس کی بنیادوں کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کریں تاکہ موجودہ حالت سے بڑھ کر علمی خدمات انجام دے سکے۔ یہ یاد رہے کہ زیر نظر تفسیر انوار النجف اس مدرسہ کی خدمات میں سے ایک اہم اور قابل قدر پیش کش ہے جس کی یہ ساتویں جلد آپ کے سامنے ہے۔ جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

والسلام حسین بخش بقلمہ

وما توفیقی الا باللہ العلیّ العظیم

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ ساغر حسین
۴] علامہ سید علی تقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید سجاد حسین
۱۲) بیگم و مرزا تو حید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ممتاز بیرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم